سَلِیمؔ خَانؔ گِمّی

بچوں کے لیے جاسوسی ناول سیریز

تین مِشن

برفانی انسان اور کمانڈو

مِشن گولڈن ٹاور

مِشن نوبراویلی

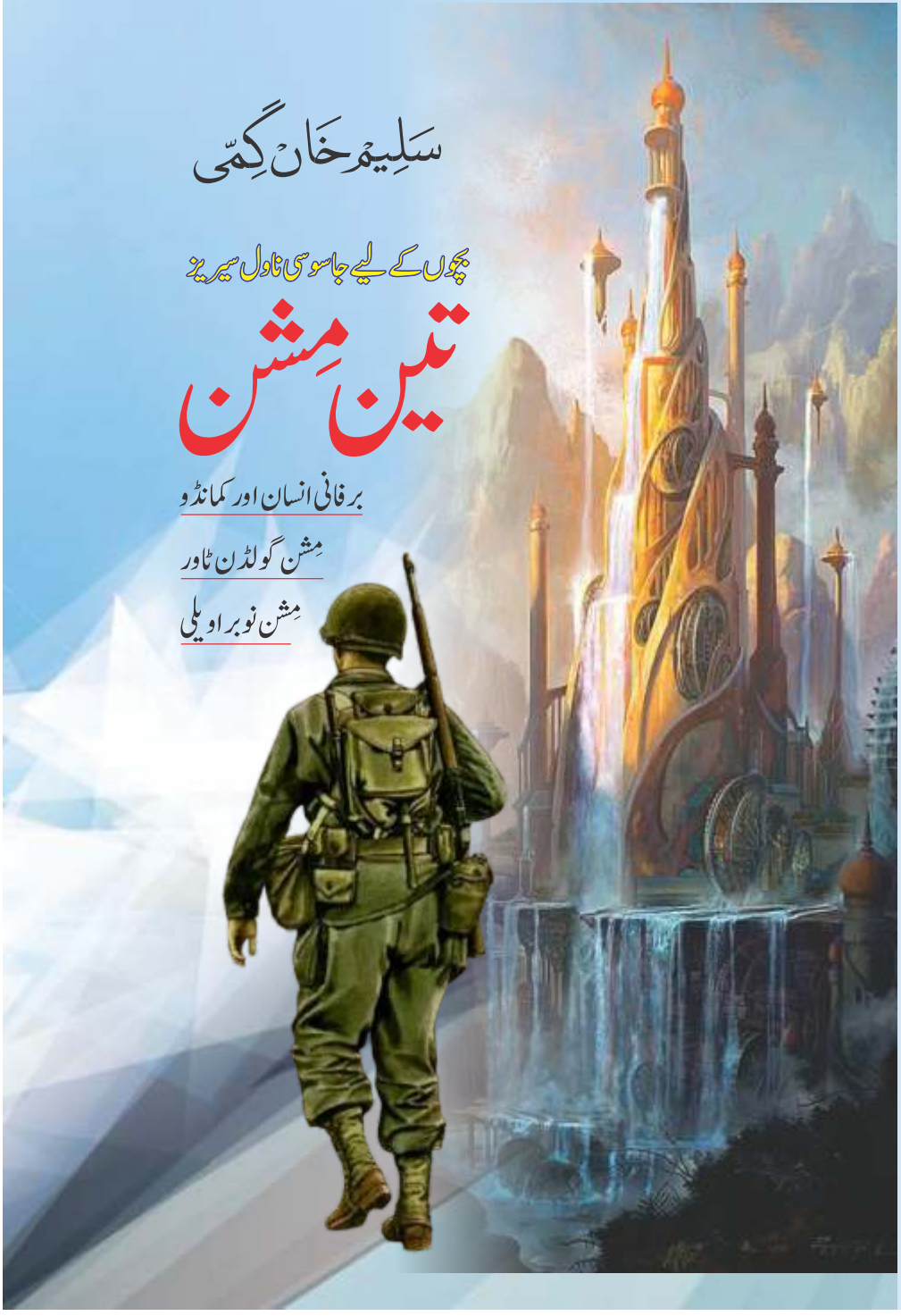

تین مِشن

سَلِیمؔ خَانؔ گِمّی

سلیم خاں گمی پنجابی زبان کے منجھے ہوئے لکھاری تو ہیں ہی مگر اُنھوں نے اردو زبان میں ادب لکھنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بچوں کے جاسوسی ادب میں بھی طبع آزمائی کی اور ناولوں کی ایک سیریز تیار کی۔

اس سیریز کا پہلا ناول ''برفانی انسان اور کمانڈو''، دوسرا ''مشن گولڈ ٹاور'' اور تیسرا ''مشن نوبراوَیلی'' لکھا جنھیں فیروزسنز نے 90 کی دہائی میں شائع کیا۔ اب یہ ناول مارکیٹ میں ناپید ہو چکے تھے۔ مگر قارئین کی دلچسپی کو سامنے رکھتے ہوئے ہوئے ہم نے اسے دوبارہ چھپوانے کی ٹھان لی۔

ان ناولوں میں بچوں کو حب الوطنی کا پیغام دیا گیا ہے کیونکہ ادب سے دُور ہونے کی وجہ سے اِن میں یہ جذبہ ناپید ہو چکا ہے۔ سلیم خاں گمی کے ناولوں کے پڑھنے سے جہاں عزم اور حوصلے کا درس ملتا ہے، وہاں ناممکن کو ممکن بنانے کا جذبہ ہے، اور پتا چلتا ہے کہ سلیم خاں گمّی جیسے مصنف پاکستان سے کتنی محبت کرتے ہیں!

ان جاسوسی ناولوں میں اخلاقی اور اسلامی اقدار کا بھرپور پرچار کیا گیا ہے جس کی آج کے بچوں کے لیے اشد ضرورت ہے کیونکہ مغربی تہذیب کی یلغار کے باعث آج کی نسل اپنی مشرقی روایات سے دور ہو چکی ہے اور اُن میں بے راہ روی پروان چڑھ رہی ہے۔

اُمید ہے، یہ تحریریں مستقبل کے معماروں کی اخلاقی تربیت اور جذبہ حُب الوطنی کا اُبھارنے میں انتہائی مددگار ثابت ہوں گی۔

شگفتہ گمّی لودھی

انگلینڈ، اکتوبر2022ء

Sulaikh bookmakers

GIMMI International

ISBN: 978-969-7863-44-0

تین مِشن

(تین ناولٹ)

برفانی انسان اور کمانڈو

مِشن گولڈن ٹاور

مِشن نوبرا وَیلی

سلیم خان گَمّی

تین مِشن ـــ سیرت ـــ سلیم خان گِمّی

عبداللہ جی نے نوید حفیظ پریس' لاہور' سے چھپوا کے
سُلیکھ، مدینہ ٹاور' فیروز پور روڈ' لاہور' سے شائع کی۔

اشاعتِ اوّل	:	اکتوبر 2022ء
اہتمامِ اشاعت	:	شگفتہ گَمّی لودھی
ٹائٹل	:	سُلیکھ
تعداد	:	300
مُل	:	600 روپے

TEEN MISSION
(3 novelettes by Saleem Khan Gimmi)

Copyright © 2022-1st Edition

Printed by:
Naveed Hafeez Press, Lahore.

Price:
Pakistan: Rs. 600.00

ISBN: 978-969-7863-44-0

Sulaikh
bookmakers
printing • publishing • editing
67 2nd Floor Madina Tower 224, Ferozpur Road Lahore.
+ 92 300 44 30 626 sulaikh.books@gmail.com

برفانی
انسان
اور
کمانڈو
سلیم خان گمی

بے ہوشی

ایک دفعہ کا ذکر ہے، نہیں، ایک دفعہ کا ذکر نہیں، 1988ء کا ذکر ہے کہ شہر خپلو میں ایک بوڑھا لکڑ ہارا اور ایک بوڑھی لکڑ ہارن رہتے تھے۔ وہ تھے بروق پا اور جوہان، دونوں میاں بیوی تھے۔ دونوں میں بے حد پیار تھا۔ دونوں نے دُکھ اور سُکھ مل کر بانٹے تھے لیکن افسوس کہ اُن کی اولاد نہ تھی۔ کچھ عرصے تک تو وہ اولاد کی آس لگائے رہے کہ اُن کی اولاد ہو گی۔ اولاد ہو گی تو بڑی بھی ہو گی۔ اور بڑی ہو گی تو ان دونوں کی خدمت کرے گی اور ان کے بڑھاپے کا سہارا ہو گی لیکن اللہ تعالیٰ کو یہ منظور نہ تھا۔

وہ باری باری لکڑی کاٹنے کے لیے پہاڑ پر جاتے تھے اور درخت کاٹ کر لاتے تھے اور پھر خپلو کے بازار میں فروخت کر کے آٹا، دال، نمک، مرچ، لہسن، پیاز، ہلدی، دھنیا، سبزی، ترکاری وغیرہ خریدتے تھے۔ تھوڑے تھوڑے پیسے جمع کر کے وہ تین چار ماہ میں گوشت اور چاول بھی خریدتے تھے اور پھر پلاؤ یا بریانی یا تاری پکا کر کھاتے۔

پلاؤ تو آپ نے کئی بار کھایا ہو گا۔ پلاؤ میں چاول زیادہ اور گوشت کم ہوتا ہے۔ بریانی میں چاول کم اور گوشت زیادہ ہوتا ہے اور تاری؟ بھئی واہ! تاری کا تو آپ کو پتا ہی نہیں۔ تاری میں گوشت اور چاول اور آلو برابر ہوتے ہیں۔ ایک اور چیز بھی بس برابر ہی خیال فرمائیے۔ وہ ہوتا ہے دیسی گھی۔ تاری میں دیسی گھی خوب ڈالتے ہیں اور گرم مسالہ بھی خوب ڈالا جاتا ہے۔ ہرا دھنیا، سفید زیرا، ہری مرچ اور خشک آلو بخارا بھی ڈالتے ہیں۔ تو لکڑ ہارا اور لکڑ ہارن سال چھ ماہ میں تاری بھی پکاتے تھے۔

ارے یہ تو آپ کو ابھی تک بتایا ہی نہیں کہ یہ خپلو کہاں ہے؟ یعنی اس کا جغرافیہ وغیرہ۔

یہ جغرافیہ بھی عجیب چیز ہے۔ اس کے بغیر پتا ہی نہیں چلتا کہ کون سا گاؤں یا شہر یا علاقہ یا ملک یا براعظم کہاں ہے۔ ثابت ہوا کہ جغرافیہ ایک ضروری مضمون ہے ویسے تو ہر مضمون ضروری ہوتا ہے لیکن ہماری کہانی کے لیے تو جغرافیہ بہت ہی ضروری چیز ہے کیونکہ جغرافیہ سے پتا چل جائے گا کہ بوڑھا لکڑ ہارا اور بوڑھی لکڑ ہارن (آپ چاہیں تو لکڑ ہاری بھی کہہ سکتے ہیں) کس قسم کے لوگوں اور کس قسم کے ماحول میں زندگی گزارتے تھے۔

تو خپلو کے متعلق عرض یہ ہے کہ یہ قصبہ نما شہر یا شہر نما قصبہ بلتستان میں واقع ہے۔ ہوئی نا بات! اب آپ کو بلتستان کے متعلق کچھ معلوم نہ ہو گا۔ یعنی آپ کا جغرافیہ غالباً کمزور ہے۔ بلتستان دراصل پاکستان کے شمال میں ایک علاقہ ہے۔ اس علاقہ میں پہاڑ ہی پہاڑ ہیں اور ان پہاڑوں کے بیچ میں وادیاں ہیں اور وادیاں وہاں ہیں جہاں دریا ہیں یعنی دریاؤں کے کناروں پر وادیاں ہیں۔ وادیوں میں کھیت اور باغ ہیں۔ کھیتوں میں گندم، جَو اور سبزیاں اُگتی ہیں۔ باغوں میں سیب، اخروٹ، خوبانی اور شہتوت کے درخت ہیں۔ تو اسی بلتستان میں ایک مرکزی شہر بھی ہے۔ نام ہے اس کا سکردو۔ یہ شہر دریائے سندھ کے بائیں کنارے پر بسا ہوا ہے۔ دراصل یہ شہر اصل شہر نہیں ہے۔ پانچ چھ دیہات کھیتوں اور باغوں کے ذریعے آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو گا کہ شہر کیسا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ شہر تیرھویں صدی عیسوی کا ہے۔ سات سو سال پہلے کا۔ گویا یہ شہر بھی ہے اور گاؤں بھی۔ اس شہر سے لدّاخ اور تبّت کی طرف یعنی چین کی طرف 64 میل کے فاصلے پر خپلو ہے۔ خپلو میں بھی کھیت اور باغ ہیں لیکن خپلو دریائے سندھ کے کنارے پر نہیں ہے، دریائے شیوق کے کنارے پر ہے۔ یہ لفظ شیوق ہے۔ ش ی وق۔ اسے شوق نہ پڑھیے گا۔

تو خپلو شہر میں رہتے تھے لکڑ ہارا اور لکڑ ہارن۔ دونوں بوڑھے تھے اور باری باری پہاڑی جنگل سے لکڑیاں کاٹنے جاتے تھے۔

ایک دن بُڑھیا کی باری تھی چنانچہ اس نے کلہاڑی اور رسی پکڑی اور صبح سویرے پنیر کا ایک ٹکڑا کھا کر پہاڑی جنگل کی طرف چل دی۔ یہ جو پہاڑی لوگ ہوتے ہیں، بے حد مضبوط ہوتے ہیں۔ جلدی نہیں تھکتے۔ چنانچہ بڑھیا پہاڑی پر چڑھ گئی اور پھر جنگل میں ایک چھوٹا سا درخت کاٹنے والی تھی کہ اس کے کانوں میں میٹھی اور سُریلی آواز آئی۔ یہ پرندے کی آواز تھی

جنگل میں کئی طرح کے پرندے بسیرا کرتے ہیں۔ یہ گانے والا پرندہ تھا جو نغمہ سرائی کر رہا تھا۔ کلہاڑی چھوڑ کر لکڑہارن اس کی میٹھی سُر یلی تانیں سُننے لگی۔ پھر اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اس خوش آواز پرندے کو دیکھے۔ چنانچہ اس نے درختوں کی شاخوں کے پتوں میں اُسے تلاش کیا۔ وہ اس کے سر کے اوپر بیٹھا گا رہا تھا۔ وہ خوبصورت پرندہ تھا۔ اس کے پروں کا رنگ گلابی تھا اور اس کی چونچ سفید تھی۔ لگتا تھا کہ چونچ چاندی کی بنی ہوئی ہے۔

لکڑہارن کا دل چاہا کہ وہ اس کو پکڑ کر اپنے گھر لے جائے اور اسے اپنے میاں کو تحفہ کے طور پر پیش کرے۔ یہ اس کی محبت کا تحفہ ہوگا۔ چنانچہ اس نے اپنے دوپٹے سے پرندے کو پکڑنے کی کوشش کی لیکن پرندہ سیانا تھا، اُڑنے لگا۔ لکڑہارن نے سوچا، اگر یہ تھک جائے تو میں اسے پکڑ سکتی ہوں۔ چنانچہ وہ اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی اور پھر بھاگنے لگی۔ اب خوش آواز اور خوش رنگ پرندہ اس کے سر کے اوپر اڑ رہا تھا اور وہ نیچے بھاگی جا رہی تھی۔

غور کیا جائے تو بھاگنے میں توانائی صرف ہوتی ہے اور آدمی تھک جاتا ہے۔ بُڑھیا آخر بُڑھیا تھی، جوان تو نہ تھی۔ وہ بھی تھک گئی اور ہانپنے لگی۔ بھاگ دوڑ سے اس کی پیاس بھی چمکی، اُسے پسینہ بھی آیا۔ آخر کار وہ پیاس سے نڈھال ہوگئی اور جنگل میں ایک جگہ کھڑی ہوگئی۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے ایک چشمہ نظر آیا۔ چشمے کا پانی صاف و شفاف تھا۔ چشمہ پہاڑ سے پھوٹتا تھا اور اس کا پانی ایک ننّھے مُنّے تالاب میں جمع ہو رہا تھا۔ اسی تالاب سے پانی سِرک کر پھر پہاڑ کے اندر جذب ہو جاتا تھا۔ رَچ بس جاتا تھا۔ یعنی چشمہ پہاڑ سے پھوٹتا تھا اور پہاڑ میں سما جاتا تھا۔ بڑھیا نے آگے بڑھ کر اور جُھک کر دو چار چُلّو پانی پیا اور اپنی پیاس بُجھائی۔ پیاس بجھا کر اس نے پرندے کی طرف توجہ کی تو وہ نظر نہ آیا۔ اس کی آواز بھی سنائی نہ دی۔ پرندے کا کوئی پتا یا نشان نہ تھا۔ وہ اڑ کر کہیں دور نکل چکا تھا۔ وہ بہت مایوس ہوئی۔

لکڑہارن واپس اُسی جگہ آ گئی جہاں وہ کلہاڑی سے ایک چھوٹا درخت کاٹ رہی تھی۔ اس نے کلہاڑی پکڑی اور درخت کاٹنے لگی۔ پہلے اسے تھکاوٹ محسوس ہوتی تھی لیکن اب اسے ذرا سی بھی تھکاوٹ محسوس نہ ہو رہی تھی۔ پہلے اسے کلہاڑی بوجھل محسوس ہوتی تھی لیکن اب وہ کلہاڑی کو پُھول کی طرح اٹھاتی تھی۔ اب وہ چُست تھی لیکن پانی پینے سے پہلے وہ سُست تھی۔ اُس نے سوچا، یہ پیاس بھی کیا بُری چیز ہے لیکن ساتھ ہی اسے چشمے کے ٹھنڈے پانی

اور کسیلے پانی کا ذائقہ یاد آیا۔ ایسا ٹھنڈا اور کسیلا پانی تو اس نے کبھی نہ پیا تھا۔ لگتا تھا جیسے پانی میں عطر مِلا دیا ہو۔ ہاں، پانی تو معطر بھی تھا۔ جنگلوں اور پہاڑوں میں بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں۔ اس نے سوچا اور پھر لکڑیوں کا گٹھا بنا کر سر پر رکھا، کلہاڑی کو کندھے پر رکھا اور خچلو کی طرف چل دی۔

راستے میں اس نے سوچا کہ اس کا بُوڑھا میاں اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ اس خیال سے وہ جلدی جلدی چلنے لگی۔ اسے گھر جا کر آٹا گُوندھنا تھا۔ اس کا خاوند لکڑیاں فروخت کر کے سبزی لائے گا تو وہ سبزی پکائے گی۔ وہ خود لکڑیاں فروخت کرنے کے لیے بازار نہیں جاتی تھی۔ وہ لکڑیاں کاٹ کر گھر لاتی اور اس کا خاوند وہی گٹھا اُٹھا کر بازار لے جاتا۔ وہ مول تول میں ہوشیار اور چالاک تھا۔ وہ ذرا سا لالچی بھی تھا، اس لیے لکڑیاں خریدنے والوں سے قیمت پر خوب بحث کرتا اور زیادہ دام لاتا۔ لکڑہارن کو تُو تکار سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ یہی کچھ سوچ رہی تھی اور جلدی جلدی قدم اُٹھا رہی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس پر زیادہ بوجھ نہیں ہے۔ پہلے تو بوجھ سے اس کی گردن اکڑ جاتی تھی اور گھٹنوں اور ٹخنوں میں درد کی ٹیسیں اٹھتی تھیں۔ آج تو وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ جوان ہوگئی ہو۔ پہلے وہ جُھک کر چلتی تھی لیکن آج تو وہ بالکل سیدھی چل رہی تھی۔ اس کا کُبڑا پن دور ہو چکا تھا۔

''کمال ہے! آج تو میں اپنے آپ کو جوان محسوس کر رہی ہوں۔''

اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ یہ اُس کا احساس تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ واقعی جوان ہوگئی ہے جیسے اٹھارہ اُنیس سال کی جوان لڑکی ہو۔ لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا اس کے چہرے کی جُھریاں ماند پڑ چکی تھیں۔ اس کے جسم کے تمام پٹھے اور ریشے مضبوط اور طاقت ور ہو چکے تھے۔ اس کے سر کے سفید خشک بال کسی حد تک کالے ہو کر زلفوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اس کی چال میں فرق آ گیا تھا۔ اب وہ بڑی بُوڑھیوں کی طرح پَیر گھسیٹ کر نہیں چلتی تھی بلکہ لڑکیوں کی طرح چلتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے گھر کے دروازے پر آئی تو اس کا بوڑھا میاں اسے پہچان نہ سکا۔

''میں آ گئی ہوں جی۔'' اس نے اپنے بُوڑھے خاوند کو دیکھ کر کہا۔ اس کی آواز بدل چکی تھی لیکن وہ اپنی آواز نہ سُن سکی اور نہ پہچان سکی۔

''تم کون ہو؟'' اس کا خاوند تُرشی سے بولا۔ بوڑھے لوگ جوان لوگوں کو ذرا جلدی پسند نہیں کرتے اور پھر وہ بے تکلفی سے کہہ رہی تھی۔

''ارے واہ! مجھے نہیں پہچانتے۔ میں ہوں آپ کی جوہان، یعنی جوہی۔'' وہ حیرت سے بولی۔

''نہیں، نہیں۔ تو جوہان نہیں ہے۔'' وہ بولا۔

''بھئی واہ۔ کیوں نہیں ہوں۔ میں جوہان ہوں، تمھاری گھر والی۔ لکڑیاں کاٹ کر لائی ہوں۔ آج میری باری تھی نا؟'' وہ بولی۔

بُوڑھے لکڑ ہارے نے اس کی بات سن کر اسے غور سے دیکھا۔ چہرے کے نقوش وہی تھے، لباس بھی وہی تھا۔ اسے خیال آیا جب وہ جوہان کو بیاہ کر لایا تھا تو وہ اِسی عمر کی تھی۔ اس کی یادیں کئی سال پیچھے پلٹ گئیں۔

''کمال ہے! یہ کیسے ہوا؟'' وہ بولا۔

''کیا کیسے ہوا؟ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو؟'' جوہان نے لکڑیوں کا گٹھا آنگن میں پھینکا اور تُنک کر بولی۔

''تُو تو جوان ہوگئی ہے! ایسی جوان جیسے شادی کے وقت تھی۔'' وہ خوش ہو کر اسے بتا رہا تھا اور وہ حیرت سے اس کی بات سُن رہی تھی۔

''مجھے یقین نہیں آتا۔ ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟''

وہ بھاگ کر اندر گئی اور آئینہ اُٹھا لائی۔ پھر اس نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ سلاجیت اور کمالیت ملے پانی کے چند گھونٹ پینے سے چہرے کا رنگ نکھر گیا تھا۔ پہلے ابرو سفید تھے اب سیاہی مائل تھے۔ پہلے بال خشک تھے اب خشکی دُور ہو چکی تھی اب تو وہ لچھے دار دکھائی دیتے تھے۔ بڑھاپے کی وجہ سے پہلے اس کی ناک بھدی ہو چکی تھی مگر اب تیکھی دکھائی دیتی تھی جیسے یونان کے لوگوں کی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے وہ بہت خوش تھی اور حیران بھی۔

''میں نے جنگل میں ایک چشمے پر جا کر پانی پیا تھا۔ چند گھونٹ۔ پانی ٹھنڈا تھا، کسیلا تھا اور خوشبودار تھا۔ جب میں نے پانی پیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی نشہ آور چیز کھا لی ہو لیکن وہ تو صرف پانی تھا، ٹھنڈا، کسیلا اور خوشبودار۔ اس کے اثر سے یہ تبدیلی آئی ہے مجھ میں۔ میرا بڑھاپا کسی حد تک دور ہوگیا ہے اور میں اپنے آپ کو جوان محسوس کر رہی ہوں۔ اللہ تعالیٰ

نے مجھے نئی زندگی دی ہے۔ اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے تُو جو چاہے کر سکتا ہے۔'' جوہان نے کہا اور سجدے میں گر گئی۔

اس نے سجدے سے سر اٹھایا اور اپنے خاوند کو دیکھا۔ بوڑھا لکڑ ہارا سامنے کھڑا تھا۔ ''میرا خاوند بوڑھا ہے۔'' اس کے دل میں فوراً خیال آیا اور چونکہ وہ محبت کرنے والی بیوی تھی اس لیے اداس ہوگئی۔ لکڑ ہارے نے جوہان کے دل کی حالت بوجھ لی اور بولا:

''اداس کیوں ہوتی ہو؟ کل لکڑیاں کاٹنے کی میری باری ہے۔ مجھے چشمہ کا اتا پتا بتا دو۔ میں بھی وہاں جا کر ٹھنڈا، کسیلا اور خوشبودار پانی پی لوں گا اور تیری طرح قدرے جوان ہو جاؤں گا۔''

''بالکل ٹھیک۔ تم بھی کل وہاں جا کر پانی پی لینا اور پھر ہم پہلے کی طرح زندگی گزاریں گے۔'' لکڑ ہارن خوشی سے بولی اور پھر اس نے اپنے میاں کو اس چشمے کا اتا پتا بتایا جہاں اس نے خود پانی پیا تھا۔

دوسرے دن لکڑ ہارا تڑکے اٹھا۔ اس نے کلہاڑا اور رسہ لیا۔ لکڑ ہارن کے پاس کلہاڑی اور رسّی ہوتی تھی اور لکڑ ہارا کے پاس کلہاڑا اور رسّہ۔ کیونکہ مرد عورت سے جسمانی لحاظ سے ذرا زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔

لکڑ ہارے نے پہلے درخت کاٹا اور جب اسے پیاس نے ستایا تو وہ اُسی چشمہ پر گیا جس پر جا کر اس کی بیوی نے پانی پیا تھا۔ وہ بھی اپنی بیوی کی طرح جوان ہونا چاہتا تھا لیکن اپنی بیوی کی نسبت زیادہ لالچی تھا۔ پھر ہوا یہ کہ اُس نے چشمے پر جا کر خوب پانی پیا۔ اتنا لالچی تھا کہ پانی اُس کے حلق تک آ گیا۔ ظاہر ہے کہ پانی میں سلاجیت اور کمالیت کا اثر تھا۔ اس نے پانی بھی ضرورت سے زیادہ پیا کیونکہ وہ لالچی آدمی تھا۔ سلاجیت اور کمالیت نے اپنا اثر دکھانا تھا، سو دکھایا اور وہ وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑا چشمے کے کنارے۔

بلتستان کے پہاڑوں میں خالص سلاجیت ملتی ہے۔ اس کے کھانے سے ٹوٹی ہوئی ہڈیاں جڑ جاتی ہیں اور بوڑھے جسموں میں طاقت آ جاتی ہے۔ اگر آپ کبھی سکردو جائیں تو وہاں بازار سے سلاجیت مل جاتی ہے۔ کمالیت بھی سلاجیت کی ایک قسم ہے لیکن اس کے کھانے سے آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے۔

لکڑ ہارا ایک تو تھکا ہوا تھا پھر بوڑھا بھی تھا۔ اس لیے اس پر سلاجیت اور کمالیت کا اثر جلدی ہوا۔ پانی میں سلاجیت اور کمالیت ملی ہوئی تھیں کیونکہ چشمے کا پانی جس پہاڑ سے آتا تھا وہ سلاجیت اور کمالیت کا پہاڑ کہلاتا تھا۔

لالچی لکڑ ہارا بے حس و حرکت چشمے کے کنارے پڑا تھا۔ بے سُدھ، وہ لالچ نہ کرتا اور پانی کم پیتا تو بے ہوش نہ ہوتا۔

سچ کہا سیانوں نے کہ ''لالچ بری بلا ہے۔''

وہ آدمی جسے بروق پا کہا جاتا تھا یعنی پہاڑوں پر گھومنے والا انسان، اب بے سہارا پانی کے چشمے کے کنارے پڑا تھا اور برفانی انسان اُسی طرف چلے آ رہے تھے۔ برفانی بھیڑیئے، برفانی ریچھ اور برفانی چیتے بھی آس پاس تھے کیونکہ وہ جنگل میں تھا لہٰذا وہ کسی وقت بھی ان درندوں کا تر لقمہ بن سکتا تھا۔

وہ بالکل بے یار و مددگار تھا۔

اسے اب صرف اللہ تعالیٰ ہی بچا سکتا تھا۔

رانی

لکڑ ہارے کی بیوی جو ہان شام تک اپنے خاوند کا انتظار کرتی رہی کہ اس کا بوڑھا بروق پا (پہاڑوں پر چلنے والا آدمی) جوان ہو کر واپس گھر آئے لیکن اسے کیا پتہ تھا کہ بروق پا کو لالچ نے آ لیا ہے اور وہ سلاجیت اور کمالیت ملا پانی ضرورت سے زیادہ پی کر جنگل کے ایک چشمہ کے کنارے بے ہوش پڑا ہے۔ ظاہر ہے کہ نشہ آور اور طاقتور پانی نے اپنا جادو جگانا تھا چنانچہ بروق پا چشمہ کے جادو اثر پانی سے نہ بچ سکا۔

شام گہری ہو گئی اور تاریکی کی چادر چاروں طرف تن گئی۔ پہاڑی علاقوں میں شام جلدی آ جاتی ہے۔ کیونکہ پہاڑ اُونچے ہوتے ہیں اور سورج کی کرنوں کو جلدی روک لیتے ہیں۔ جب سورج کی کرنیں پہاڑوں کی وجہ سے رُک جائیں تو اندھیرا چاروں طرف آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے اور شام کے سائے گہرے ہو جاتے ہیں۔

جو ہان چاروں طرف پھیلے ہوئے اندھیرے کو دیکھ کر بہت پریشان ہوئی۔ اس نے جلدی سے اپنی لالٹین روشن، کی ایک کلہاڑی پکڑی اور جنگل کی طرف چل پڑی۔ وہ ایک بہادر عورت تھی کیونکہ پہاڑی عورتیں عموماً بہادر ہوتی ہیں۔

جو ہان ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں کلہاڑی پکڑ کر پگڈنڈی پر تیز تیز جا رہی تھی۔ آپ تو جانتے ہیں پہاڑی پگڈنڈیاں تنگ ہوتی ہیں کیونکہ وہ دشوار گزار پہاڑوں پر بنائی جاتی ہیں۔ میدانوں کی پگڈنڈیاں تو چوڑی اور پھیلی ہوتی ہیں۔ چلنے والا مزے سے چلتا ہے۔ پہاڑی پگڈنڈیوں پر چلنے کے لیے بڑی احتیاط اور توجہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا نظر اِدھر اُدھر ہوئی تو بندہ لُڑھکا اور گیا گہرے کھڈ میں۔ کھڈ میں جانے کا مطلب ہے گیا قبر میں۔

جو ہان بڑی احتیاط سے اور بڑی توجہ سے پہاڑی پگڈنڈی پر چل رہی تھی۔ پھر جنگل آ

گیا اور وہ اس میں داخل ہوگئی۔ دن کو جنگل میں تھوڑی بہت روشنی تو ہوتی ہے کیونکہ سورج کی شعاعیں شاخوں اور پتوں سے چھن چھن کر آتی ہیں اور روشنی بکھیرتی ہیں لیکن رات کو جنگل میں بے حد اندھیرا ہوتا ہے۔ پہاڑی جنگل میں تو بہت زیادہ اندھیرا ہوتا ہے اور پھر یہ جنگل بھی سفید داروں کا تھا جسے عرفِ عام میں سفیدہ کہتے ہیں۔ آپ نے تو سفید داروں کا جنگل نہیں دیکھا ہوگا۔ یہ جنگل ہمارے ملک میں ہزارہ، ایبٹ آباد، چلاس، بُونجی، گلگت اور بلتستان میں ہوتے ہیں۔ سفید داروں کے جنگل میں ہُو کا عالم تھا۔ پرندے تو رات کو آرام کرتے ہیں۔ اتنی اونچائی پر جگنو تو ہوتے نہیں۔ بلتستان میں مچھر بھی نہیں ہوتے۔ تو نہ جگنو کی روشنی تھی نہ مچھر کی اُوں اُوں۔ ہاں کبھی کبھار دُور سے برفانی چیتے کی آواز آتی تھی لیکن یہ آواز بہت مدھم تھی کیونکہ وہ ان پہاڑوں سے آ رہی تھی جہاں ہر طرف برف ہی برف ہوتی۔ بلتستان میں جنگلی چیتا نہیں ہوتا۔ یہ مری کے پہاڑوں میں ملتا ہے۔ برفانی چیتا بلتستان، نگر، ہنزہ، چترال، گلگت میں پایا جاتا ہے۔ یعنی ان پہاڑی علاقوں میں برفانی چیتا ملتا ہے جہاں پہاڑوں پر برف سارا سال جمی رہتی ہے۔ اس لیے بلتستان کا علاقہ برفانی چیتوں کا گھر سمجھا جاتا ہے۔ اگر آپ کو یہ بتا دیا جائے کہ ایک برفانی چیتے کی کھال دو لاکھ روپے میں فروخت ہوتی ہے تو حیران ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ برفانی چیتے کی کھال سے شہزادیاں، ملکائیں اور دوسری امیر عورتیں شالیں، کوٹ اور ٹوپیاں بناتی ہیں۔

ہاں تو جوہان آخر کار اس چشمے پر پہنچ گئی جہاں اُس نے اِس روز پانی پیا تھا مگر چشمے کے کنارے کچھ بھی نہیں ملا۔ اس نے لالٹین کو نیچے کیا اور غور سے دیکھا۔ ارے! یہ تو انسان کے پَیروں کے نشان تھے لیکن ایک پَیر ڈیڑھ فٹ لمبا اور نو اِنچ چوڑا تھا۔ اُف اللہ! یہ تو ''یتی'' کے پَیر ہیں۔ یتی برفانی انسان کو کہا جاتا ہے۔ جس طرح برفانی چیتا ہے اِسی طرح برفانی پہاڑوں میں برفانی انسان رہتا ہے۔ وہ قد کاٹھ میں بہت بڑا ہوتا ہے یہی کوئی دس فٹ اونچا، بڑے بڑے بازو اور بڑی بڑی ٹانگیں، بڑے بڑے پَیر، کچے گھڑے کے برابر سَر۔ سارے جسم پر لمبے لمبے کالے بُھورے مٹیالے اور سُرخی مائل بال ہوتے ہیں۔ آپ دیکھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ برفانی انسان بالوں میں چُھپا ہوا ہے۔ یہ بال اس کے لیے بہت ضروری ہیں۔ اگر یہ بال نہ ہوں تو اسے سردی لگ جائے اور وہ نمونیے سے مر جائے۔ بال اُسے سردی سے بچاتے

ہیں۔ برفانی انسان کے بچے بھی ہوتے ہیں اور ان کے جسم پر بھی لمبے لمبے بال ہوتے ہیں۔ البتہ ان کے منہ پر بال نہیں ہوتے۔ ان کے منہ گول اور سفید ہوتے ہیں اور وہ بے حد خوبصورت لگتے ہیں۔ وہ بندر کے بچے کی طرح چالاک اور چُست بھی نہیں ہوتے۔ یہ بچے بس سیدھے سادے اور بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ دن کو تو برفانی انسان اپنے بیوی بچوں کے ساتھ برفانی پہاڑوں پر کھیلتے ہیں لیکن رات کو غاروں کے اندر جا کر سو جاتے ہیں۔ وہ جنگلی گھاس، جنگلی پھل، پہاڑی جڑی بُوٹیاں، پہاڑی جانور مثلاً چُوہے، خرگوش، گیدڑ وغیرہ اور پہاڑی انسانوں سے اپنی بھوک مٹاتے ہیں۔ پینے کو پانی نہ ملے تو وہ برف کھا لیتے ہیں جو پیٹ کے اندر جا کر پانی بن جاتی ہے۔ ویسے بھی پہاڑوں میں چشمے ہوتے ہیں۔ وہ ان چشموں پر جا کر پانی پیتے ہیں اور ضرورت ہو تو نہاتے بھی ہیں۔ جب شکاری ان کو پکڑنے کے لئے بلتستان کے پہاڑوں اور وادیوں میں جاتے ہیں تو وہ لدّاخ چلے جاتے ہیں۔ جب شکاری لدّاخ جاتے ہیں تو وہ تبّت چلے جاتے ہیں۔ تبّت سے وہ نیپال چلے جاتے ہیں۔ اگر شکاری تبّت اور نیپال پہنچ جائیں تو وہ چین چلے جاتے ہیں اور وہاں کے جنگلوں اور پہاڑوں میں گھوم پھر کر درّۂ خنجراب اور درّۂ قراقرم کے راستے پھر لدّاخ اور بلتستان آ جاتے ہیں۔ میں نے ایک بار بلتستان کے علاقہ چھور بٹ میں ایک یتی کو قابُو کرنا چاہا لیکن وہ بھاگ کر وادی کھرمنک کے گاؤں اولڈنگ کی طرف نکل گیا۔ یہ مت سوچیے کہ میں اکیلا تھا، میرے ساتھ سکردو کے دو شکاری بھی تھے۔

جوہان یتی کے پَیروں کے نشان دیکھ کر خوف زدہ ہوگئی۔ یہ نشان تازہ تھے اور قریب ہی انسان کے پیروں کے نشان بھی تھے۔ وہ سمجھی کہ یہ اس کے خاوند کے پیروں کے نشان ہیں۔ ظاہر ہے وہ اکیلی یتی کا پیچھے کرنے سے قاصر تھی۔ یتی تو دو درجن آدمیوں کے قابُو میں مشکل سے آتا ہے، بے چاری جوہان کس کھیت کی مُولی تھی اس کے مقابلے میں اور پھر رات بھی تھی۔ اس نے اپنی جان بچانا مناسب سمجھا۔ وہ جلدی سے پلٹی اور جنگل میں بھاگنے لگی۔ اب وہ بہت خوف زدہ تھی۔ جنگل کا اندھیرا اور گہرا ہوگیا تھا۔ سفید داروں کے درخت کالے نظر آ رہے تھے جیسے بھُوت کھڑے ہوں۔ لگتا تھا کسی نے ان درختوں پر کالا رنگ کر دیا ہو۔ برفانی چیتے کی ڈراؤنی آواز اب قریب سے آ رہی تھی۔ شاید وہ بھوک کے مارے بستیوں کا رُخ کر رہے

تھے۔ اس کے کانوں نے بھیڑیوں کی آوازیں بھی سُنیں۔ وہ دوڑنے لگی، دوڑتے دوڑتے اس کا سانس پھُول گیا لیکن وہ برابر دوڑتی رہی۔ وہ بہادُر عورت تھی اس لیے اُس نے جی نہ ہارا۔ آخر وہ جنگل سے باہر آ گئی اور تنگ پگڈنڈی پر چلنے لگی۔ اس کا سارا جسم پسینے میں بھیگ چکا تھا اس کے ایک ہاتھ میں اب بھی لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں گُلہاڑی تھی۔

جب وہ خپلو پہنچی تو لوگ سو چکے تھے لیکن خپلو کے راجہ کے محل میں روشنی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ راجا جاگ رہا تھا۔ راجا ایک نیک دل انسان تھا۔ اب وہ بلتستان کا حکمران نہ تھا۔ بلتستان اب پاکستان کا حصہ تھا۔ اس کا ریاست کا درجہ ختم ہو گیا تھا اس لیے اب بلتستان پر راجہ کی حکومت نہ تھی لیکن جو ہی کو اس وقت راجہ کے محل میں روشنی نظر آئی تھی۔ وہ پڑھا لکھا آدمی تھا اور عام لوگوں کے دُکھ درد میں شریک ہوتا تھا۔ اُن کی مدد کرتا تھا اور ان کی ڈھارس بندھاتا تھا۔ لوگ اسے پسند کرتے تھے۔ اس کا نام تھا کامران خاں۔ وہ نسل سے تاتاری تھا لیکن اس کی رانی بلتستان کے ساتھ والے علاقے لدّاخ کی رہنے والی تھی۔ شادی سے پہلے وہ بُدھ مت کی پَیروکار تھی لیکن جب اس کی شادی کامران خاں سے ہوئی تو وہ مسلمان ہو گئی۔ وہ نہایت خوبصورت تھی۔ اس کا قد چھوٹا اور چہرہ گول تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کا چہرہ، چہرہ نہیں ہے بلکہ سیب ہے۔ وہ زمّرد اور فیروزہ کے زیورات پسند کرتی تھی۔

جوہان راجا کامران کے محل کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔ اسے دیکھ کر چوکیدار آگے بڑھا اور نرمی سے بولا:

''بی بی! کیسے آئی ہو اِس وقت؟''

''میں خپلُو کی رہنے والی ہوں۔ میرا نام جوہان ہے۔ میں رانی جی سے ملنا چاہتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''اس وقت کافی رات بیت گئی ہے۔ میں رانی کو اِطلاع نہیں کر سکتا۔'' چوکیدار بولا۔

''کیوں اِطلاح نہیں کر سکتے؟ میں مصیبت زدہ ہوں۔ میں اپنی دُکھ بھری کہانی رانی کو سنانا چاہتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''رانی تو سو چکی ہے۔'' چوکیدار نے کہا۔

''راجا تو جاگ رہا ہے۔ آپ راجا سے کہیے کہ ایک عورت اسے ملنے آئی ہے۔''

''یہ بات ٹھیک ہے۔'' چوکیدار بولا اور پھر اِطلاع دینے کے لیے چل دیا۔ جوہان محل کے بڑے دروازے پر کھڑی اس کا انتظار کرنے لگی۔

کافی دیر بعد چوکیدار آیا اور بولا:

''میں نے جا کر راجا کو بتایا کہ ایک مُصیبت زدہ عورت اُسے ملنے آئی ہے تو راجا نے رانی کو جگایا۔ رانی اب جاگ چکی ہے تم میرے ساتھ آؤ۔''

جوہان چوکیدار کے ساتھ ہولی۔ وہ اُسے ساتھ لے کر سیڑھیاں چڑھنے لگا جب سیڑھیاں ختم ہوئیں تو وہ ایک راہداری میں چلنے لگا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ پھر وہ بائیں جانب گھوم کر ایک دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ دروازے کی دوسری جانب روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ رانی کا کمرہ تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی۔

''چلے آؤ!'' اندر سے آواز آئی۔ چوکیدار نے جوہان کو اندر جانے کا اشارہ کیا اور جب وہ اندر چلی گئی تو وہ دروازہ بند کر کے پلٹ آیا۔

اندر رانی شب خوابی کا لباس پہنے کھڑی تھی۔ یہ رانی کی خواب گاہ تھی۔ خواب گاہ میں بھینی بھینی خوشبو بسی ہوئی تھی۔ رانی نے جوہان کو ایک کُرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بستر پر بیٹھ گئی۔

''کہو! کیا بات ہے؟'' رانی نے پوچھا۔

جوہان نے سارا واقعہ بیان کیا۔ رانی خاموشی سے اس کی داستان سُنتی رہی۔ جب جوہان کی داستان ختم ہوئی تو رانی بولی:

''آج رات تم ہمارے پاس رہو گی۔ کل صبح ہم تمھیں راجہ صاحب کے پاس لے جائیں گے۔ وہ تمھاری پوری پوری مدد کریں گے۔''

''رانی جی! میں خپلو کی رہنے والی ہوں۔ خپلو میں میرا گھر ہے۔ میں اپنے گھر میں رہوں گی۔ آپ مجھے ابھی راجہ صاحب کی خدمت میں پیش کر دیجیے۔''

جوہان بولی۔

اس کی بات سُن کر رانی کچھ دیر خاموش رہی شاید وہ غور کر رہی تھی۔ پھر بولی:

''ٹھیک ہے لیکن تم یہیں بیٹھو۔ میں خود راجہ کو سارا واقعہ بتاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اُس نے

ایک شال اپنے اردگرد لپیٹی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد ایک خادمہ طشتری میں پھل لے کر آ گئی اور جوہان کو پیش کیے۔ اس کا جی تو نہیں چاہتا تھا پھر بھی ایک سیب اس نے طشتری میں سے اٹھایا اور چھیلنے لگی۔ اس نے بمشکل ایک سیب کھایا تھا کہ رانی آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں رُقعہ تھا جو سکردُو کے ایس پی کے نام تھا۔ رانی بولی:

''راجا صاحب کہتے ہیں کہ کل سکردو جا کر یہ رُقعہ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو دے دینا۔ وہ شکار پارٹی کا انتظام کریں گے جو یتی کی تلاش کرے گی۔ اگر تیرا بروق یا زندہ ہوا تو مل جائے گا اور اگر یتی نے اسے خدانخواستہ ہلاک کر دیا ہے تو شکار پارٹی یتی کو تلاش کر کے ہلاک کر دے گی۔''

جوہان نے رُقعہ رانی سے لے لیا۔ جُھک کر اس کا شکریہ ادا کیا اور خوابگاہ سے باہر آ گئی۔ خادمہ نے اس کی راہنمائی کی اور اسے بڑے گیٹ تک چھوڑ آئی۔ بڑے گیٹ پر چوکیدار کے پاس جوہان کی کُلہاڑی اور لالٹین پڑی تھی، اس نے ان کو اٹھایا اور گھر کی طرف چل دی۔

رات تاریک تھی لیکن اس کا حوصلہ بُلند تھا کیونکہ اس کے پاس اب ایس پی سکردو کے نام راجا کا رُقعہ تھا۔ ایس پی راجا صاحب کی بہت قدر کرتا تھا اس لیے جوہان کو یقین ہو گیا کہ اس کا کام بن جائے گا۔

غار

ایک زمانہ تھا جب خپلو سے چھوربٹ کے برفانی علاقہ میں جانے کے لیے اُونچے اُونچے پہاڑوں سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ یہ جان جوکھوں کا کام تھا۔ بیل گاڑی یا جیپ تو تنگ پگڈنڈی پر چل ہی نہیں سکتی تھی۔ بیل گاڑی تو بیل گاڑی، اس پگڈنڈی پر تو گھوڑا اور خچر بھی نہیں چل سکتے تھے۔ آپ اندازہ لگائیے۔ سمندر کی سطح سے اٹھارہ بیس ہزار فٹ اونچے پہاڑ پر گھوڑا یا خچر کیسے چل سکیں گے۔ ذرا سُم ادھر یا اُدھر ہوا، گھوڑا غڑاپ سے نیچے، اور نیچے کیا ہے، موت کی گھاٹی۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ کمر پر کھانے پینے کی چیزیں باندھ لیتے اور تڑکے گھر سے نکلتے اور پہاڑوں پر چلے جاتے۔ ڈاؤ یا امیر آباد یا سکسہ یا پیُون یا فرانو کی طرف چل پڑتے۔ یہ دیہاتوں کے نام ہیں اور دریائے شیوق کے کناروں پر ہیں۔

پھر یہ ہوا کہ لوگوں اور حکومت نے مل کر دریائے شیوق کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ پہاڑ کاٹ کر راستہ بنایا۔ اس راستے پر دن رات مزدوروں اور ہُنر مندوں نے کام کیا۔ عام لوگوں اور سرکاری کارِندوں کی محنت اکارت نہ گئی اور دریائے شیوق کے بائیں کنارے کے ساتھ ساتھ اُونچے پہاڑوں کے نیچے آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب کسی کو کیا ضرورت تھی کھانے پینے کی چیزیں ساتھ لے، مثلاً مکئی کی روٹی، پنیر، مکھن، گُڑ اور پانی چھاگل۔ اب تو لوگ جیپوں میں بیٹھتے ہیں اور یہ جا وہ جا۔ اس راستے کو انگریزی زبان میں ''جیپ ایبل روڈ'' کہا جاتا ہے۔

اوپر والا پہاڑی راستہ عام لوگوں کے کام کا نہ رہا لیکن برفانی انسانوں کے مزے ہو گئے۔ پہلے وہ اِدھر اُدھر برف زاروں میں کھِسک گئے تھے اب پھر انہی پہاڑوں میں آ گئے اور ان راستوں پر چلنے لگے جن پر عام انسان چلتے تھے۔ ان پہاڑوں پہ چلتے ہوئے وہ کسی کو نظر

بھی نہیں آتے تھے۔ کیونکہ عام لوگ تو نیچے ہوتے تھے۔ البتہ ہوائی جہاز پر سوار مسافروں کو نظر آ سکتے تھے۔ لیکن سوچیے، بھلا اس طرف ہوائی جہاز کا کیا کام؟ یہی وجہ تھی کہ برفانی انسان یعنی یتی دن رات اوپر کے پہاڑی راستوں کو اپنے استعمال میں لاتے تھے۔

اس دن یُوں ہوا کہ برفانی اِنسانوں کا سردار گیاپور غار کے سامنے ایک پہاڑی کے برابر پتھر پر بیٹھا دُھوپ تاپ رہا تھا۔ وہ رات اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر پہاڑ سے نیچے اُترا تھا اور دریائے شیوق کے کنارے میپ کے درختوں کے ایک جُھنڈ سے ایک یاک شکار کر کے لایا تھا۔ اس کے قبیلے میں کل دس افراد تھے۔ چھ مَرد، تین عورتیں اور ایک بچہ۔ بچے کا نام ہمگو تھا اور وہ گیاپور کا بچہ تھا۔ وہ ساری رات یاک کا گوشت کھاتے رہے اور غار کے اندر جلنے والے درخت کی شاخیں اٹھا کر ناچتے رہے اور شور مچاتے رہے۔ آج رات ان کی دعوت کی رات تھی۔

صبح کے وقت گیاپور پتھر پر آ گیا اور دُھوپ تاپنے لگا۔ دُھوپ تیز تھی۔ اِس لیے وہ کچھ دیر بعد پھر غار کے اندر چلا گیا۔ چونکہ وہ ساری رات جاگتا رہا تھا، اس لیے پتھریلے فرش پر لیٹ گیا اور جلدی سو گیا۔ پھر کسی نے بیس سیر کا پتّھر اُٹھا کر اس کی کمر پر دے مارا۔ اس کی آنکھ کُھل گئی۔ اس نے دیکھا اس کا بیٹا اس کے پاس کھڑا ہے اور اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ بیٹے نے باہر جانے کا اشارہ کیا تو گیاپور نے بیٹے کی اُنگلی پکڑی اور باہر دُھوپ میں آ گیا۔ دن ڈھل رہا تھا اور سورج کی کرنیں آڑی ترچھی پڑ رہی تھیں۔ گیاپور اور ہمگو دونوں سیر کرتے ہوئے خپلو کی طرف چل دیئے۔ ایک گھنٹے کے بعد وہ پہاڑی جنگل میں تھے۔ ہمگو پرندوں کی سُریلی آوازیں سُن کر اُن کی نقلیں اُتارنے کی بھدّی کوشش کیا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے باپ کو جنگل کی طرف لایا تھا۔ وہ اس سے پہلے ایک بار پہاڑی جنگل دیکھ چکا تھا۔ دونوں باپ بیٹا جنگل میں گھومتے رہے اور پرندوں کی چہکاریں سنتے رہے۔ ہمگو چہکار سُن کر اس کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا لیکن اس کے حلق سے شور سا اٹھتا اور بس۔ وہ مایوس ہو کر آگے چل دیتا۔ اس کا باپ اس کے پیچھے پیچھے تھا تاکہ کوئی درندہ اسے نقصان نہ پہنچا سکے، مثلاً برفانی چیتا۔

چلتے چلتے وہ دونوں اس جگہ پہنچ گئے جہاں چشمہ تھا اور بروق پا سویا ہوا تھا۔ ہمگو اسے

غور سے دیکھنے لگا۔ بروق پا جاگ اٹھا۔ دراصل وہ ڈر گیا تھا۔ چھ فٹ کا موٹا تازہ بالوں سے گُندھا ہوا یتی بچہ اس کے اوپر کھڑا تھا۔ اگر وہ بُروق پا کے اوپر پاؤں رکھ دے تو اس کا کچومر نکل جائے۔ بروق پا کے دل میں یہ ڈر پیدا ہوا۔

گیاپور نے بھی بروق پا کو دیکھا۔ پھر ہمگو نے باپ کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔ گیاپور بھی جواب میں مسکرایا اور اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم اسے اٹھانا چاہتے ہو تو اٹھا لو۔ ہمگو غُرایا۔ پھر چیخا۔ پھر اس نے منہ سے سیٹیاں بجائیں پھر شور میں مِلی جُلی آوازیں نکلیں۔ اس کے بعد آہستہ سے دونوں ہاتھوں سے بروق پا کو اٹھا لیا اور چل پڑا۔ اس کا باپ اس کے پیچھے پیچھے چل دیا اور دونوں باپ بیٹے شام ہونے سے پہلے ہی اپنے گھر میں آ گئے۔ خوف کے مارے بروق پا کے حلق سے ایک لفظ نہ نکلا۔

جوہان نے چشمے پر یتی کے پَیروں کے بڑے بڑے نشانات کے ساتھ ساتھ عام پیروں کے نشان بھی دیکھے تھے۔ وہ دراصل اس کے خاوند کے پیروں کے نشان نہ تھے۔ وہ ہمگو کے پیروں کے نشان تھے لیکن وہ سمجھی کہ اس کے خاوند کے پیروں کے نشان ہیں۔ اسے معلوم ہی نہ تھا کہ اس کا خاوند اپنے پیروں کے نشانات پر لیٹ کر سو گیا تھا۔

ہمگو کے ہاتھ نرم بھی تھے اور گرم بھی۔ بروق پا کا خوف کچھ دیر بعد دور ہو گیا۔ ہاتھوں کی نرمی اور گرمی نے اس کو سکون دیا۔ اس کا خوف دور ہو گیا۔ اب جو اسے سکون ملا تو اسے پھر نیند آ گئی۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ غار میں تھا۔ اس کے چاروں طرف موٹے موٹے سروں، موٹی موٹی آنکھوں اور لمبے لمبے بھورے بالوں والے برفانی انسان بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے ہمگو نے گود میں لے رکھا تھا اور اسے اُنگلی سے ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ برفانی انسان پہلے اسے دیکھتے پھر ایک دوسرے کو دیکھتے اور پھر شور مچاتے جو اس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ کئی سیٹیاں بھی بجاتے اور غراتے بھی تھے۔ اب اسے بھوک ستا رہی تھی۔ مارے بھوک کے وہ چلانے لگا۔ سلاجیت کے پانی کا اثر زائل ہو گیا تھا۔ وہ سب اسے چلاتے ہوئے دیکھتے اور خوش ہوتے۔ پھر بروق پا نے اپنے ہاتھ پیٹ پر رکھے اور پھر منہ پر رکھے۔ یہ اشارہ تھا کہ وہ بھوکا ہے اور کچھ کھانا چاہتا ہے۔ ہمگو کی ماں یعنی گیاپور کی بیوی نے ایک دم شور مچایا اور گیاپور کو دو ہتڑ مارنے لگی۔ وہ شور سن کر اور دو ہتڑ کھا کر غار سے باہر نکل گیا۔ باقی یتی مل کر شور مچانے لگے اور ناچنے

لگے۔ اب بھلا اتنے شور میں **برفوق پا** کا شور کون سن سکتا تھا۔ اب وہ بھی خاموش ہو **گیا**۔

کچھ دیر بعد **گیالپور** واپس آیا۔ اس کے **دائیں** ہاتھ میں **انڈا** تھا جو غالباً پہاڑی چیل کا تھا اور **بائیں** ہتھیلی میں **پانی** تھا۔ ہگو نے **انڈا** توڑ کر **برفوق پا** کے منہ میں ڈالا۔ بھوکا تو وہ تھا ہی۔ وہ اسے آہستہ آہستہ کھانے لگا اور پھر کھا کر ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ **گیالپور** آگے بڑھ کر ہولے ہولے اس کے منہ میں **پانی** ڈالنے لگا۔ جوں جوں **پانی** حلق سے نیچے اترا، اس کے جسم میں طاقت آنے لگی۔ یہ **پانی** بھی ٹھنڈا تھا اور اس میں سے خوشبو آ رہی تھی۔ اُسے نیند آنے لگی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور پھر اس کا سارا جسم نیند کی وادی میں تیرنے لگا۔ وہ سو **گیا**، اس کے ساتھ ہی ہگو لیٹ **گیا**۔ **برفانی انسانوں** کا شور تھم **گیا** تھا۔ وہ حیرت اور خوشی سے **ایک** دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے قبیلے میں **ایک** فرد کا اضافہ ہوا تھا۔ البتہ یہ فرد ہگو کے لیے **ایک** طرح سے کھلونا تھا۔ **گیالپور** نے اشارہ کیا تو **برفانی** مرد غار سے **باہر** آ گئے اور عورتیں **اندر** رہیں۔ پھر وہ شور مچا کر باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد چار **برفانی انسان** دریائے شیوق کی طرف چل دیے۔ دو غار کے **باہر** کھڑے ہو کر پہرہ دینے لگے۔

صبح سورج **نکلنے** سے پہلے غار میں شور وغل کی آواز سے **برفوق پا** جاگ اُٹھا۔ سورج کی **کرنیں** ہر طرف لپک رہی تھیں۔ یہ نورانی سویرا تھا۔ وہ تو حیران رہ **گیا**۔ اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ اس کا دل اس کے **سینے** میں اُچھلنے لگا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اچھلنے کودنے لگا۔ اسے اچھلتے کودتے دیکھ کر ہگو بھی اُچھلنے کودنے لگا۔ **برفانی انسانوں** نے ان کے اردگرد گھیرا بنا لیا اور **تالیاں** بجانے لگے۔ **برفانی انسان تالیاں** بجا رہے تھے اور وہ دونوں ناچ رہے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ سورج کی **کرنیں** غار کے **اندر** روشنی بکھیرنے لگیں۔ **تالیوں** کی لَے تیز ہو گئی۔ ہگو اور **برفوق پا** کے قدم تیز تیز اٹھنے لگے اور پھر **گیالپور** کے ہاتھ کے اشارے سے **تالیوں** کی لَے تھم گئی۔ ہگو اور **برفوق پا** کے پاؤں بھی رُک گئے۔ **گیالپور** نے **ایک بار** پھر اشارہ کیا اور دو یتی غار سے **باہر** چلے گئے۔ **جب** وہ **اندر** آئے تو ان کے ہاتھوں میں **ایک یاک** تھا۔ دونوں **برفانی انسانوں** نے اسے زور سے زمین **پر گرایا** اور **ایک** یتی پتھر کی بنی ہوئی چُھری سے اس کا گلا کاٹنے لگا پھر سبھی اس **پر** ٹوٹ پڑے اور اس کی تِکا بوٹی کرنے لگے۔

برفوق پا نے یہ منظر دیکھا تو ڈر کر غار سے **باہر** بھاگا۔ **باہر ایک** یتی بیٹھا پہرہ دے رہا تھا

اور اس نے **ایک** مارخور کو سینگوں سے پکڑ رکھا تھا۔ مارخور وہ جنگلی بکرا ہے جو **برفانی** وادیوں اور پہاڑوں میں گھومتا ہے اور **سانپ** کھا **تا** ہے۔ وہ **سانپ** کو منہ سے پکڑ کر دانتوں میں **دبا لیتا** ہے اور اس کی جُگالی کرتا ہے۔ **سانپ** اور اس کا زہر اس کے منہ میں رہتا ہے اور جھاگ کی شکل اختیار کر **لیتا** ہے۔ مارخور یہ جھاگ منہ سے اُگل دیتا ہے تو اس کے منکے بن جاتے ہیں۔ دراصل جھاگ جم کر منکوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جوگی اور **سپیرے** ان منکوں کو ڈھونڈ **لیتے** ہیں اور **سانپ** کے ڈسنے کا علاج ان منکوں سے کرتے ہیں۔ وہ یوں کہ جس جگہ **سانپ** نے ڈسا ہو، جوگی **یا سپیرا** منکا زخم **پر** رکھ دیتا ہے۔ منکا سارا زہر چُوس **لیتا** ہے اور **سانپ** کا ڈسا ہوا شخص ٹھیک ہو جا **تا** ہے۔ مارخور کا **گوشت** حلال ہے اور شمالی علاقوں کے لوگ اس کا **گوشت** رغبت سے کھاتے ہیں۔

یہ الگ **بات** ہے کہ مارخور کا شکار سرکاری طور **پر منع** ہے لیکن لوگ چوری چُھپے اس کا شکار کرتے ہیں اور اس کے سِینگ فروخت کرتے ہیں۔ یہ سِینگ بہت خوبصورت ہوتے ہیں اور گھروں میں **تزئین** کے طور **پر لٹکائے** جاتے ہیں۔ دیواروں **پر**۔

پہرے **پر** کھڑے یتی نے **برفوق پا** کو دیکھا تو مادہ مارخور کو تھپکی دی اور پھر اس کی طرف اشارہ کر کے اپنے **سینے پر** ہاتھ مارا۔ گویا کہہ رہا ہو، میں پکڑ کر **لایا** ہوں۔ پھر اس نے اشارے سے **برفوق پا** کو اپنے **پاس** بلایا اور مٹی کا بڑا پیالہ پکڑ کر **برفوق پا** کی طرف کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ آگے بڑھ کر دُودھ پیو۔

برفوق پا آگے بڑھا اور دونوں ہاتھوں سے مٹی کا پیالہ پکڑ کر اس میں سے دودھ **پینے** لگا۔ دُودھ گاڑھا، مزے دار اور میٹھا تھا۔

برفوق پا زندگی میں پہلی **بار** مارخور کا دودھ پی رہا تھا۔ مارخور کا دودھ کسی نصیب والے کو ہی نصیب ہوتا ہے۔ پیالے میں مادہ مارخور کا دودھ موجود تھا۔

دوانگریز

جوہان، راجا کامران خان سے سپرنٹنڈنٹ پولیس سکردو کے نام سفارشی خط لے کر گھر واپس آئی۔ رات ہو چکی تھی۔ یہ اکتوبر کا مہینہ تھا اور سرد ہوا چل رہی تھی۔ جوہان سرد برفانی پہاڑوں کی طرف سے آ رہی تھی۔ یہ سلسلہِ کوہِ ہمالیہ کے پہاڑ نہیں تھے۔ ہمالیہ کے پہاڑوں کا سلسلہ آسام سے شروع ہوتا ہے اور یہ نیپال اور مقبوضہ کشمیر اور آزاد کشمیر سے ہوتا ہوا شمالی علاقوں تک آ جاتا ہے۔ مغربی جانب شمالی علاقے ہیں جو پاکستان میں ہیں۔ پاکستان میں مغرب کی طرف ہمالیہ کے سلسلے کا پہاڑ نانگا پربت کہلاتا ہے۔ نانگا پربت مری اور ایبٹ آباد کے پہاڑوں سے اُوپر ہے یعنی شمال مغرب کی طرف ہے اور چیلاس کے علاقہ میں ہے۔ چیلاس میں چلغوزہ کے درخت ہیں۔ وہی چلغوزہ جو آپ سردیوں میں چباتے ہیں۔

دراصل شمالی علاقہ میں تین ضلعے ہیں۔ ایک کا نام دیامیر ہے۔ دوسرے کا نام گلگت ہے اور تیسرے ضلع کا نام بلتستان ہے۔ ان تینوں ضلعوں کا رقبہ ستاسی اٹھاسی ہزار مربع میل ہے۔ نانگا پربت دیامیر کے ضلع میں ہے۔ اس کے آگے بلتستان ہے جس میں کوہ قرہ قرم کے پہاڑ ہیں کے ٹو، مشابروم، گشا بروم، براڈ پیک (چوڑی چوٹی)، ہڈن پیک (چھپی ہوئی چوٹی) اور کئی دوسری مشہورِ عالم چوٹیاں سلسلہ قرا قرم میں واقع ہیں۔ یہ سب چوٹیاں بلتستان میں ہیں۔ برف سے لدی پھندی ان چوٹیوں کی طرف سے ٹھنڈی ہوا اُس رات آ رہی تھی جس رات جوہان راجا کے محل سے سفارشی خط لے کر آئی۔

اُسے تھوڑی تھوڑی بھوک بھی لگی ہوئی تھی۔ اس نے ایک سیب رانی کی خواب گاہ میں کھایا تھا لیکن اس کی بھوک نہ مٹی۔ اب گھر آ کر اس نے نمکین چائے تیار کی۔ چائے کا پانی گرم تھا۔ اس میں تھوڑا سا دودھ ڈالا، تھوڑا سا مکھن اور کھانے والا سوڈا ڈالا۔ ان سب کو خوب

گرم کیا اور پھر دو چُٹکیاں نمک ڈالا۔ اسے ایک کٹوری میں روٹی کے باسی ٹکڑے مِل گئے۔ چائے کے ساتھ اس نے وہ باسی ٹکڑے کھا لیے اور پھر چارپائی پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

بروق پا کا خیال اس کے ذہن کو جھنجھوڑ رہا تھا۔ وہ صبح تین بجے تک سوچتی رہی کہ اسے اپنے میاں کو بچانے کے لیے کیا کچھ کرنا چاہیے پھر یہ سوچ کر وہ سو گئی کہ وہ سکردو جا کر ایس پی سے سارا ماجرا بیان کرے گی تو کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔

جب وہ صبح اُٹھی تو نو بج رہے تھے۔ اس نے رات کی بچی کُھچی چائے کو پھر گرم کیا اور اسے پی کر ایک پُرانا کمبل لیا اور گھر کا تالا لگا کر بازار میں آ گئی۔ آسمان پر بادل تھے، اس لیے سردی اتنی زیادہ نہ تھی۔ برفانی چوٹیوں کی طرف سے آنے والی ہوا بھی تھم چکی تھی۔ بازار کے سرے پر وہ اڈے میں آ گئی۔ اس اڈے سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد جیپیں چلتی تھیں۔ یہ جیپیں عموماً پرانی اور گھِسی پٹی ہوتی تھیں اور عموماً بوجھ اٹھانے کے کام آتی تھیں۔ دکان داران جیپوں پر سکردو سے سودا لاتے تھے اور اپنی دکانوں میں لا کر بیچتے تھے۔ انہی جیپوں پر آٹھ آٹھ دس دس مسافر بیٹھ کر بلکہ بُری طرح ٹھنس کر چلو آتے تھے یہ جیپیں چلو سے آگے ڈاؤ اور سکسہ کی طرف بھی جاتی تھیں۔ وہ علاقے جہاں جیپ کے قابل سڑک نہ تھی، وہاں گھوڑے چلتے تھے اور جہاں پہاڑ آ جاتے تھے تو لوگ پیدل چلتے تھے کیوں کہ پہاڑی علاقے پر گھوڑے یا خچر کا چلنا دشوار ہوتا ہے۔

ایک جیپ سکردو جانے کے لیے تیار تھی۔ وہ ڈرائیور سے پوچھ کر اس میں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر میں اور لوگ بھی آ گئے اور جیپ مسافروں سے بھر گئی۔ جب ڈرائیور نے دیکھا کہ جیپ مسافروں سے بھر گئی ہے تو وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا اور اُس نے ''مولا سب کا وارث تو'' کہہ کر جیپ چلا دی۔ جیپ پندرہ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی رہی اور ڈھائی بجے دوپہر سکردو پہنچ گئی۔

سکردو کے عام دفتر حمید گڑھ میں ہیں۔ جوہان حمید گڑھ میں اُتری اور اس نے کرایہ ڈرائیور کی ہتھیلی پر رکھا جو بیس روپے تھا۔ ڈرائیور نے کرایہ گنے بغیر جیب میں ڈال لیا اور جیپ چلا کر اپنے اڈے کی طرف چل دیا جو سکردو کے نئے بازار میں تھا۔

ایس پی کا دفتر سڑک پر ہی تھا۔ باہر گیٹ پر ایک چُست اور ہوشیار سپاہی بندوق تانے کھڑا تھا۔ جوہان نے اسے سلام کیا اور بولی:

''میں صاحب سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''کہاں سے آئی ہو بی بی؟'' سنتری بولا۔

''میں خپلو سے آئی ہوں اور میرے پاس صاحب کے لیے خپلو کے راجا کا خط ہے۔'' وہ بولی۔

''مجھے وہ خط دکھاؤ۔'' سنتری نے کہا۔

جوہان پہلے تو جھجکی پھر اس نے پہلو کی جیب سے رُقعہ نکال کر اس کے حوالے کیا۔ وہ ٹھپ ٹھپ اندر گیا اور سلام کر کے رُقعہ ایس پی صاحب کے سامنے رکھا۔ ایس پی ٹیلیفون پر کسی کو حکم دے رہا تھا۔ فون کا چونگا رکھ کر اس نے رقعہ کھولا اور پڑھا اور بولا:

''جوہان بی بی کو اندر بھیجو۔''

باہر آ کر سنتری نے جوہان کو اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود پہرہ دینے لگا۔ جوہان جب اندر گئی تو ایس پی نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا اور ایک کرسی کی طرف اشارہ کر کے بولا:

''بی بی! بیٹھ جاؤ اور سارا واقعہ بیان کرو۔''

جوہان نے رو رو کر سارا واقعہ بتایا تو ایس پی بہت متاثر ہوا۔ اس کے بعد اس نے خپلو کے پولیس آفیسر سے ٹیلی فون پر بات کرنے کے لیے اپنے ریڈر کو حکم دیا۔ جب ڈی ایس پی خپلو سے رابطہ ہو گیا تو ایس پی بارُعب آواز میں بولا:

''خپلو کی ایک بی بی، جس کا نام جوہان ہے، آپ کو آج نہیں تو کل دفتر میں یا گھر پر ملے گی۔ اس کے خاوند کو یتی اُٹھا کر برفانی پہاڑی پر لے گئے ہیں۔ آپ ایک پولیس پارٹی تیار کریں جس میں دلیر اور جفاکش جوان ہوں۔ ان کا انچارج سمجھ بوجھ رکھنے والا افسر ہو۔ ان کو گھوڑے، اسلحہ اور کھانے پینے کی تمام اشیاء دی جائیں۔ پولیس پارٹی میں تین جوان ہوں اور ایک انچارج۔ وہ پتا کریں کہ یتی بروق پا کو کہاں لے گئے ہیں۔ اس کے بعد آپ پولیس فورس لے کر بروق پا کو چھڑانے کی کوشش کریں۔ برفانی انسانوں سے بلا ضرورت لڑائی مول نہ لیں۔ وہ وحشی اور خونخوار خیال کیے جاتے ہیں۔ مقصد بروق پا کو یتیوں کی گرفت سے آزاد کروانا ہے۔ کوئی مشکل ہو تو مجھ کو فون کریں۔''

ایس پی نے حکم دے کر فون کا چونگا رکھ دیا اور جوہان سے بولا:

''اب رونا بند کرو۔ کل تک سارا انتظام ہو جائے گا۔ بروق پا مل جائے گا۔ بس دُعا کرو وہ زندہ ہو۔ اگر یتی اسے نگل گئے ہیں تو ہم اسے ان کے پیٹ سے زندہ نہیں لا سکتے۔''

جوہان کا خیال تھا کہ ایس پی صاحب کو ملنے میں مشکل پیش آئے گی لیکن اسے ذرا بھی دِقت نہ ہوئی۔ اسے ایس پی نیک آدمی نظر آیا جو چاق و چوبند اور صحت مند تھا۔ وہ کچھ سوچ کر بولا:

''آپ کا کوئی رشتہ دار سکردو میں ہے یا نہیں؟''

''جی میرا کوئی بھی سکردو میں نہیں ہے سوائے اللہ کی ذات کے۔'' وہ بولی۔ ایس پی نے گھنٹی بجائی۔ وہی سنتری بھاگ کر آیا۔

''دیکھو، اس بی بی کو میرے گھر لے جاؤ۔ بیگم سے کہنا اِسے کھانا کھلائے، یہ رات ہمارے گھر رہے گی اور کل خپلو جائے گی۔''

''جاؤ بی بی! میرا ملازم آپ کو میرے گھر لے جائے گا۔''

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ جانے والی تھی کہ ایس پی بولا:

''ٹھہرو!'' پھر وہ سنتری سے کہنے لگا:

''ڈرائیور سے بولو، بی بی کو گھر چھوڑ آئے اور جو پیغام میں نے تجھے دیا ہے، وہ تم ڈرائیور کو دے دو۔''

''یس سر!'' سنتری نے کہا اور جوہان کو ساتھ لے کر ڈرائیور کی طرف چل دیا۔

جوہان کے جانے کے بعد ایک شخص دلاور علی ایس پی کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ راولپنڈی کے ایک اخبار ''صدائے وطن'' کا نمائندہ خصوصی تھا۔

''السلام علیکم جناب! چائے پینے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔'' وہ بے تکلفی سے ایس پی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا:

''چائے تو نہیں ملے گی آپ کو آج۔ ہاں البتہ گرما گرم قہوہ پلا سکتا ہوں۔'' ایس پی بولا۔ اس کے بعد اس نے ریڈر کے لیے گھنٹی بجائی۔

''ہر چہ از دستِ دوست می رسد نیکو است۔ یعنی دوست کے ہاتھ سے جو بھی ملے، اچھا ہے۔'' یقیناً وہ پڑھا لکھا آدمی تھا۔ اسے فارسی تو خوب آتی تھی۔ تبھی تو اس نے فارسی کا مصرعہ

سُنایا تھا اور پھر اس کا ترجمہ کیا۔ اس کی عمر تیس کے لگ بھگ تھی اور ''یعنی'' اس کا تکیہ کلام تھا۔

''یہ بی بی کون تھی؟ یعنی یہ جو دوشیزہ آپکے کمرے سے ابھی گئی ہے۔ وہ بولا۔

''یہ بے چاری خپلو سے آئی ہے۔ مصیبت زدہ ہے۔'' ایس پی نے اسے بتایا۔ ریڈر آیا تو ایس پی نے اسے گرما گرم قہوہ تیار کر کے لانے کے لیے کہا۔

''مصیبت زدہ ہے؟ یعنی اس پر کوئی مصیبت ٹوٹی ہے؟'' دلاور نے پوچھا۔

''ہاں، اس کے خاوند بروق پا کو یتی اُٹھا کر لے گئے ہیں اور میں نے ڈی ایس پی خپلو کو حکم دیا ہے کہ پولیس پارٹی مرتب کرو اور بروق پا کو چھڑاؤ۔''

دلاور علی نے فوراً اپنے کوٹ کی جیب سے مُڑی تڑی کاپی نکالی اور بال پوائنٹ سے کچھ لکھ کر بولا:

''یہ تو بھلی چنگی خبر ہے۔ یعنی ہمارے آدمی کو برفانی انسان اٹھا کر لے گیا۔ واہ بھئی واہ! یعنی بہت اچھی خبر ہے۔ میرا مطلب ہے دل چسپ خبر ہے میں آج ہی اسے ٹیلی فون پر لکھوا دوں گا۔'' وہ خوشی سے بولا۔

''آپ ابھی یہ خبر نہ دیں۔ جب برفانی انسان سے بروق پا کو رہا کرا لیا جائے گا تو خبر بنے گی۔'' ایس پی نے مشورہ دیا۔

''وہ بھی دے دیں گے۔ یعنی گرفتاری کی خبر۔ میرا مطلب ہے شکار کی خبر یعنی گمشدگی کی خبر اب دے دیتے ہیں اور رہائی کی خبر بعد میں دے دیں گے۔'' دلاور علی کچھ سوچنے لگا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' ایس پی نے پوچھا۔ دلاور علی سوچ کر بولا:

''سوچ رہا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ بروق پا رہا نہ ہو سکے۔ وہ اسے کھا چکے ہوں۔ رہائی کی خبر کیسے دے سکوں گا۔''

ایس پی نے قہقہہ لگایا اور بولا:

''کن سوچوں میں گم ہو گئے ہو دلاور علی! قہوہ آ گیا ہے، پیو اور گرم ہو جاؤ۔''

''صاحب! اخبار نویس قہوہ سے گرم نہیں ہوتا۔ گرما گرم خبر سے گرم ہوتا ہے یعنی اس کی صحت کا راز ہے گرما گرم دلچسپ خبریں۔''

قہوہ پینے کے بعد دلاور علی ایس پی کی اجازت سے اس کے گھر گیا اور جوہان سے تمام

حالات دریافت کیے۔ جب وہ ایس پی کے گھر سے نکلا تو وہ اپنے دفتر میں آیا۔ اس کا دفتر اس کی بیکری میں تھا۔ اخبار والے اسے صرف ڈاک خرچ دیتے تھے۔ الگ سے تنخواہ نہیں دیتے تھے۔ البتہ وہ لوگوں کی خبریں چھپوا کر ان سے پیسے وصول کرتا تھا۔ بعض اوقات کوئی سرکاری افسر کسی ٹھیکے دار سے رشوت لیتا اور دلاور علی کو پتا چل جاتا تو وہ افسر سے بھی اور ٹھیکے دار سے بھی رقم بٹور لیتا تھا۔ وہ کہتا ''میرا حصہ مجھے دو یعنی میں سب کچھ جانتا ہوں۔ اخبار میں دے دوں گا۔'' یہ دھمکی کارگر ثابت ہوتی، لیکن ایسا کبھی کبھار ہوتا۔ اسے اپنے والدین اور بیوی بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے بیکری پر ڈبل روٹی، کیک، بسکٹ، خطائیاں، مکھن وغیرہ بیچنا پڑتا۔ اس نے راولپنڈی کے لیے کال بک کروائی لیکن تھوڑی دیر بعد اسے بتایا گیا کہ لائن خراب ہے۔ وہ بیکری پر نوکر بچے کو کھڑا کر کے خود ڈاکخانہ کی طرف چل دیا۔

جب وہ ڈاکخانہ پہنچا تو وہاں دو ہٹے کٹے گورے لیٹر بکس میں خط ڈال رہے تھے۔ خط ڈالنے کے بعد وہ ڈاکخانے کے قریب ایک تھڑے پر بیٹھ گئے اور دھوپ تاپنے لگے۔ صبح گہرے بادل تھے لیکن اب بادل چھٹ گئے تھے اور سورج نکل آیا تھا۔ دلاور علی نے اردو میں خبر تحریر کی اور اسے لفافے میں ڈال کر لفافہ لیٹر بکس میں ڈال دیا اور خود تھڑے پر آ کر گوروں سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں باتیں کرنے لگا۔

اسے جلد معلوم ہو گیا کہ دونوں گورے لندن کے رہنے والے ہیں۔ ایک اُستاد ہے اور دوسرا اس کا شاگرد۔ استاد بیالوجی (حیاتیات) کا پروفیسر ہے اور شاگرد ''عجیب وغریب مخلوقات عالم'' پر پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ دونوں یتی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے سکردو آئے ہیں کیونکہ ان کو فرانس کے ایک پروفیسر نے بتایا تھا کہ بلتستان میں برفانی انسان پایا جاتا ہے۔ وہ آج ہی سکردو پہنچے تھے اور انہوں نے لندن خط لکھا تھا کہ وہ سکردو پہنچ گئے ہیں۔

دلاور علی ان دونوں کو اپنی بیکری یعنی دفتر لے آیا جہاں بیکری کے سامان کے علاوہ ایک ٹوٹی پھوٹی میز اور چار میلی کچیلی کرسیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے سب سے پہلے مشا بروم ہوٹل سے گرما گرم چائے منگوائی اور اس کے ساتھ مقامی طور پر تیار کیے ہوئے بسکٹ انگریزوں کے سامنے رکھے اور پھر اپنی مڑی تڑی کاپی اور بال پوائنٹ میز پر رکھ کر ان سے سوال کرنے لگا۔

دونوں انگریز انٹرویو کیا دے رہے تھے کہ مصیبت میں پھنس گئے تھے۔ دلاور علی جو سوال

پوچھتا اس میں یعنی کا لفظ ضرور آتا تھا۔ جو جواب انگریز پروفیسر یا اس کا شاگرد دیتا، وہ دلاور علی کے پلے ذرا کم پڑتا۔ بہرحال دلاور علی نے گزارا کر ہی لیا۔

ثابت یہ ہوا کہ انگریزوں کو برفانی انسان سے ملاقات کا جنون ہے۔ دلاور علی نے ان کو یقین دلایا کہ وہ بلتستان کا کونا کونا اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے۔ چنانچہ انگریزوں نے اسے پندرہ پونڈ روزانہ پر اپنا گائیڈ مقرر کرلیا اور پندرہ پونڈ اسے پیشگی دے دیے۔

پولیس پارٹی

بروق پا نے مادہ مارخور کا جی بھر کے دودھ پیا۔ وہ دودھ پی کر غار کے اندر چلا گیا۔ تمام یتی پتھروں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پتھر گول دائرے میں تھے۔

بروق پا سمجھ گیا کہ وہ سب کوئی جلسہ کر رہے ہیں۔ کوئی غُرا رہا تھا، کوئی سیٹی بجا رہا تھا، کوئی دھاڑ رہا تھا، کوئی زانو پر ہاتھ رکھ کر چلا رہا تھا۔ کوئی بُڑ بُڑا رہا تھا۔ یہ ان کی اپنی زبان تھی۔ بروق پا کو ہگو نظر نہ آیا۔ اس نے جب غار کی نیم تاریکی میں ہگو کو اپنی ماں کے پیچھے پتھروں سے کھیلتے دیکھا تو اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ برفانی انسان پہلے کی طرح شور مچا رہے تھے۔ ہگو کو ان کی غراہٹوں، سیٹیوں اور چیخ و پکار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب اس نے بروق پا کو دیکھا تو پتھر چھوڑ کر اسے اپنی گود میں لے لیا اور اس سے پیار کرنے لگا۔ پھر اسے اٹھا کر غار سے باہر آ گیا۔

غار کے چوکیدار نے مادہ مارخور کی گردن کا منکا توڑ کر اسے جان سے مار دیا تھا اور مزے سے اس کی کھال ادھیڑ رہا تھا۔ ہگو نے اسے دیکھا لیکن پرواہ کیے بغیر بروق پا کو اٹھا کر ایک طرف برف پر چلنے لگا۔ بروق پا نے سوچا، پتا نہیں ہگو مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ اس کے ساٹھ سالہ ذہن نے کہا اندر ''بیول چامہ'' ہو رہا ہے۔ ''بیول چامہ بلتی زبان میں پتھروں پر گول دائرہ میں بیٹھ کر گپ شپ لگانے کو کہتے ہیں۔ ہگو نے اسے کچھ دور لے جا کر ایک پتھر پر بٹھا دیا اور خود برف پر بھاگنے دوڑنے لگا۔

بروق پا کے چاروں طرف برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ تھے۔ ان پہاڑوں پر سفید بادل تیر رہے تھے۔ وہ جس طرف دیکھتا، برف ہی برف نظر آ رہی تھی۔ سُرمو گاؤں کی طرف دریائے شیوق تھا جس میں دریائے ہوشے گر رہا تھا۔ اسے مچلو کی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں جن

میں سفید اور خاکستری رنگ گھل مل گئے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ بھاگ جائے لیکن وہ بھاگنے سے قاصر تھا وہ ہمگو کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو ہمگو اسے جان سے مار ڈالے گا۔ اگر وہ بھاگنے میں کامیاب بھی ہو جائے تو وہ برف زاروں میں سردی اور بھوک سے مر جائے گا۔ بھوک کے خیال سے اسے بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس نے ہمگو کو آواز دی ''ہمگو!'' وہ یہ لفظ اس کے والد کے منہ سے سن چکا تھا۔ ہمگو سے وہ اس کے والد کا نام ''گیا پور'' بھی سن چکا تھا البتہ اسے ہمگو کی والدہ کا نام معلوم نہ تھا۔

ہمگو بروق پا کی آواز سن کر اس کی طرف آیا۔ اس نے پہلے پیٹ پر ہاتھ مارا پھر وہ اپنا ہاتھ منہ کی طرف لے گیا۔ ہمگو اشارہ دیکھ کر اس کی طرف آیا اور اسے اٹھا کر غار کی طرف چل دیا۔

آدھ گھنٹے تک ہمگو اسے گود میں اٹھائے چلتا رہا۔ پھر ایک بہت بڑے پتھر کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ پتھر کے چاروں طرف برف جمی ہوئی تھی لیکن پتھر کے نیچے پانی کھڑا تھا جیسے برسات میں ہوتا ہے۔ اس نے بروق پا کو گود سے اتارا اور پھر چلو بھر بھر کر اسے پلانے لگا۔ پانی پینے کے بعد اس پر اونگھ طاری ہو گئی۔ پھر اسے نیند نے آلیا۔ اس نے محسوس کیا وہ نیند کی وادی میں تیر رہا ہے۔ وہ وہیں لیٹ گیا اور خراٹے لینے لگا۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ غار میں تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا قد بڑھ گیا ہے۔ یہ رات کا سماں تھا اور اسے غار میں کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ اسے ایک طرف دُھندلی روشنی دکھائی دی۔ ظاہر ہے یہ غار کا منہ تھا۔ وہ اس طرف چل پڑا۔ جب وہ غار سے باہر نکلا تو باہر پراسرار دُودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ چودھویں کا چاند آسمان پر چمک دمک رہا تھا اور اس کی کرنیں سفید برف پر پڑ کر چاندنی کو دوبالا کر رہی تھیں۔ لگتا تھا ہر سُو چاندنی کا سیلاب اُمڈ آیا ہے۔ برفانی انسان برف پر کھیل رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینک رہے تھے جس طرح برفانی موسم میں مری، ایبٹ آباد، سکردو اور کوئٹہ میں بچے بالے ایک دوسرے پر برف کے گولے پھینک کر کھیلتے ہیں۔ انہوں نے برف کا بہت بڑا بت بھی بنایا ہوا تھا جس کے اردگرد ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر گول دائرے میں ناچ رہے تھے۔ گول دائرہ! بروق پا نے سوچا۔ وہ دائرہ میں بیٹھ کر جلسہ کرتے ہیں۔ دائرے میں بیٹھ کر گوشت کھاتے ہیں، دائرے میں بیٹھ کر تالیاں بجاتے ہیں۔ ناچنا ہو تو وہ دائرہ بنا لیتے ہیں اور

اب اس برفانی بت کے گرد دائرہ بنا کر چکر کاٹ رہے تھے اور ہنس کھیل رہے تھے۔

وہ ان کو دیکھتا رہا اور حیرت کی کیفیت میں ڈوبا رہا۔ جب چاند سر سے ڈھلنے لگا تو برفانی انسانوں کے جوش و جذبہ میں کمی نظر آنے لگی۔ غالباً ان کو نیند نے آلیا پھر اس کے دیکھتے دیکھتے وہ سب بُت کے سامنے سر جھکا کر پیچھے ہٹنے لگے۔ البتہ گیا پور وہیں کھڑا رہ گیا۔ اس نے جھکنے کی بجائے بُت کو زور سے جھٹکا دیا اور نیچے گرا دیا۔ پھر ہاتھوں اور پیروں سے بُت کا نام و نشان مٹانے لگا۔ یہ کام ختم کر کے وہ بھی غار کی طرف چل دیا۔

غار کے اندر آ کر گیا پور نے پتھر پر پتھر مار کر سُوکھی لکڑیوں کو جلایا تو روشنی ہو گئی پھر بروق پا کو دو سیب دیے اور کچھ سبز گھاس۔ گیا پور نے اسے کھانے کا اشارہ کیا۔ وہ سیب نہیں تھے، ان کا ذائقہ سفید زمیرے کا تھا۔ سیب (یا جو کچھ بھی وہ تھا) اور سبز گھاس (یا سفید زمیرہ کے پودے) کھا کر اسے نشہ سا آ گیا اور وہ پتھروں کے فرش پر بے سُدھ ہو کر لیٹ گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس نے پوست ملا حلوہ کھا لیا ہو۔ دراصل اس نے باسی سیب اور زمیرہ کے پودے کھائے تھے۔ وہ تھکا ہوا تھا اس لیے اسے نیند آ گئی اور کوئی بات نہ تھی۔ وہ صبح اٹھا تو اس کے اوپر لمبے لمبے بالوں والا چغہ تھا جو یتی کی کھال کا تھا۔

وہ نہ صرف پریشان ہوا بلکہ گھبرایا بھی۔ یا خدا، یہ کیا ہو گیا! یہ کایا کا اثر ہے۔ پانی کا؟ سیبوں کا؟ سبز گھاس کا؟ سب کا؟ اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔ وہ سب گول دائرے میں اس کے اردگرد بیٹھے تھے اور خوش نظر آ رہے تھے۔ ان میں ہمگو نہیں تھا۔ پھر اس نے سب کو گِنا۔ ایک دو تین..... دس..... وہ دس تھے۔ سات مرد اور تین عورتیں۔ پہلے چھ مرد تھے، تین عورتیں اور ایک بچہ یعنی ہمگو۔ اب سات مرد اور تین عورتیں حساب برابر۔ اسے وہم ہو گیا تھا کہ وہ یتی بن گیا ہے حالانکہ وہ سیدھا سادا انسان ہی تھا۔

پھر کالے بالوں والا ایک برفانی انسان آگے بڑھا اور اس سے لاڈ کرنے لگا۔ گیا پور کے حلق سے جو غُراہٹ باہر آئی اس سے جو لفظ بنا، وہ تھا ''ہمگو'' وہ اب اس وہم میں گرفتار تھا کہ وہ انسان سے برفانی انسان بن گیا ہے۔

بروق پا کے ہوش اُڑ گئے۔ ارے! یہ برفانی انسان تو جادوگر ہیں۔ نہیں یہ جادوگر نہیں ہیں۔ ان پہاڑوں میں ایسا پانی اور ایسی جڑی بوٹیاں اور پھل وغیرہ ہیں جن کو کھا کر انسان

دنوں میں نہیں، گھنٹوں میں قد آور ہو جاتا ہے۔ اگر جڑی بوٹیوں سے علاج ہو جاتا ہے تو جڑی بوٹیوں سے قد بھی چھوٹا بڑا ہو جاتا ہے۔ اگر پانی کڑوا کسیلا، کھاری اور میٹھا ہوسکتا ہے تو پانی میں قد بڑا کرنے کی خاصیت بھی ہوسکتی ہے۔ کوئی جادو ٹونا نہ تھا وہ صرف برفانی انسان کی کھال سے تیار کردہ چغے کو دیکھ کر خود کو برفانی انسان سمجھ بیٹھا تھا۔

O

دوسرے دن جوہان جیپ میں بیٹھ کر خپلو آ گئی۔ اسے ایس پی کی بیگم نے کرایہ بھی دیا اور نئے کپڑے بھی۔ خپلو آ کر وہ ڈی ایس پی سے ملی۔ اس کے آنے سے پہلے ہی ڈی ایس پی ایک پولیس پارٹی تیار کر چکا تھا جس میں ایک سب انسپکٹر، ایک حوالدار اور دو سپاہی تھے۔ ان کو دو گھوڑے دیے گئے تھے، اسلحہ دیا گیا تھا اور کھانے پینے کی چیزیں بھی فراہم کی گئی تھیں۔ یہ پولیس پارٹی جوہان سے مل کر اسی روز روانہ ہوگئی جس روز بروق پا ٹھیک سے برفانی انسان بنا تھا۔

پولیس پارٹی نے پہاڑی جنگل کے قریب سُرمو نام کے گاؤں میں ڈیرا جما لیا۔ سُرمو کے نمبردار غلام محمد نے ان کو دو کمرے دے دیے تھے۔ پارٹی نے ایک میں اپنے بستر لگا لیے اور دوسرے میں گھوڑے باندھ لیے تھے۔ تھانیدار نے کھانے پینے اور چارہ کے لیے نمبردار کو حکم دے دیا۔ نمبردار نے چُپکے چُپکے سارے گاؤں کو بتا دیا کہ پولیس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ انسانوں کو نہیں، برفانی انسانوں کو پکڑنے آئی ہے۔

''برفانی انسانوں نے کیا کوئی جُرم کیا ہے؟'' عبدالخالق چوکیدار نے پوچھا۔

''کیا ہوگا تبھی تو پولیس آئی ہے۔'' نمبردار بولا۔

''کیا کوئی چوری ووری ہوئی ہے؟'' چوکیدار نے پھر پوچھا۔

''برفانی انسان چوری نہیں کرتے۔ انسانوں کو کھا جاتے ہیں۔'' نمبردار بولا۔

''کس انسان کو کھایا ہے برفانی انسانوں نے؟'' چوکیدار نے پھر پوچھا۔

''پہلے تم اپنے گھر سے گھوڑوں کے لیے چارہ لاؤ۔ پھر تھانے دار اور اس کے جوانوں کے لیے دو مُرغ لاؤ۔ پھر بتاؤں گا۔'' نمبردار ہنس کر بولا۔

یہ سب چیزیں تو پہلے ہی آپ کے گھر میں موجود ہیں۔'' چوکیدار نے مُسکرا کر کہا۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر چل کر افسروں کے لیے کھانا تیار کرو اور گھوڑوں کے لیے چارہ۔''

چوکیدار نمبردار کے حکم کی تعمیل میں حویلی کی طرف چل دیا۔

دوسرے روز دلاور علی انگریزوں کے ساتھ خپلو پہنچا اور ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا۔ وہ محمد علی اور حاجی احمد کو ساتھ لایا تھا۔ محمد علی اور حاجی احمد مزدور تھے۔ سامان اٹھانے والے۔ محمد علی تو ہائی ایلٹی چیوڈ (High Altitude) پورٹر تھا یعنی اٹھارہ بیس ہزار فٹ سے لے کر اٹھائیس انتیس ہزار فٹ بلندی تک سامان پہنچا سکتا تھا۔ بلکہ چوٹیوں کو سر کر سکتا تھا۔ حاجی احمد لَو ایلٹی چیوڈ (Low Altitude) پورٹر تھا۔ نچلی بلندیوں تک سامان لے جانے کا ماہر تھا۔ دونوں دلاور علی کے دوست تھے۔ دلاور علی نے سکردو میں انگریزوں کو خیمے، دوائیں، خشک دودھ، خشک پھل، ٹارچیں، لالٹینیں، مٹی کا تیل، کھانے، چائے، چینی، نائیلون کے رسّے، یاک کے بالوں سے بنے ہوئے رسّے، کمبل، برساتیاں، آئس سکریو، پیچ دار آنکڑے، دندانہ دار پیچ، بوٹوں کے نیچے باندھنے والے کیل یعنی کریمپ آن (Crampon)، پیچ دار ہُک، چٹانوں میں ٹھونکنے والے کیل، برف میں ٹھونکنے والے تیشے، نوک دار سلاخیں، نوکدار میخ (Spikes)، نقشے، پٹیاں، دیا سلائیاں، سگریٹ، دالیں، چاول، نمک، مرچ، مسالے، صابن، برتن دھونے کے پاؤڈر، ٹوتھ برش، کھانے پکانے کے برتن، چائے اور کافی بنانے کے برتن، غرض کہ دنیا جہان کی چیزیں خرید کر دیں۔ کیمرہ انگریزوں کے پاس پہلے سے موجود تھا۔ دس سلیپنگ بیگ وہ لندن سے لائے تھے۔ دلاور علی نے اپنے اثر و رسوخ سے مقامی مستری سے دو ریوالور اور دو پستول بھی خریدے۔ مستری سے ان کو گولیاں بھی مل گئیں۔

انگریزوں کے پاس پیسہ بہت تھا اس لیے انہوں نے اسے بے دریغ خرچ کیا۔ دراصل ان کو لندن کی ایک فاؤنڈیشن نے ''عجیب و غریب مخلوقاتِ عالم'' پر ریسرچ کرنے کے لیے ایک لاکھ پونڈ کی رقم دی تھی جو پاکستانی روپے میں بیس لاکھ روپے بنتی ہے۔ دونوں استاد شاگرد مل کر تحقیق بھی کر رہے تھے اور اس موضوع پر کتاب بھی لکھ رہے تھے۔ یہی کتاب شاگرد کی پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی تھی۔ دراصل یہی مقالہ تبدیلی کے بعد کتابی شکل میں چھپنے والا تھا۔ پروفیسر کا نام الیگزنڈر تھا اور شاگرد کا نام مائیکل۔ پروفیسر الیگزنڈر اور مائیکل دونوں برفانی انسان پر تحقیقی فلم بنانے کا ارادہ بھی رکھتے تھے۔

خپلو پہنچ کر دلاور علی نے سب سے پہلے جوہان سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اسے ملنے کے لیے

خود گیا۔

''کیا خبر ہے پولیس نے یعنی کچھ کیا ہے یا نہیں؟'' اس نے جوہان سے پوچھا۔

''پولیس تو جا چکی، میں مطمئن ہوں۔ پولیس ضرور میرے خاوند کو تلاش کرے گی۔'' وہ بولی۔

''اللہ کرے ایسا ہی ہو، میں دو انگریزوں کے ساتھ یہاں آیا ہوں۔ وہ بھی تمھارے خاوند کو تلاش کریں گے۔ اگر تم سو روپیہ روز پر ہم پانچ آدمیوں کا کھانا تیار کر دیا کرو تو آج سے تم ہماری ملازمہ!''

جوہان فوراً تیار ہو گئی۔ بھلا اتنی زیادہ تنخواہ کون چھوڑ سکتا ہے۔

وہ کون تھا

دلاور علی نے پروفیسر الیگزنڈر اور مائیکل کی مہم کو خوب منظّم کیا تھا۔ بات پیسے کی تھی اور انگریز پیسے خوب خرچ کر رہے تھے۔ ان کو معلوم تھا کہ اگر ان کی مہم کامیاب ہو گئی تو ساری دنیا میں شہرت ہو جائے گی۔ ''عجیب و غریب مخلوقاتِ عالم فاؤنڈیشن'' نے ان کو فنڈز بھی خوب دیے تھے۔ فاؤنڈیشن کے چیئرمین سر انتھونی آئزک کو معلوم تھا کہ اگر پروفیسر الیگزنڈر اور مائیکل برفانی انسان کی تصویریں یا کھال یا دوسرا تحقیقی سامان لے آئے اور کتاب چھپ گئی تو ملکہ معظّمہ بہت خوش ہوں گی۔ نہ صرف یہ بلکہ امریکا کی ''انجمنِ تحقیقاتِ علوم وفنون'' بھی ان کو خاص طور پر بلائے گی اور امریکی صدر ان کو اپنے ایوان میں ضیافت دیں گے۔ اگر تحقیقی فلم بن گئی تو شہرت کو چار چاند لگ جائیں گے۔

یہ سب کچھ دلاور علی کو تو معلوم نہ تھا۔ اس کو تو صرف یہ معلوم تھا کہ انگریزوں کے پاس پیسے بہت ہیں اور وہ برفانی انسان سے ملاقات کے پاگل پن میں گرفتار ہیں۔ ان کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اسے یہ بھی خوشی تھی کہ وہ اپنے اخبار ''صدائے وطن'' کو خبریں ارسال کرے گا جس پر نیوز ایڈیٹر خوش ہو کر اس کو ماہانہ تنخواہ دے گا اور وہ بیکری کی بگ بگ سے چھٹکارا حاصل کر لے گا اور صحیح معنوں میں صحافی بن جائے گا۔

جس روز دلاور علی جوہان سے ملا، اسی روز وہ سب تیار ہو کر چل پڑے۔ ان کے پاس تین گھوڑے اور دو خچریں تھیں۔ گھوڑوں پر پروفیسر، مائیکل اور دلاور سوار تھے اور خچروں پر ساز و سامان تھا۔ محمد علی، حاجی احمد اور جوہان پیدل چل رہے تھے۔ شام کے وقت وہ پہاڑی جنگل میں پہنچ گئے اور اس جگہ خیمے گاڑ دیے جہاں جنگل اور پہاڑ ملتے تھے۔ ایک خیمہ میں پروفیسر اور اس کا شاگرد، دوسرے خیمے میں دلاور علی، محمد علی اور حاجی احمد اور تیسرے خیمے میں

جوہان اور کھانے پینے کی اشیاء رکھی گئیں۔ جوہان کا خیمہ ایک طرح سے باورچی خانہ تھا۔ خچلو سے جو گھوڑے اور خچریں آئی تھیں ان کو دلاور علی نے فارغ کر دیا یعنی ان کے مالکوں کو کرایہ بھاڑا دے دیا اور کہا:

''جاؤ چھٹی کرو۔''

اس رات کا کھانا وہ خچلو کے ایک ہوٹل سے لے آئے تھے۔ وہ ان چاروں نے مل کر کھایا۔ پروفیسر اور اس کے شاگرد نے ڈبل روٹی کے ٹکڑوں پر مکھن اور مارملیڈ لگا کر ڈنر کیا اور ''کافی'' کے بڑے بڑے مگ پیے۔

جوہان نے تو یہ جنگل کئی بار دیکھا تھا۔ وہ کئی بار یہاں لکڑیاں کاٹنے کے لیے آئی تھی۔ وہ ویسے بھی بہادر عورت تھی۔ اس کی کلہاڑی اب بھی اس کے پاس تھی۔ حاجی احمد نے اس سے کہا تھا کہ وہ اسے پستول چلانا سکھائے گا تاکہ ضرورت کے وقت وہ اسے استعمال کر سکے۔ حاجی احمد اور محمد علی اس پارٹی کے باڈی گارڈ بھی تھے۔ سارے ہتھیار ان کے پاس تھے۔ دلاور علی تو بس بال پوائنٹ کا دھنی تھا۔ پروفیسر اور اس کا شاگرد کتابوں کے کیڑے تھے۔ وہ عجیب وغریب مخلوقات پر کتابیں پڑھتے یا نقشے دیکھتے رہتے۔ اگر وقت ملتا تو مووی کیمرہ صاف کرتے۔

آدھی رات تک جوہان جاگتی رہی۔ نئی جگہ تھی اور پھر اسے برِوق پا کا بھی خیال تھا۔ معلوم نہیں وہ زندہ ہے یا مَر چکا ہے۔ خدا کرے وہ زندہ ہو۔ کاش! وہ اسے مل جائے۔ برِوق پا کے بارے میں وہ سوچ کر بے چین ہوگئی۔ وہ بستر سے اُٹھ بیٹھی اور لالٹین لے کر خیمے سے باہر آ گئی۔ جنگل میں ہو کا عالم تھا، ہر طرف سناٹا تھا۔ کوئی آواز نہ آدم زاد۔ یوں تھا جیسے ساری کائنات چُپ چاپ ہو۔ وہ جنگل سے نکل کر ڈھلوان کے ذریعے پہاڑ پر چڑھنے لگی۔ چاند آسمان پر چمک رہا تھا اور چاروں طرف ہلکی ملگجی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ پراسرار نیم تاریکی میں اچانک اس کی پشت پر قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا ایک انسان بایاں ہاتھ بڑھائے اس کی طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے لالٹین گر گئی اور وہ چیخ مار کر جنگل کی طرف لپکی۔ چند سیکنڈ میں وہ ہرنی کی طرح کدکڑے بھرتی جنگل میں تھی پھر اس نے اپنے خیمے کا رُخ کیا اور دھڑام سے بستر پر گر گئی۔ لالٹین تو گر چکی تھی لیکن کلہاڑی اس کے ہاتھ میں تھی۔ تاہم اسے حوصلہ نہ ہوا کہ کلہاڑی استعمال کر سکے۔ جب اس کا سانس درست ہوا تو اس

نے دور سے آواز سنی ''جوہی..... جوہی.....۔'' کوئی اسے پکار رہا تھا، یا شاید اس کے کان بج رہے تھے۔ اس بے چاری کو کیا معلوم تھا کہ اس کا برِوق پا اسے تلاش کرنے کے لیے جنگل کی طرف آیا تھا اور عین ممکن تھا کہ وہ اسے پالیتا۔ اگر وہ پلٹ کر نہ دیکھتی تو برِوق پا یقیناً اسے اپنے مضبوط ہاتھوں میں پکڑ لیتا اور غار میں لے جاتا۔

جوہان کی بھاگ دوڑ سے اس کے ساتھی جاگ اٹھے تھے۔ حاجی محمد، محمد علی اور دلاور علی فوراً اس کے خیمے میں آئے اور اس سے پوچھا کہ کیا ہوا؟ اس نے سارا واقعہ بیان کیا تو ان تینوں نے ایک زبان سے کہا کہ یہ اس کا وہم ہے بھلا یتی اس جنگل میں کیسے آ سکتا ہے۔

''یہیں سے تو وہ میرے برِوق پا کو اٹھا کر لے گیا تھا۔'' جوہان نے کہا۔

حاجی احمد اور محمد علی کا خیال تھا کہ وہ سچ کہتی ہے۔ لیکن دلاور علی کا خیال تھا کہ اس نے ڈراؤنا خواب دیکھا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ کانپ بھی رہا تھا۔ پھر وہ سارا ماجرا انگریزوں کو بتانے کے لیے ان کے خیمے میں چلا گیا۔

انگریزوں نے اس کی باتیں سن کر لوہے کے ٹرنک سے دو کتابیں نکالیں اور پڑھنے لگے۔ وہ نئے سرے سے یتی کی عادات واطوار کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے۔ وہ صبح تک پڑھتے رہے اور جب سورج نکلا تو پروفیسر الیگزنڈر بولا:

''ٹھیک ہے! برفانی انسان بستی کا پھیرا کرنا مانگتا۔'' یعنی یتی انسانی بستیوں کا رخ کرتا ہے اور رات کے وقت کرتا ہے تاکہ مویشی وغیرہ چُرا کر لے جائیں لیکن یہ وہ تب کرتا ہے جب وہ انتہائی بھوکا ہو اور اسے گھاس، پودے، درختوں کے پتے، چوہے، خرگوش، گیدڑ، لومڑیاں، چیتے، یاک، مارخور، نیل گائے، جنگلی گدھے، جنگلی بھیڑیں وغیرہ نہ ملیں۔

''ہم اس کے پاؤں کا فوٹو لینا مانگتا۔'' پروفیسر نے کہا لیکن جب وہ کیمرے لے کر پہاڑ پر گئے تو وہاں پیروں کے نشان ہوا کی وجہ سے مِٹ چکے تھے۔

سب انسپکٹر غلام عباس اور اس کے جوانوں نے ایک دن اور ایک رات خوب آرام کیا۔ انہوں نے مرغ پلاؤ کھایا اور گھوڑوں نے خشک گھاس اور بھیگے ہوئے جَو۔ سُرمو کے نمبردار نے گاؤں کے لوگوں سے فی گھر دس روپے وصول کیے تھے۔ پولیس والے گاؤں کے مہمان تھے۔ اکیلے نمبردار کے مہمان تو نہیں تھے اور پھر برفانی انسان کو پکڑنے آئے تھے۔ برفانی انسان کو

پکڑنا کوئی آسان بات تو نہ تھی۔ برفانی انسان کو دیکھ کر بڑے بڑے گھبرا جاتے ہیں۔ وہ تو اسے پکڑنے آئے تھے اور پھر معلوم نہیں وہ کتنے برفانی انسان پکڑ لیں۔ برفانی انسان کی موجودگی سُرموگاؤں کے لوگوں کے لیے بھی خوفناک تھی۔ جب سے پتا چلا کہ سرموٹاپ (اونچی پہاڑی) پر برفانی انسان رات کو گھومتے ہیں، دیہاتیوں کا مارے خوف کے سانس خشک ہو گیا تھا۔

اپنے قیام کے دوسرے دن تھانے دار غلام عباس نے چار مُرغے بھون کر ساتھ لیے۔ پانی کی چھاگل چوکیدار کے حوالے کی اور اپنے جوانوں کو ساتھ لے کر سرموٹاپ یعنی سرمو گاؤں کی سب سے اونچی پہاڑی پر گیا۔ گاؤں سے صرف چوکیدار اس کے ساتھ تھا۔ وہ پانچوں ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ تھانے دار اور جوان تاش کھیلتے رہے اور چوکیدار اِدھر اُدھر گھوم کر برفانی انسان کے پیروں کے نشان تلاش کرتا رہا جو اسے کہیں نظر نہ آئے۔ بعد دوپہر ان سب نے مل کر کھانا کھایا اور جب سورج ڈُوبنے لگا تو واپس سُرمو آ گئے۔ راستے میں تھانے دار نے چوکیدار سے کہا:

''اگر کوئی اُوٹ پٹانگ بات کی تو زمیر دفعہ 52 تعزیرات پاکستان گرفتار کرلوں گا۔ گاؤں والوں سے کہنا کہ تھانیدار صاحب نے سارا دن بہت مشقت کی ہے۔''

جب وہ گاؤں آئے تو بُھنا ہوا آدھا بکرا ان کا منتظر تھا۔

دوسرے دن پروفیسر الیگزنڈر کی پارٹی جس میں مائیکل، دلاور علی، حاجی احمد اور محمد علی تھے، چائے، کافی، ڈبل روٹی کے سلائس اور بسکٹ لے کر جنگل سے نکلے اور ان راستوں پر سے ہوتے ہوئے جو پہاڑی چرواہوں اور لکڑہاروں نے ڈھلوان پر تراشے ہوئے تھے، پہاڑ پر چڑھ گئے۔

پروفیسر اور مائیکل خوردبین اور دُوربین سے پہاڑ اور پہاڑ کی برف دیکھتے رہے۔ خوردبین سے وہ اپنی ناک کے سامنے برف کو دیکھتے کہ شاید پیروں کے نشان نظر آ جائیں اور دُوربین سے دور تک پہاڑ کا جائزہ لیتے کہ شاید برفانی انسانی سیر سپاٹا کرتا ہوا نظر آ جائے۔ مگر نہ پیروں کے نشان مل سکے اور نہ ہی برفانی انسان کا وجود نظر آیا۔ چار گھنٹے مسلسل مشقت کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں پہاڑ ختم ہوتا تھا اور وادی شروع ہوتی تھی۔ اس وادی میں سرمو گاؤں تھا اور جہاں وادی ختم ہوتی تھی وہاں سے سرموٹاپ شروع ہو جاتی تھی۔ سرموگاؤں سے

براستہ لُونکھا، ڈاؤ، کوئیس، حسن آباد، مارچھا، پیون، سکسہ، سیاری، فرانو، تیاکشی، تُرتنگ اور چلونکھا کے دیہات بلتستان میں تھے۔ جنگ کے بعد یہ لدّاخ میں چلے گئے۔ بہرحال یہ سارے دیہات دریائے شیوق کے کنارے پر ہیں اور ان دیہات میں جانے کے لیے سرموگاؤں سے ہو کر گزرنا پڑتا ہے۔

چار گھنٹے گھومنے پھرنے کے بعد پروفیسر کی پارٹی واپس جنگل میں آ گئی۔ پروفیسر اور اس کا شاگرد کل اور آج کی رپورٹیں لکھنے میں مشغول ہو گئے۔ حاجی احمد جوہان کو ریوالور چلانے کی مشق کروانے لگا اور دلاور علی اور محمد علی جوہان کے خیمے میں کیتلی میں پانی گرم کرنے لگے تاکہ وضو کر کے نماز ادا کر سکیں۔ کچھ گرم پانی پروفیسر الیگزنڈر اور مائیکل کو بھی دینا تھا تاکہ وہ کافی بنا کر پی سکیں۔

پروفیسر الیگزنڈر نے رات گئے جو رپورٹ مرتب کی، اس کے چند فقرے یہ ہیں:

''برفانی انسان برف زاروں میں رہتا ہے۔ وہ گوشت خور ہے اس کے لیے وہ شکار کرتا ہے۔ اگر جنگلی جانور مل جائیں تو ان کو مار کر کھا جاتا ہے۔ جنگلی جانور نہ ملیں تو بستی کا رخ کرتا ہے اور گائے، بھینسیں، بیل، بکریاں اور بھیڑیں اٹھا کر لے جاتا ہے ایسے وقت آدمی مل جائے تو اسے بھی غذا بنا لیتا ہے۔ بستی پاس نہ ہو تو برف کھا کر گزارا کرتا ہے۔ برف نہ ملے تو چٹانیں چاٹ کر پیٹ بھر لیتا ہے۔ خاص طور پر نمکین چٹانیں وہ شوق سے چاٹتا ہے۔''

مائیکل کی رپورٹ سے چند فقرے یہ تھے:

''ایک رات ہم اپنے خیموں میں سوئے ہوئے تھے کہ برفانی انسان کو ہماری موجودگی کا علم ہو گیا۔ چنانچہ وہ ہم سب کو اٹھانے کے لیے آیا۔ اس رات پہرے پر ایک خاتون جوہان مامور تھی۔ برفانی انسان نے اسے دیکھا، جھک کر سلام کیا اور اس سے لالٹین لے کر واپس چلا گیا۔ ثابت ہوا کہ برفانی انسان عورتوں کی بے حد عزت کرتا ہے۔''

تین دن تک مُرغے کھانے اور تاش کھیلنے کے بعد تھانیدار غلام عباس نے جو رپورٹ ڈی ایس پی کو بھجوائی اس کے چند فقرے یہ ہیں:

''میں مسمی غلام عباس سب اِنسپکٹر انچارج تھانہ خپلو، حال موقع برڈیوٹی گرفتاری برائے برفانی انسانی عرف یتی عرض گزار ہوں کہ ملزم مذکورہ کی گرفتاری کے لیے جا بجا پہاڑوں،

غاروں، چٹانوں، برفستانوں اور جنگلات میں شب خون کی کارروائی عمل میں لائی گئی لیکن ملزم چاق و چوبند نیز چوکس و ہوشیار و عیار ہے۔ دو بار جُل دے کر نکل گیا۔ لیکن پورا یقین اور پُوری اُمید ہے کہ عنقریب گرفتار ہو کر سزا کا حق دار ہو گا۔''

یہ رپورٹ تھانیدار نے نمبردار کو دی اور نمبردار نے چوکیدار کو دی کہ ڈی ایس پی صاحب بہادر خپلو کو پہنچا دے۔ نمبردار نے زبانی چوکیدار کو تاکید کی کہ ڈی ایس پی صاحب بہادر سے کہنا کہ تھانیدار عیش کر رہا ہے۔ وہ برفانی انسان کو پکڑنے کے لیے کچھ نہیں کرتا اور یہ رپورٹ جھوٹی ہے۔

پہرہ

سُرمو کا چوکیدار عبدالخالق اسی روز شام کو خپلو پہنچ گیا اور اس نے تھانے دار کی رپورٹ ڈی ایس پی کے گھر پہنچا دی۔ ڈی ایس پی کو رپورٹ کا انتظار تھا۔ اس نے دو منٹ میں رپورٹ پڑھ کر سر اٹھایا تو چوکیدار کو سامنے پایا۔

''شاباش! عبدالخالق تم ایک فرض شناس آدمی ہو۔ اگر رات گزارنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو تم رات تھانے میں ٹھہر سکتے ہو۔'' ڈی ایس پی بولا۔

''حضور! رات میں اپنے ایک دوست کے پاس ٹھہروں گا۔'' اس نے کہا۔

''تم جا سکتے ہو۔'' ڈی ایس پی نے اُسے جانے کی اجازت دی۔

''حضور نمبردار غلام نبی کا پیغام میرے پاس ہے۔ وہ میں آپ کو دینا چاہتا ہوں۔'' چوکیدار عبدالخالق نے ڈر کر کہا۔

''ہاں بتاؤ۔ نمبردار غلام نبی اچھا آدمی ہے۔ اس نے ہمیں رام چکور بھیجا تھا۔ کہو کیا بات ہے؟''

''حضور نمبردار کہتا ہے کہ تھانے دار صاحب اپنے کام میں دلچسپی نہیں لیتا۔ مُرغ کھاتا ہے، دودھ پیتا ہے، سر کی مالش کرواتا ہے، سارا دن تاش کھیلتا ہے، ڈیوٹی ٹھیک طرح نہیں دیتا۔''

''مجھے پہلے ہی خیال تھا کہ یہ رپورٹ غلط ہے۔ میں کل اسے لائن حاضر کروں گا اور اس کی جگہ جانباز خاں کو بھیجوں گا۔ وہ دیانت دار بھی ہے اور بہادر بھی۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

چوکیدار عبدالخالق خپلو میں تھا کہ موسم خراب ہو گیا۔ یہ اکتوبر کا آخری دن تھا۔ آسمان پر بادل چھا گئے۔ چین اور رُوس کی طرف سے ہوائیں چلنے لگیں پھر برف باری شروع ہو گئی۔ اس برف باری میں برفانی انسان مزے سے گھومتے پھرتے رہے لیکن پولیس پارٹی اور پروفیسر پارٹی ہاتھ پر ہاتھ دھرے موسم کا نظارا کرتے رہے۔ پولیس پارٹی تو غالباً یہی چاہتی

تھی کہ برفانی ہوائیں سدا چلتی رہیں اور وہ مزے سے نمبردار کی حویلی میں مُرغ پلاؤ کھاتے رہیں۔ البتہ پروفیسر الیگزنڈر کو افسوس تھا۔ اس کا سٹاف بے کار بیٹھا تھا اور روزانہ تنخواہ وصول کر رہا تھا۔ تاہم دلاور علی خوش تھا۔ اس کے پوتڑے کھرے تھے۔ سب سے زیادہ پریشانی جوہان کو تھی۔ اسے رَہ رَہ کر بروق پا کا خیال آتا تھا۔

بروق پا برفانی انسانوں میں گُھل مِل گیا تھا۔ وہ ان کی زبان سے بھی آگاہ ہو گیا تھا۔ یہ زبان چیخوں، غُراہٹوں اور سیٹیوں سے ملتی جُلتی تھی۔

کُل الفاظ پندرہ سولہ تھے۔ اس نے فوراً پندرہ سولہ الفاظ یاد کر لیے اور ان کی ادائیگی سے واقف ہو گیا۔ یہ پندرہ سولہ الفاظ غُرا کر، چیخ کر، چنگھاڑ کر، شور مچا کر، سیٹی بجا کر اور ران پر زور سے ہاتھ مار کر ادا کیے جاتے تھے۔ گویا برفانی انسان کی ساری لُغت عمل میں بنی تھی، اس میں لفظوں کا زیادہ دخل نہ تھا۔ اگر لفظ تھے تو وہی پندرہ سولہ۔ بولنے سے زیادہ وہ عمل پر یقین رکھتے تھے۔ برفانی انسانوں کو تین دن اور دو راتیں کھانے کو کچھ نہ ملا۔ تیز ہوا اور برف باری میں وہ کاہے کا شکار کرتے۔ سارے جانور تو ایسے موسم سے ڈر کر چھپ چکے تھے۔ آخر تیسری رات کو گیا پور نے مجبور ہو کر فیصلہ کیا کہ آبادی کا رُخ کیا جائے۔ اس غرض کے لیے اس نے اپنے آپ کو پیش کیا، سارے مرد اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے لیکن اس نے اپنے بیٹے ہبگو اور بروق پا کو چُنا اور رات گیارہ بجے سرمو کی طرف چل دیا۔

ظاہر ہے رات تاریک تھی۔ تیز و تند ہوا چل رہی تھی۔ برف باری زوروں پر تھی لیکن یہ سب ہم جیسے انسانوں کے لیے تھی۔ برفانی انسانوں کے لیے نہیں۔ وہ تو برف کے پالے ہوئے تھے۔ جس طرح پرندہ ہوا میں اڑتا ہے تو خوش ہوتا ہے، اسی طرح برفانی انسان برف میں چلتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں۔ دریا میں ہزار طوفان آئے، مچھلی تو مزے میں رہتی ہے۔ یہی حال برفانی انسان کا ہے۔

وہ تینوں رات بارہ بجے سرمو کی وادی میں داخل ہو گئے۔ وہ وادی میں چور راستوں سے داخل ہوئے تھے۔ اگر سیدھے راستوں سے بھی داخل ہوتے تو اُنھیں کون دیکھ سکتا تھا۔ رات کو اور پھر طوفانی رات کو، پہاڑوں میں کون باہر نکلتا ہے۔ وہ وادی میں داخل ہو کر سیدھے سرمو

گاؤں میں آئے۔ وہ شمال کی طرف سے داخل ہوئے تھے اور سب سے پہلے جو مکان آتا تھا وہ نمبردار کی حویلی تھی۔ وہ سیدھے اس کے مکان میں داخل ہوئے۔ انھوں نے مکان کے جس کمرے کا دروازہ توڑا، اس میں گھوڑے بندھے تھے۔ گیا پور دروازے پر کھڑا رہا اور ہبگو اور بروق پا نے دونوں گھوڑوں کے رسّے کھولے اور ان کو لے کر چلے دیے۔ گھوڑے صرف دو بار ہنہنائے پھر چپ کر کے ان کے ساتھ ہو لیے۔ وہ گھوڑوں کو ہانک کر صبح سے پہلے اپنے غار میں لے آئے اور پھر ان کو پتھر کی چھُریوں سے ہلاک کیا۔ ایک گھوڑا اسی وقت کھا لیا گیا اور ایک گھوڑا اگلے دن کے لیے بچا کر رکھ لیا گیا۔

صبح تک ہوا اور برف کا طوفان تھم چکا تھا۔ تھانیدار غلام عباس نے اٹھ کر دیکھا، گھوڑے چوری ہو چکے تھے۔ دوپہر کو ڈی ایس پی بھی آ گیا۔ اسے جب معلوم ہوا کہ گھوڑے چوری ہو چکے ہیں تو اس نے پولیس پارٹی کو معطل کر دیا۔ پولیس لائن بجھوا دیا اور برفانی انسان کا کھوج لگانے کے لیے گاؤں والوں کی ایک جماعت مرتب کی جس کا امیر نمبردار غلام علی تھا۔ دراصل ڈی ایس پی کا خیال تھا کہ بروق پا مَر کھپ چکا ہے۔ اگر زندہ ہوتا تو آ جاتا۔ ویسے بھی اسے یقین تھا کہ برفانی انسان کی باتیں صرف قصہ کہانیاں ہیں۔ اس کے خیال میں نہ کبھی برفانی انسان موجود تھا، نہ ہے اور نہ ہو گا۔ چلو آ کر ڈی ایس پی نے ایس پی کو فون پر بتایا کہ اس نے تھانیدار غلام عباس، ایک حوالدار اور دو کانسٹیبلوں کو معطل کر دیا ہے اور گاؤں والوں کی جماعت مرتب کی ہے جو یقیناً بروق پا کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو گی۔

ایس پی نے کہا ''ٹھیک ہے! پولیس کا کام امن و امان رکھنا اور جرائم کی روک تھام کرنا ہے نہ کہ برفانی انسان کی تلاش۔ یہ کام ان لوگوں کو کرنا چاہیے جو برفانی انسان سے متاثر ہوئے ہیں۔''

''اگلے دن روزنامہ ''صدائے وطن'' راولپنڈی میں خبر چھپ گئی۔ سُرخی تھی:

''برفانی انسان پولیس پارٹی کے دو گھوڑے چرا کر لے گئے اور ڈی ایس پی نے پولیس پارٹی کے چار افراد کو معطل کر دیا۔ دیہاتیوں کی ایک جماعت منظّم کی گئی ہے تا کہ برفانی انسان کو تلاش کرے۔''

جب یہ خبر ایس پی اور ڈی ایس پی نے پڑھی تو ان کے غصے کی حد نہ رہی۔ خبر جس انداز

میں چھپی تھی اس سے ثابت ہوتا تھا کہ پولیس پارٹی نا اہل ہے۔ ڈی ایس پی خپلو دلاور علی کو گرفتار کرنا چاہتا تھا لیکن وہ تو پروفیسر الیگزنڈر کے ساتھ برفانی پہاڑوں پر تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ پولیس دلاور علی پر ہاتھ ڈالنے سے ڈرتی تھی کیونکہ روزنامہ ''صدائے وطن'' راولپنڈی کا بڑا بااثر اخبار تھا اور انسپکٹر جنرل پولیس صبح ناشتہ تب کرتے تھے جب ''صدائے وطن'' کی سرخیاں پڑھ لیتے تھے۔

دلاور علی پر ہاتھ ڈالنا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے برابر تھا۔ ڈی ایس پی کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ دلاور علی کو یہ پتا کیسے چلا کہ گھوڑوں کی چوری برفانی انسان نے کی ہے۔ کیا اسے یہ اطلاع گھوڑوں نے دی یا اسے یہ خبر برفانی انسان سے ملی۔

دوسرے دن گلگت سے ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس نے ایس پی سکردو کو فون کیا اور کہا کہ آئی جی صاحب کا حکم ہے کہ برفانی انسان کو پکڑنے اور بروق پا کو چھڑانے کے لیے کسی بہادر پولیس آفیسر کو مقرر کیا جائے اور اس کو اجازت دی جائے کہ وہ اپنی مرضی کے جوان چُنے۔ ڈی آئی جی پولیس نے یہ بھی کہا کہ آئی جی صاحب کہتے ہیں کہ قومی پریس بروق پا کی گمشدگی میں دلچسپی لے رہا ہے اس لیے ذرا بھی سستی نہ کی جائے۔ عوام کی جان اور مال کی حفاظت پولیس کا فرض ہے۔ ایس پی نے یہی حکم انہی الفاظ میں ڈی ایس پی خپلو کو سنایا اور ڈی ایس پی نے جاباز خان کو اس کی مرضی کے چار جوان دے کر سرمو گاؤں بھیجا تا کہ بروق پا کو برفانی انسان کے چنگل سے چھڑایا جائے۔ جاباز خان بہادر بھی تھا اور دیانت دار بھی۔ وہ کھانے پینے کا سامان خپلو سے لے کر آیا تھا۔ اس نے نمبردار سے جو کمرہ لیا اس کا باقاعدہ کرایہ طے کیا۔

ہوا اور برف باری کے طوفان کے بعد دو دن تک کوئی کام نہ ہو سکا۔ پولیس پارٹی معطل ہو گئی تھی۔ دوسری پولیس پارٹی مرتب نہ ہو سکی تھی۔ پروفیسر الیگزنڈر کی پارٹی بھی دو دن کچھ نہ کر سکی۔ ہر طرف برف ہی برف تھی۔ اس برف میں چلنا پھرنا بھی دشوار تھا۔ اگر برفانی انسان کے پیروں کے نشانات کہیں تھے بھی تو وہ برف میں گم ہو چکے تھے۔ پروفیسر نے سوچا تھا موسم کی خرابی کے باعث کہیں میری مہم ناکام نہ ہو جائے۔ تاہم وہ روزانہ رپورٹ لکھ رہا تھا۔ جو ہان ریوالور چلانا سیکھ چکی تھی۔

دلاور علی اب چائے کی بجائے کافی پینا پسند کرتا تھا۔ حاجی احمد ہرکارے کا کام کر رہا

تھا۔ ڈاک خپلو لے جاتا اور خپلو سے لے آتا۔ اس مقصد کے لیے وہ گھوڑا استعمال کرتا تھا جو مستقل طور پر بھاڑے پر رکوا لیا گیا تھا۔ لندن سے پروفیسر کو فاؤنڈیشن کے چیئرمین کے خط کا انتظار تھا لیکن اتنی جلدی تو خط راولپنڈی سے نہیں پہنچ سکتا۔ بہرحال وہ شدت سے ڈاک کا انتظار کر رہا تھا۔

جاباز خان نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گاؤں بھر کے صحت مند آدمیوں کی فہرست تیار کی۔ کُل آدمی ساٹھ تھے۔ ان میں نمبردار اور چوکیدار شامل نہ تھے۔ ہر رات چار آدمیوں کا پہرہ لگایا جاتا۔ پہاڑی علاقوں میں رات جلدی آ جاتی ہے۔ چنانچہ رات آٹھ بجے سے صبح دو بجے تک یعنی چھ گھنٹے ڈیوٹی طے کی۔ دو بجے وہ خود اپنے تین جوانوں کو لے کر پہرے پر کھڑا ہوتا۔ جب مسجد میں اذان ہوتی تو نماز پڑھ کر سو جاتا۔ ایک جوان کو کھانا پکانے پر لگا دیا۔ اس کی مدد کے لیے گاؤں کا چوکیدار تھا۔ جو سودا سلف لاتا اور ڈی ایس پی آفس سے رابطہ رکھتا۔ اس نے نمبردار غلام نبی کو کچھ رقم دی کہ وہ ایندھن وغیرہ کا انتظام کرے۔ اس کے اس کام سے سارے گاؤں میں جوش کی لہر پھیل گئی۔

ایک رات وہ اپنے جوانوں اور گاؤں کے دو جوانوں کو ساتھ لے کر سرمو ٹاپ پر آیا اور دوربین سے اِدھر اُدھر دیکھتا رہا۔ تین بجے صبح اس نے دیکھا کہ ایک قوی ہیکل برفانی انسان پہاڑی جنگل کی طرف سے درّہ چھوربٹ کا رُخ کیے ہوئے جا رہا ہے۔ اس کی چال میں وقار تھا اور وہ لاپرواہی سے جا رہا تھا۔ اس نے دوربین دوسرے جوانوں کو بھی دی اور انہوں نے بھی اسے بار بار دیکھا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ یہ برفانی انسان ہے تو جاباز خاں نے اس پر تھری ناٹ تھری رائفل سے فائر کیا۔

برفانی انسان گرا اور پھر اٹھ کر لڑکھڑاتا ہوا برفانی گھاٹی کی طرف چلا اور تھوڑی دیر میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ صبح ہونے پر جاباز خاں نے دیکھا کہ برف پر یتی کے پیروں کے نشان صاف دکھائی دے رہے ہیں۔

دو کمانڈو

تھانیدار جانباز خاں کی بہادری کا علم گاؤں والوں کو ہوا تو وہ عش عش کر اٹھے۔ سارے گاؤں میں ایک نیا جذبہ پیدا ہو گیا۔ گاؤں والوں کو اب یقین ہو گیا کہ برفانی انسان واقعی علاقے بھر میں وارداتیں کر رہے ہیں۔ بروق پا کو انہوں نے اغوا کیا ہے اور پولیس پارٹی کے دو گھوڑوں کے چور بھی وہی ہیں۔ بڑی بوڑھیاں یہ کہتی ہوئی سنی گئیں کہ الٰہی! کیسا زمانہ آ گیا ہے کہ برفانی انسانوں نے ہم انسانوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ ان کے خیال میں یہ قیامت کے قریب ہونے کی نشانیاں تھیں۔ سرمو کے لوگ کہتے تھے کہ اگر عام انسان بدلہ لیتا ہے تو برفانی انسان بھی ضرور بدلہ لیتا ہے۔ عام انسان تو معاف بھی کر سکتا ہے لیکن برفانی انسان تو وحشی ہوتا ہے۔ وہ تو ہرگز معاف نہیں کرتا۔

سرمو کے لوگ جہاں یہ کہتے تھے کہ جانباز خاں نے بہادری دکھائی وہاں یہ بھی کہتے تھے کہ اس نے برفانی انسان پر فائر کر کے اچھا نہیں کیا۔ اگر برفانی انسان بدلہ لینے پر اتر آئے تو وہ سرمو کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں گے۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔

برفانی انسان پر جانباز خان کی فائرنگ کا علم دلاور علی کو بھی ہو گیا تھا۔ وہ خاص طور پر اسے ملنے کے لیے سُرمو آیا۔ سرمو آنے کے لیے اس نے سالم جیپ کرائے پر لے رکھی تھی۔ اس نے جانباز خاں سے انٹرویو کیا اور تصویریں اتاریں۔ پھر اس نے واپس آ کر ساری بات پروفیسر الیگزنڈر اور مائیکل کو بتائی۔ ان سے فارغ ہو کر اس نے اپنے اخبار کے لیے فیچر لکھا اور پھر جیپ میں بیٹھ کر چیلو چلا گیا جہاں جا کر اس نے اگلی پچھلی تصویریں ڈویلپ کروائیں۔ ان تصویروں میں پروفیسر الیگزنڈر، مائیکل، محمد علی پورٹر، حاجی احمد پورٹر، جوہان، جانباز خاں تھانیدار، چار سپاہیوں، نمبردار، چوکیدار اور کئی دوسرے جوانوں کی تصویریں شامل تھیں۔ یہ سب

کچھ وہ انگریزوں کے خرچے پر کر رہا تھا اور ان کو ہر تصویر کی ایک ایک کاپی دیتا تھا۔ ''صدائے وطن'' میں جو خبریں اور فیچر چھپ رہے تھے، ان کی عکسی تصویریں بھی وہ پروفیسر الیگزنڈر کو دیتا تھا۔ لگتا تھا انگریز برفانی انسان کو دیکھنے میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی دلچسپی برفانی انسان کے بارے میں معلومات جمع کرنے میں کہیں زیادہ ہے۔ دلاور علی ان کو جو غلط سَلط باتیں بتا رہا تھا وہ اس پر انحصار کر کے اپنی رپورٹیں لکھ رہے تھے۔ دلاور علی کی دی ہوئی معلومات پر مبنی پروفیسر الیگزنڈر نے ایک عالمانہ مضمون ''سنڈے ٹائمز'' لندن کو بھی لکھ بھیجا تھا۔

بے چاری جوہان کو اب یقین ہو گیا تھا کہ اس کا خاوند زندہ نہیں ہے۔ اسے یا تو برفانی انسان ہضم کر چکے ہیں یا وہ برف میں دب کر مر چکا ہے۔ وہ تو اب نوکری کر رہی تھی۔ سو روپیہ روزانہ کچھ کم تنخواہ نہ تھی۔ پھر اسے کام بھی زیادہ نہ کرنا پڑتا تھا۔ انگریز تو ڈبل روٹی کھاتے تھے۔ چائے اور کافی خود بناتے تھے۔ اپنی جرابیں تک خود دھوتے تھے۔ محمد علی اور حاجی احمد پانی گرم کرتے تھے، سالن پکاتے تھے۔ اسے تو آٹا گوندھ کر روٹی پکانا پڑتی تھی۔ عام لوگوں کو شاید یہ معلوم نہیں کہ بلتی مرد سالن بہترین پکاتے ہیں۔ ہر بلتی مرد ایک اچھا باورچی بھی ہوتا ہے۔

جس برفانی انسان پر جانباز خاں نے فائرنگ کی، وہ گیالپور تھا۔ اسے معمولی زخم آیا تھا مگر اس نے بیول چانمہ (پتھروں پر گول دائرہ میں بیٹھ کر گپ شپ) کے دوران میں رات فائرنگ کا ماجرا سب کو سنایا۔ اس کی باتیں سب نے خاموشی سے سنیں۔ گیالپور نے غرا کر، چنگھاڑ کر، سیٹی بجا کر، شور کر کے اور اِن پر ہاتھ مار کر ساری کہانی سنائی۔ اس کی باتیں سن کر سب نے فیصلہ کیا کہ کل رات سرمو پر حملہ کیا جائے گا۔ بروق پا نے سوچا چلو آج کی رات غار میں مزے سے سوئیں گے اور کل رات ذرا رونق رہے گی۔

ان سب نے دوسرے گھوڑے کا بچا کھچا گوشت ختم کیا اور پھر برف پر ٹہلتے اور کھیلتے رہے۔ رات آئی تو وہ غار میں لیٹ کر سو گئے۔

ادھر سرمو میں سارا گاؤں جاگتا رہا کہ برفانی انسان حملہ کریں گے۔ لیکن کوئی حملہ نہ ہوا وہ سورج نکلنے پر بے فکر ہو کر اپنے کام دھندے میں مصروف ہو گئے۔

برفانی انسان بھی سوچتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سوچ کر ایک رات ناغہ کیا اور اگلی رات ڈیوٹی پر کھڑے تھانیدار جانباز خاں اور چوکیدار عبدالخالق کو اٹھا کر لے گئے۔

نومبر شروع ہوگیا تھا۔ اس مہینے میں سردی بڑھ جاتی ہے۔ برف باری بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ انہی دنوں میں بلتستان میں برف پر بھاگنے دوڑنے اور پھسلنے کی مشق کی جاتی ہے۔ اسے انگریزی میں سکی انگ اور سکیٹنگ کہا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیے پاکستانی آرمی کے میجر نُوری اور کیپٹن تنویر مُچلو کے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ تین دن سے مُچلو اور ہلدی کے درمیان سکی انگ اور سکیٹنگ کر رہے تھے۔ یہ ان کی ہابی تھی۔ ریسٹ ہاؤس کے باورچی نے ان سب سے دو ایک بار ذکر کیا تھا کہ سُرمو کے لوگ برفانی انسان کو پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن انہوں نے باورچی کی باتوں میں کوئی دلچسپی نہ لی تھی۔

مُچلو اور ہلدی کے درمیان دریائے ہوشے، دریائے شیوق میں گرتا تھا۔ ہلدی کی طرف سے جو ایک نالہ آتا ہے وہ دریائے ہوشے میں گرتا ہے۔ دریائے ہوشے وہاں سے نصف میل آگے بڑھ کر دریائے شیوق میں شامل ہو جاتا ہے۔ جس جگہ پر یہ دونوں دریا ملتے ہیں وہاں دریائے شیوق کے کنارے سرمو ہے یعنی سرمو مچلو سے زیادہ دور نہیں، لیکن اتنا قریب بھی نہیں کیونکر سرمو جانے کے لیے مچلو کے لوگوں کو پہلے چلو جانا پڑتا ہے۔

ایک دن ریسٹ ہاؤس کے باورچی نے دونوں فوجی افسروں کو بتایا کہ سکی انگ کے لیے سب سے اچھی جگہ سرموٹاپ سے ذرا آگے درہ چھوربٹ کی طرف ہے۔

''یہ جگہ بھی بہت اچھی ہے۔'' انہوں نے کہا اور باورچی کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ دراصل باورچی کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ اس کی بیوی میکے میں تھی اور وہ اسے لانے میکے جانا چاہتا تھا۔ اس کی آرزو تھی کہ فوجی افسر ریسٹ ہاؤس سے چلے جائیں اور اسے چھٹی مل جائے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کبھی سرمو کی شکار پارٹی کا ذکر کرتا اور کبھی کہتا کہ سرموٹاپ اور درہ چھوربٹ کے درمیان سکی انگ کے لیے زیادہ بہتر جگہ ہے۔

ایک رات جب وہ میجر نُوری اور کیپٹن تنویر کو کھانا کھلا رہا تھا، اس نے کہا:

''آج آپ سکی انگ کرتے ہوئے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ یوں جیسے کبوتر آسمان پر اڑ رہے ہوں۔''

دونوں فوجی افسر خاموشی سے کھانا کھاتے رہے۔ کھانے میں نمک زیادہ تھا ''آج تمھیں نمک کہیں سے مفت مل گیا تھا باورچی صاحب!'' کیپٹن نے پوچھا۔

''حضور! مچلو اور ہلدی کے درمیان سکی انگ تو اب مشکل نہیں ہے۔ یہاں تو اب میں بھی سکی انگ کر سکتا ہوں۔ میں نے آپ لوگوں کو تین دن تک برف پر دوڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس لیے۔'' وہ ادب کے لہجے میں بولا۔

میجر نُوری نے کیپٹن تنویر کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں اور وہ مسکرانے لگے۔

''سکی انگ کے ماہر، سالن میں نمک کیوں زیادہ ڈالا ہوا ہے؟'' میجر نوری نے پیار سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''سر غلطی ہوگئی۔'' وہ مسکین بن کر بولا۔

''چلو معاف کیا۔ صبح ناشتہ عمدہ بنانا۔ دوپہر کا کھانا ہم نہیں کھائیں گے کیونکہ کل ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔'' میجر نے باورچی کو بتایا۔

''سرکار! آپ کہاں جائیں گے؟'' اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

''وہاں جہاں سکی انگ اتنی آسان نہ ہو کہ باورچی بھی سکی انگ کرنے لگیں۔'' میجر بولا۔

''ہم کل سرموٹاپ پر جا کر سکی انگ کریں گے اور اب برتن اٹھا لو اپنے نمکین سالن سمیت۔'' کیپٹن تنویر نے غصے سے کہا۔

جب دوسرے دن وہ سرمو گاؤں میں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ رات برفانی انسان تھانیدار جانباز خان اور چوکیدار عبدالخالق کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ گاؤں کا ہر چھوٹا بڑا خوف زدہ تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں، کہاں جائیں۔ لیکن میجر نُوری اور کیپٹن تنویر کی آمد سے ان کی ڈھارس بندھ گئی۔ نمبردار نے دونوں کے لیے ایک کمرہ الگ کر دیا اور ان سے عرض کیا کہ وہ گاؤں کو بچانے کے لیے جو حکم دیں گے اس پر عمل ہوگا۔

میجر نُوری نے نمبردار سے کہا ''ہم آپ کو آپ کے کمرے کا کرایہ دیں گے جو کھانا کھائیں گے۔ اس کی قیمت ادا کریں گے۔ چائے، چینی، دودھ وغیرہ کے پیسے دیں گے۔''

''جناب! ہماری جانیں حاضر ہیں۔ بس ہمیں ان وحشی برفانی انسانوں سے بچائیے۔'' نمبردار نے کہا۔ اُس کی آواز میں گاؤں بھر کے لوگوں کی آواز شامل تھی۔

''آپ بےفکر رہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' میجر نے کہا۔

''برفانی انسان جن لوگوں کو پکڑ کر لے گئے ہیں۔ ہم ان کو بھی واپس لائیں گے۔''

کیپٹن تنویر نے انہیں حوصلہ دیا۔

تھوڑی دیر بعد دلاور علی بھی جیپ پر سوار ہو کر آ گیا۔ اسے صبح معلوم ہو گیا تھا کہ برفانی انسان تھانیدار اور چوکیدار کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔ اس نے نمبردار سے پُوچھا، سپاہیوں سے بات چیت کی۔ اسے معلوم ہوا کہ رات اڑھائی بجے جانباز خان چوکیدار کے ساتھ گاؤں کی نکڑ پر کھڑا باتیں کر رہا تھا اور اس کے سپاہی مختلف ناکوں پر مورچہ بندی کر کے پہرہ دے رہے تھے۔ تین برفانی انسان آئے اور ان دونوں کو اٹھا کر لے گئے۔ تھانیدار اور چوکیدار نے چیخنا چاہا لیکن انہوں نے اپنے بڑے بڑے ہاتھ ان کے چہروں پر رکھ کر ان کو یوں ڈھانپ دیا جس طرح گھڑے پر ڈھکنا دیا جاتا ہے۔

دلاور علی، میجر نُوری اور کیپٹن تنویر سے بھی ملا لیکن ان سے کوئی بات نہ کی صرف سلام کر کے چلا گیا۔ جب وہ پہاڑی جنگل میں پہنچا تو پروفیسر اس کا منتظر تھا۔ اُس نے اسے سارا واقعہ سُنایا۔

موت سامنے تھی

تھانیدار جانباز خان اور چوکیدار عبدالخالق کو اٹھا کر لے جانے والے برفانی انسانوں میں بروق پا شامل نہیں تھا۔ پھر اس کا ذہن بھی عقل مند اور امن پسند انسان کا تھا۔ یعنی ساٹھ سال کے انسان کا۔ اسے خون خرابے سے نفرت تھی۔ وہ لکڑ ہارا پیدا ہوا تھا اور ساری عمر اس نے لکڑیاں کاٹی تھیں، محنت مزدوری کی تھی۔ حلال رزق کمایا اور کھایا تھا۔ یہ تو قسمت کا پھیر تھا کہ وہ برفانی انسانوں کے قابو آ گیا۔ یہ اتفاق تھا کہ ہمگو نے اسے پسند کر لیا۔ اگر ہمگو نہ آتا تو شاید کوئی بھیڑیا یا برفانی چیتا یا کوئی اور جنگلی جانور اسے ہڑپ کر جاتا۔ وہ برفانی انسانوں کا شکر گزار تھا کہ انہوں نے اسے جان سے نہ مارا، اس کی جان بخش دی وہ اسے ہلاک کر سکتے تھے۔ وہ درندے تھے۔ تاہم اس کا ذہن برفانی انسانوں کی درندگی اور سفاکی کبھی قبول نہ کر سکا۔ ویسے وہ ان کو درندہ صفت اور ظالم خیال نہیں کرتا تھا۔ اگر برفانی انسان درندہ صفت، ظالم اور خون خوار ہوتے تو زمینی انسان کو کھا جاتے۔ وہ تو یاک، مارخور، بھیڑیئے، چیتے، لومڑ، لومڑی، گیدڑ، ریچھ، گھوڑے، خچر، گائے، (بلتی زبان میں زُوں) بیل (بلتی زبان میں زُو) بکری اور بھیڑ کا شکار کرتے تھے۔ یہ جانور نہ ملتے تو خرگوش، کچھوے، نیولے، بلی، چوہے اور سانپ کا شکار کرتے۔ یہ بھی نہ ملتے تو گھاس پات اور برف پر گزارہ کرتے۔ انہوں نے زمینی انسانوں کو کم از کم بروق پا کے سامنے جان سے نہ مارا تھا۔ جب گیالپور اور دو اور برفانی انسان تھانیدار اور چوکیدار کو کندھوں پر اُٹھا کر غار میں داخل ہوئے تو بروق پا ان کا واویلا سن کر حیران و پریشان ہو گیا۔

یہ اتفاق تھا یا تھانیدار اور چوکیدار کی بدقسمتی کہ وہ برفانی انسانوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ وہ کسی اور کو بھی پکڑ سکتے تھے۔ ان کو کیا معلوم تھا کہ تھانیدار نے گیالپور پر گولی چلائی ہے۔ یا

گیا پور کو کیا معلوم تھا کہ اس کا ملزم تھانیدار جاباز خان ہے۔ بہرحال جب دونوں کو غار میں لایا گیا تو وہ دونوں زندگی کے لیے چیخ و پکار کر رہے تھے۔ بروق پا فوراً پہچان گیا کہ ایک تھانیدار ہے اور دوسرا عام آدمی۔ دونوں کے رنگ موت کے خوف سے فق تھے اور دونوں پھٹی پھٹی نظروں سے برفانی انسانوں کو دیکھ رہے تھے جو گول دائرہ بنا کر ان کے اردگرد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں بروق پا بھی تھا لیکن وہ دونوں اسے بھی برفانی انسان سمجھے کیونکہ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔

''یہ ابھی ہمیں مار کر کھا جائیں گے۔'' چوکیدار رو کر بولا۔

''جو اللہ تعالیٰ کو منظور۔ لیکن خدا کے لیے رونا بند کرو۔'' تھانیدار نے ڈانٹ کر کہا۔

''ان کی منت سماجت بھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ ہماری زبان نہیں سمجھتے۔'' چوکیدار نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

''اگر یہ ہماری زبان سمجھتے تو پھر برفانی پہاڑوں میں کیوں رہتے۔'' تھانیدار نے کہا۔

''میرے بعد میرے بچوں کا کیا بنے گا؟'' چوکیدار پھر رونے لگا۔

''بچوں کا مالک اللہ ہے اور میں پھر کہوں گا کہ رونا بند کرو۔'' تھانیدار غصے میں بولا۔

''آپ کے بیوی بچوں کو تو سرکار دو لاکھ روپے اور زمین دے دے گی۔ بچوں کی تعلیم کا بندوبست کرے گی۔ ان کی شادیوں کا خرچہ دے گی لیکن میرا افسر تو نمبردار ہے جو کنجوس مکھی چوس ہے۔'' چوکیدار پھر زور زور سے رونے لگا۔

''تم بہت تھڑ دِلے ہو۔ جب مرنا ہے تو پھر مرنا ہے، گھبرانا کیا؟'' تھانیدار بولا۔

''معلوم نہیں آپ کس مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ ٹھیک کہا کسی نے تھانیدار سنگ دل ہوتے ہیں۔'' چوکیدار نے روتے ہوئے کہا اور اپنی ناک صاف کی۔

''دیکھو عبدالخالق، اگر ہمیں مرنا ہے تو بہادروں کی طرح مرنا چاہیے، مرنا تو ہے، روئے بغیر مرے یا رو کر مرے۔ اس لیے روئے بغیر کیوں نہ مر جائیں۔''

''میں شوق سے تو نہیں رو رہا۔ بس مجھے رونا آ رہا ہے۔ میں اسے روک نہیں سکتا۔ اگر میں مرنے سے پہلے رو سکتا ہوں تو کیوں نہ رو لوں۔'' چوکیدار نے کہا اور زور زور سے رونے لگا۔

بروق پا یہ سب کچھ سن رہا تھا اور سمجھ رہا تھا لیکن ان سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا تاکہ

برفانی انسان یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ بھی ان میں سے ہے یا ان سے سازش کر رہا ہے۔ پھر اس نے زور زور سے غُرانا شروع کیا جس کا مطلب تھا کہ ان کو چھوڑ دو۔ گیا پور نے منہ سے سیٹی کی آواز نکالی جس کا مطلب تھا ''نہیں۔''

''اب یہ ہمیں مارنے کا مشورہ کر رہے ہیں۔'' چوکیدار بولا۔

دو برفانی انسانوں کو شور مچاتے دیکھ کر اس نے رونا بند کر دیا تھا۔ اب پھر رونے لگا۔

''پھر وہی فضول رونا۔ تمھارے رونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ برفانی انسانوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ روتے نہیں ہیں۔'' تھانے دار بولا۔

''اگر روتے نہیں ہیں تو ہنستے بھی نہیں ہیں۔ ہم جب سے آئے ہیں گم سم بیٹھے ہیں۔ میں نے ان کو ہنستے ہوئے نہیں دیکھا۔''

''اگر تم ان کو ہنستے ہوئے دیکھ لو گے تو کیا ان کا فوٹو اتارو گے؟''

''میرے پاس تو کیمرہ ہی نہیں۔ اگر ہوتا بھی تو ان کا فوٹو کس کام کا۔ سوائے ڈرنے کے کس کام آ سکتا ہے ان کا فوٹو؟'' چوکیدار نے نفرت سے کہا اور موت کے ڈر سے پھر رونے لگا۔

بروق پا نے پہلے کی طرح پھر شور مچایا جس کے جواب میں گیا پور نے زیادہ شور مچایا۔ بروق پا نے کہا تھا کہ ان کو چھوڑ دو۔ گیا پور نے کہا تھا کہ ہم ان کو کھانا چاہتے ہیں۔

چوکیدار دھاڑیں مار کر رونے لگا۔ اس کے رونے کی آواز سارے غار میں گونجنے لگی۔ تھانیدار جاباز خاں بہت بے زار ہوا۔

''ان برفانی انسانوں کا تو مجھے پتہ نہیں، تجھے ماریں گے یا نہیں، البتہ میں تجھے شوٹ کر رہا ہوں'' تھانے دار نے پستول نکالنے کے لیے اپنے پہلو پر ہاتھ مارا لیکن وہاں پستول تھا نہ خول۔

''برفانی سہی، آخر انسان ہیں، انہوں نے آپ کا خول اور پستول سب سے پہلے اتارا ہے۔'' چوکیدار رونا بند کر کے بولا۔

''میرا خیال ہے پستول کی گولی بھی ان پر اثر نہ کرتی ہو گی۔'' تھانیدار ان کو دیکھ کر بولا۔

''پستول کی گولی؟ ان پر تو گرنیڈ بھی بے اثر ہے۔ دیکھتے نہیں ان کی چمڑی کتنی موٹی ہے۔'' چوکیدار نے نفرت سے کہا۔

''مجھے تو بال ہی بال نظر آ رہے ہیں۔ چمڑی بالوں کے اندر چھپی ہو گی۔'' جاباز نے

حیران ہو کر کہا۔

چوکیدار ان سب کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ اس کی نظروں میں نفرت بھی تھی اور خوف بھی۔ پھر بولا:

''کہتے ہیں انسان کی چمڑی جتنی موٹی ہو، اتنا بے وقوف ہوتا ہے۔''

بروق پا کا جی چاہا کہ وہ ڈانٹ کر کہے ''بکواس بند کر'' لیکن وہی خوف کہ برفانی انسانوں پر پتا نہیں، اس کے ان الفاظ کا کیا اثر پڑے۔ اُس نے پھر زور شور سے چلانا شروع کر دیا اور اپنی رانوں پر مُکّے مارنے لگا۔ اب کے گیالپور نے ایک بار سیٹی بجائی اور بروق پا غار سے باہر نکل گیا۔

''یہ گیا ہے چُھری لانے۔'' چوکیدار نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

''بس اب ہم کو مرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ اللہ کو یاد کرنا چاہیے۔'' تھانیدار بولا۔

''مجھے تو اپنے بچے یاد آ رہے ہیں۔ ان کا کوئی والی وارث نہیں ہے۔'' چوکیدار بولا۔

''اللہ ان کا والی وارث ہے۔ فکر نہ کرو۔''

''تھانیدار! بے وقوف نہ بنو۔ ہم مرنے والے ہیں'' چوکیدار چلا کر کہنے لگا۔

''اللہ تعالیٰ ہمیں حوصلہ عطا فرمائے۔'' تھانیدار بولا اور پھر دل میں دُعائیں کرنے لگا۔

بروق پا ان کو بچانا چاہتا تھا۔ آخر وہ انسان تھا۔ چنانچہ بروق پا نے گیالپور سے کہا تھا کہ اگر وہ کوئی اور شکار لا دے تو ان دونوں کو چھوڑ دینا۔ گیالپور نے کہا ''ٹھیک ہے'' چنانچہ بروق پا شکار کے لیے نکل گیا۔ اس نے برفانی انسان کی کھال کا چُغہ پہن رکھا تھا۔ اس نے دریائے شیوق کے الٹ دریائے سندھ کی طرف رُخ کیا اور ڈگ بھرنے لگا۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔ ابھی ہر طرف اندھیرا تھا۔ اس کا رُخ ''گولڈن ٹاور'' کی طرف تھا۔ گولڈن ٹاور ایک چوٹی کا نام تھا جس کی بلندی 22333 فٹ تھی۔ یہ چوٹی بھورے ریچھ، برفانی چیتے اور برفانی یاک کے لیے مشہور تھی۔ برفانی یاک اسے کہتے ہیں جو گھریلو یاک نہ ہو یعنی جنگلی یاک ہو اور بوجھ ڈھونے کے کام نہ آتا ہو۔ ظاہر ہے گھریلو یاک بوجھ ڈھونے کے کام آتا ہے۔ گولڈن ٹاور کی طرف مارخور کم ہوتے ہیں البتہ سرموٹاپ کی طرف مارخور زیادہ پائے جاتے ہیں۔

اس خیال سے کہ بروق پا کہیں بھاگ نہ جائے، گیالپور نے ایک یتی کو اس پر نگاہ رکھنے

کے لیے مقرر کیا تھا جو اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

بروق پا برف میں چل رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں اِدھر اُدھر شکار کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ دل میں دُعا مانگ رہا تھا کہ خُدا اسے جلد شکار دے دے۔ وہ بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں دیکھتا برفانی دروں میں جھانکتا برفانی دراڑوں سے بچتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اچانک اس کے کانوں میں یاک کے ڈکرانے کی آواز آئی۔ اس نے بائیں جانب دیکھا۔ قلعہ نما پتھر کی اوٹ سے شور اٹھ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے ریچھ لڑ رہے ہوں۔ وہ احتیاط سے پیر اٹھاتا ہوا پتھر کی طرف بڑھا۔ اس کی دوسری طرف ایک برفانی یاک کو دو برفانی چیتے گھیرے ہوئے تھے۔ یاک اپنی جان بچانے کے لیے برفانی چیتوں پر سینگوں سے حملہ کرتا اور کبھی پچھلی ٹانگوں سے دولتی مارتا۔ برفانی چیتوں کے پنجوں سے یاک کی کھال اس کی پسلیوں سے اُدھڑ چکی تھی۔ بروق پا نے دیکھا برفانی یاک اور برفانی چیتوں کی جنگ میں برف ریزہ ریزہ ہو کر اڑ رہی تھی۔ اگر قلعہ نما پتھر کی اوٹ یاک کو حاصل نہ ہوتی تو اب تک وہ مر چکا ہوتا۔

بروق پا تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے چیتوں کو للکارا۔ اس کی للکار سن کر چیتے حملہ کرتے کرتے رُک گئے اور پھر اسے دیکھ کر بھاگ اُٹھے۔ وہ سمجھے برفانی انسان آ گیا ہے حالانکہ وہ صرف انسان تھا۔ بروق پا نے آگے بڑھ کر ایک یاک کے دونوں سینگ، دونوں ہاتھوں سے پکڑے اور زور سے مروڑ ڈالے۔ یاک تیورا کر گرا، اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا تھا۔ بروق پا نے اسے اپنی کمر پر لادا اور غار کی طرف چل پڑا۔

جب وہ برفانی یاک کو اُٹھائے غار کے اندر داخل ہوا تو برفانی انسانوں نے زور زور سے شور مچایا اور ران اور پیٹ پر خوشی سے دوہتڑ مارنے لگے۔ اس نے یاک کو پتھر پر پھینکا تو سارے اس پر جھپٹ پڑے۔ بروق پا نے آگے بڑھ کر تھانیدار اور چوکیدار کو کلائیوں سے پکڑا اور غار سے باہر آ گیا۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔

''تھانے دار جی۔'' یہ اب ہمارے ساتھ کیا کرنے والا ہے؟'' چوکیدار روہانسی آواز میں بولا۔

''میرا خیال ہے یہ ہمیں جان سے مار کر کھا جائے گا، اکیلا ہی۔'' تھانیدار آہستہ سے بولا۔

''یہ خود یاک کیوں نہیں کھاتا؟'' چوکیدار نے پوچھا۔

''مجھے کیا معلوم؟ اس سے پُوچھو؟'' تھانیدار بولا۔

''میرا خیال ہے یہ سب کا سردار ہے اور ہمیں اُس جگہ لے جا کر کھائے گا جہاں آپ نے اس پر فائر کیا تھا۔'' چوکیدار سرگوشی کے انداز میں بولا۔

''تجھے کیا معلوم کہ میں نے اس پر فائر کیا تھا؟'' تھانیدار جانباز خان نے پوچھا۔

چوکیدار نے اس کے زخمی بازو کی طرف اشارہ کیا۔ برفوق پا ان کو ساتھ لے کر چلتا رہا۔ سورج کی شعاعیں برف پر گر کر پلٹ رہی تھیں اور تھانیدار اور چوکیدار کو اندھا کر رہی تھیں۔ دونوں نے آنکھیں بند کر لیں اور خود کو اللہ کے سپرد کر دیا۔ برفوق پا ڈگ بھرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ پھر ایک جگہ جا کر اس نے ان دونوں کو چھوڑ دیا اور خود پلٹ آیا۔ کچھ دور سُرموگاؤں تھا۔ برفوق پا کے پہرہ پر مامور ریتی بھی اس کے ساتھ واپس غار کی طرف چل دیا۔

تلاش

تھانیدار جانباز خان اور چوکیدار عبدالخالق جب برفوق پا کے ساتھ چل رہے تھے تو ان کا خیال تھا کہ برفانی انسان کی فولادی انگلیاں ان کی شہ رگ پر آئیں گی کہ آئیں۔ ان کے اوسان خطا ہو گئے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ برفوق پا کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ ان سے بات کرے انہیں بتائے کہ وہ کون ہے؟ انہیں اپنی بیوی جوہان کے بارے میں بتائے، اس کے متعلق پوچھے لیکن اس نے بے بسی سے سوچا اگر ان پر ظاہر ہو بھی گیا کہ وہ برفوق پا ہے تو وہ اس کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ اس سے بہتر ہے کہ وہ خاموش رہے۔ اس کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی اور وہ جانے کے لیے واپس پلٹ گیا۔ وہ آگے آگے تھا اور پہریدار ریتی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اگر پہریدار ریتی ساتھ نہ ہوتا تو وہ بھی ان دونوں کے ساتھ سُرموگاؤں چلا جاتا۔ کاش ایسا ہوتا۔ جانباز خان اور عبدالخالق آنکھیں بند کیے زمین پر بیٹھے تھے۔

برفانی انسان کے جانے کی آواز، ان کے کانوں میں آئی تو انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا برفانی انسان جلدی جلدی واپس جا رہا تھا۔ ان کی جان میں جان آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر وہیں برف پر بیٹھے بیٹھے ایک دوسرے سے بغل گیر ہو گئے۔ چوکیدار اور جانباز خان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ دونوں زمین پر سجدہ میں گر گئے۔ دونوں نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔

جب وہ سُرموگاؤں پہنچے تو لوگ ہکا بکا رہ گئے۔ نمبردار کو پتا چلا تو بھاگ کر آیا۔ گاؤں کے بہت سے لوگ اس کے ساتھ تھے۔

''کہاں سے آ رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' تھانیدار بولا۔

''آپ دونوں کو تو یتی اٹھا کر لے گئے تھے۔'' نمبردار نے تصدیق چاہی۔

''درست ہے۔ ہمیں یتی اٹھا کر لے گئے تھے۔'' تھانیدار بولا۔

''پھر واپس کیسے آ گئے؟'' ایک شخص نے پوچھا۔

''ایک یتی اس گاؤں سے باہر چھوڑ گیا۔'' تھانیدار نے کہا۔

''یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ برفانی انسان اٹھا کر لے جائیں اور پھر چھوڑ جائیں!'' نمبردار بولا۔

''ایسا ہوا ہے۔ ہمیں یتی اٹھا کر لے گئے تھے۔ ان میں سے ایک ہمیں واپس چھوڑ گیا۔'' تھانیدار نے یقینی انداز میں کہا۔

''کمال ہے ایسا ہو نہیں سکتا!'' نمبردار بولا۔

''نمبردار جی! میں تو چلا اپنے گھر۔ آپ تھانیدار صاحب کو کھانا کھلائیے، بھوکے ہیں۔'' چوکیدار نے کہا اور اُٹھ کر چل دیا۔

نمبردار گھر کے اندر گیا تا کہ تھانیدار کے لیے کھانا لے آئے۔ چاروں سپاہی بھی آ گئے۔ وہ تھانیدار کو دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ پھر نمبردار کی حویلی میں میجر نُوری اور کیپٹن تنویر بھی آ گئے اور وہ تھانیدار سے سوال پوچھنے لگے۔

نمبردار گھر سے کھانا لے آیا۔ مُرغ پلاؤ، مُرغ کا سالن، چپاتیاں، دہی، ٹماٹر، پیاز، سلاد، لسّی کا گلاس جس میں نمک ملا ہوا تھا۔ تھانیدار کھانا کھاتا رہا اور میجر نُوری اور کیپٹن تنویر کو ان کے سوالوں کے جواب دیتا رہا۔ میجر نوری اور کیپٹن تنویر کو ان کے چلے جانے کے بعد وہ کمبل لے کر سو گیا۔ وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ جب وہ تین گھنٹے کے بعد اُٹھا تو رات ہو چکی تھی اور دلاور علی اس کا انٹرویو لینے کے لیے موجود تھا۔ دو گھنٹے تک وہ تھانیدار سے سوال کرتا رہا۔ جب تسلی ہوگئی اور وہ جانے لگا تو نمبردار نے کہا کہ رات ہو چکی ہے۔ اب نہ جاؤ۔ اگر برفانی انسان تھانیدار کو پستول سمیت اٹھا سکتے ہیں تو اخبار نویس کو بھی جیپ سمیت اُٹھا سکتے ہیں۔ رات ہمارے پاس رہو۔

اس رات دلاور علی سرمو میں نمبردار کا مہمان بن کر رہا۔ اسی رات جانباز خان نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی پارٹی کو لے کر واپس چلا جائے گا۔ کمانڈوز آ گئے تھے، وہ جانیں اور برفانی انسان جانیں۔

دوسرے دن صبح سویرے دلاور علی جیپ میں بیٹھ کر جنگل میں اپنے کیمپ میں چلا گیا۔

اس نے خوب نمک مرچ لگا کر واقعات تیار کیے اور پروفیسر الیگزنڈر اور مائیکل کو سنائے تو وہ بہت خوش ہوئے۔

''مارا تھیوری ٹیک نکلا۔'' پروفیسر بولا۔

''کیا ٹھیک نکلا پروفیسر؟'' دلاور علی نے پوچھا۔

''تھیوری۔ خیال۔ ہمارا تھیوری تھا کہ اِدھر بلٹستان میں یتی رہتا ہائے۔''

''وہ تو اب ثابت ہوگیا۔ وہ تھانیدار اور چوکیدار کو اٹھا کر لے گئے اور اٹھا کر چھوڑ گئے۔''

''ٹیک ہائے۔ یتی جو ہائے وہ بیڈ مین نہیں ہائے۔ گڈ مین ہائے۔ جان نہیں لیتا ہائے۔ یہ بھی ہمارا تھیوری ہائے۔'' پروفیسر بولا۔

''یہ بھی ثابت ہوگیا کہ برفانی انسان بُرا آدمی نہیں ہے۔ اچھا آدمی ہے۔'' دلاور علی نے تصدیق کی۔

''اب ہم اِدھر لنڈن میں بتائے گا کہ یتی گڈ مین ہائے۔ یہ بڑی بات ہائے۔'' پروفیسر نے اپنے آپ سے بات کی۔

واپس خیمے میں آ کر دلاور علی نے خبر تیار کی کہ برفانی انسان جن دو آدمیوں کو اُٹھا کر لے گئے تھے۔ انہوں نے وہ آدمی واپس کر دیے ہیں اور ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ پھر وہ اس خبر کو راولپنڈی اور پروفیسر کی رپورٹ کو لندن بھجوانے کے لیے جیپ میں بیٹھ کر چلو روانہ ہو گیا۔ جب وہ جانے لگا تو جوہان نے اسے کہا کہ وہ کپڑے دھونے کے لیے صابن اور ہنڈیا میں ڈالنے کے لیے ادرک لیتا آئے۔

میجر نُوری اور کیپٹن تنویر کو تھانیدار اور چوکیدار کی باتوں پر یقین نہ آیا تھا۔ دونوں نے چوکیدار کو بلوا کر اس سے تھانیدار کی باتوں کی تصدیق چاہی تھی۔ دونوں کا خیال تھا کہ تھانیدار اور چوکیدار ہیرو بننے کے لیے جھوٹ بول رہے ہیں۔ معلوم نہیں کہاں کسی پتھر کی اوٹ میں بیٹھ کر آ گئے ہیں اور برفانی انسان کی من گھڑت کہانی سُنا رہے ہیں۔ وہ دونوں آرمی کے سپیشل سروسز گروپ کے آفیسر تھے یعنی کمانڈوز تھے جن کو گوریلا بھی کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کمانڈوز نہایت بہادر، نڈر، دلیر، سخت کوش، مُہم جُو، صابر، مستقل مزاج اور بھوک پیاس کے عادی ہوتے ہیں۔ وہ جوش و ہوش کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ بجلی کی طرح گرجتے ہیں اور شیر کی طرح

دھاڑتے ہیں۔ ان کے لیے دن دن نہیں ہوتا اور رات رات نہیں ہوتی۔ ان کی تربیت ایسی ہوتی ہے کہ وہ پہاڑ سر کرتے ہیں، دریا عبور کرتے ہیں۔ آگ میں سے نکل جاتے ہیں۔ ہوا کو چیر دیتے ہیں۔ اڑتی چڑیا کے پر کُترتے ہیں۔ لپکتے شاہین کا رُخ بدل دیتے ہیں۔ طوفانوں سے بھڑ جاتے ہیں اور برفانی انسان کو شکست دے دیتے ہیں۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ برفانی انسان کو پکڑیں گے اور زندہ پکڑ کر لائیں گے۔

آرمی کے دونوں کمانڈوز افسروں نے اپنا سامان چیک کیا۔ ڈفل کوٹ پارکا جیکٹ، آئس ایکس، سیکی اِنگ شوز، سیکز، پارکا، ٹراؤزر، برف سے بچانے والی کالی عینکیں یعنی سنوگاگلز، برف پر چلنے کے لیے ریچھ کے پنجے یعنی ''بیئر پاز''۔ یہ تین قسم کے ہوتے ہیں چھوٹے، بڑے اور درمیانے۔ ان کو اس لیے پہنا جاتا ہے کہ پیر برف میں نہ دھنس جائیں۔ بڑے سے بڑا بیئر پاز ڈیڑھ فٹ ہوتا ہے لیکن ٹریل میکرز ڈھائی فٹ لمبے ہوتے ہیں۔ ان کو بھی پیروں میں پہنا جاتا ہے تاکہ پیر برف میں نہ دھنس سکیں۔ یہ چھاج کی طرح ہوتے ہیں ان کو پہن کر چلنے میں بڑا زور لگتا ہے کیونکہ پیر اٹھا کر اوپر لے جاتے ہیں اور پھر برف پر رکھتے ہیں۔ دستانے، بُوٹ، تھرمل، جرابیں۔ یہ جرابیں ایک بار جسم کی گرمی سے گرم ہو جاتی ہیں تو پھر گرم ہی رہتی ہیں۔ تھرمل انڈرویئر، تھرمل بنیانیں، ٹارچ، پستول، ریوالور، برین گن، گرینیڈ، تنگی کا بنا ہوا خنجر، وہ گولیاں جن کو کھا کر چوبیس گھنٹے تک نہ بھوک لگتی ہے اور نہ پیاس، سر کی گرم ٹوپیاں، دیا سلائیاں، لائیٹر، دوائیں، انجکشن غرض کہ فہرست بنا کر انہوں نے ایک ایک چیز کو دو دو بار چیک کیا اور پھر بہت سی دُعاؤں کے ساتھ ٹھیک بارہ بجے دوپہر سرموگاؤں سے روانہ ہو گئے۔ ان کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ سرموٹاپ اور گولڈن ٹاور کے درمیان سارا برفانی علاقہ چیک کریں گے۔ تھانیدار اور چوکیدار نے جو کچھ بتایا تھا، اس کے پیش نظر برفانی انسان اسی علاقہ میں تھا۔ سرموٹاپ کی بلندی تو اتنی زیادہ نہ تھی لیکن گولڈن ٹاور کی چوٹی کی بلند 22333 فٹ تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ گولڈن ٹاور پر چڑھ جائیں گے۔ وہ اپنی ساری تیاریاں مکمل کر کے گئے تھے۔ وہ دونوں سکی انگ کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ ان کا رُخ جنگل کی طرف تھا۔ جب وہ جنگل کی طرف بڑھے تو سامنے پروفیسر الیگزینڈر، مائیکل، حاجی احمد اور محمد علی کوہِ پیاؤں کے ساز و سامان کے ساتھ یتی کے پیروں کے نشان تلاش کر رہے تھے۔ وہ

اپنا کام چھوڑ کر کمانڈوز کو دیکھنے لگے۔ کمانڈوز نے قریب آ کر ان کا حال دریافت کیا۔ محمد علی نے بتایا کہ وہ دو انگریز ماہروں کے ساتھ مل کر برفانی انسان کے متعلق معلومات جمع کر رہے ہیں۔ ان کے پیروں کے نشانات کی تصویریں لیں گے اور اگر وہ مل گئے تو ان کی تصویریں لیں گے۔ ان انگریزوں کو ''عجیب و غریب مخلوقات عالم'' نام کی انجمن نے بھیجا ہے۔ وہ دلاور علی سے بھی دونوں انگریزوں کے بارے میں سن چکے تھے۔ اس لیے انہوں نے وہاں زیادہ وقت ضائع نہ کیا۔ وہ سرمو وادی کے ساتھ ساتھ سرموٹاپ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہ چاہتے تھے سرموٹاپ پر رات بسر کریں۔ جب وہ سرموٹاپ کے نیچے آئے تو انہوں نے سکیز اتار دیں اور اُوپر جانے کے لیے تیاری کرنے لگے۔

تھانیدار غلام عباس، اس کے جوان اور چوکیدار عبدالخالق بھی ایک دن سرموٹاپ پر آئے تھے اور وہ بھنے ہوئے مُرغ کھا کر اور تاش کھیل کر واپس چلے گئے تھے۔ تھانیدار غلام عباس کی پارٹی نے سرموٹاپ پر چڑھنے کے لیے تین گھنٹے لگائے تھے لیکن دونوں کمانڈو دو گھنٹے کی کوشش کے بعد سرمو چوٹی پر چڑھ گئے تھے۔ دونوں نے چوٹی کا جائزہ لیا۔ گھوم پھر کر دیکھا، وہاں نہ کوئی برفانی انسان تھا اور نہ ہی اس کے پیروں کے نشان تھے۔ شام ہونے کو تھی۔ پہاڑ پر چڑھنا اگر مشکل ہے تو اُترنا بھی آسان نہیں۔ اس کے علاوہ وہ دونوں مُہم جُو اور خطر پسند تھے۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کیا کہ رات چوٹی پر بسر کی جائے۔ ان کے ذہن میں یہ خیال بھی تھا کہ شاید رات کو اس چوٹی پر برفانی انسان آ جائیں۔ ایسی صورت میں وہ برفانی انسان کو دیکھ سکیں گے۔

دونوں نے مل کر میخیں اور کیل لے کر اپنا خیمہ ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں گاڑ دیا۔ پہلے ہنٹر بیف کھایا۔ پھر کافی تیار کی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا چھا گیا۔ چاروں طرف سناٹا تھا جس کو صرف تیز ہوا چیر رہی تھی۔ ان دونوں میں طے پایا کہ پہلے میجر پہرہ دے گا اور اس کے بعد کیپٹن ڈیوٹی پر ہو گا۔ خطرہ تھا کہیں برفانی انسان یا برفانی چیتا یا برفانی ریچھ اچانک حملہ نہ کر دے۔

رات بھر ٹھنڈی ہوائیں چلتی رہیں اور چیختی رہیں۔ نہ برفانی انسان آیا نہ برفانی چیتا اور نہ ہی برفانی ریچھ۔ جب صبح سورج نکلا تو کیپٹن تنویر نے میجر کو جگاتے ہوئے کہا۔ ''سر، اٹھو صبح ہو گئی۔''

ابراہیم

میجر نوری نے خیمے سے باہر آ کر دیکھا۔ روشنی ہر طرف پھیل گئی تھی اور ہوا تھم گئی تھی۔ خاموشی اتنی زیادہ تھی کہ جی چاہتا تھا ساری عمر برفانی چوٹی پر بیٹھ کر گزار دی جائے۔ وہاں سے خدا بھی بہت قریب محسوس ہوتا تھا۔ وہ ساری زندگی وہیں بیٹھ کر گزار دیتے لیکن ان کو دنیا کے اور بھی کئی کام کرنا تھے اور ان کاموں کی خاطر ان کو واپس جانا تھا۔ چنانچہ دونوں ناشتہ کرنے لگے۔ ناشتہ میں کیا تھا؟ ہنٹر بیف اور کافی۔ پھر وہ نیچے اترنے لگے۔ نیچے اترنے کے لیے بھی مہارت اور احتیاط کی ضرورت تھی۔ وہ مہارت اور احتیاط سے کام لیتے ہوئے تین گھنٹوں میں نیچے آ گئے۔

نیچے آ کر وہ آرام کرنے لگے کیونکہ وہ خاصے دم پُخت ہو گئے تھے۔ وہ تھوڑی دیر تک ستائے۔ اس کے بعد انہوں نے وہ شوز پہنے جن کی مدد سے برف پر سکی انگ ہو سکتی ہے یعنی سکی انگ شوز پہنے۔ برف توڑنے والے کلہاڑے یعنی آئس ایکس لیے اور سکیز پر کھڑے ہو کر پہاڑی جنگل کا رُخ کیا۔ دراصل ان کو سُرموگاؤں جانا تھا لیکن سرموگاؤں جانے کے بجائے انہوں نے جنگل کا رُخ کیا۔ وہ دوپہر کو جنگل کی قریبی ڈھلان پر سکی انگ کرتے ہوئے پہنچ گئے۔ وہ دونوں پسینے میں بھیگ چکے تھے حالانکہ وہ ٹھنڈی برف پر دوڑ رہے تھے۔ پسینہ اس لیے آیا کہ ان کے جسم مشقت سے تھک چکے تھے اور پسینہ ثبوت تھا، جسم کی طاقت خرچ ہونے کا۔

پہاڑی جنگل کی ڈھلان پر ان کو سب سے پہلے حاجی احمد نے دیکھا۔ وہ ان کے پاس گیا۔ ان کو سلام کیا، حال احوال پوچھا اور پھر اُن کو پروفیسر الیگزنڈر اور مائیکل کے پاس لے گیا۔ وہ دونوں آرمی افسروں سے مل کر بہت خوش ہوئے اور ان کو اپنے پاس دوپہر کے کھانے یعنی لنچ کے لیے روک لیا۔ دلاور علی بھی ان سے مل کر بہت خوش ہوا۔ وہیں لکڑ ہارے کی بیوی

جوہان تھی۔ دونوں کمانڈوز کا تعارف جوہان سے ہوا۔ جب جوہان دونوں آرمی افسروں سے ملی تو اس نے پہلے تو رو رو کر اپنی دکھ بھری کہانی یعنی بپتا ان کو سنائی پھر ان کو ڈھیر ساری دُعائیں دیں اور اس کے بعد وہ اٹھ کر آٹا گوندھنے کے لیے چل دی۔

اس روز دلاور علی نے دو مُرغ خود روسٹ کیے اور ان کو خوب مرچ مصالحہ لگا کر کمانڈوز کے سامنے رکھا۔ انگریزوں نے یخنی یعنی سوپ پیا اور بوٹیاں دلاور علی، حاجی احمد اور محمد علی کے کام آئیں۔ جوہان نے کچھ نہ کھایا۔ اپنے میاں کو یاد کر کے روتی رہی...... بے چاری!

کمانڈوز پہاڑی جنگل میں بھُنے ہوئے مرغے یا مرغ بھون کر کھانے کے لیے نہیں آئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ انگریزوں کی ٹیم بھی گولڈن ٹاور پر یا اس کے اردگرد برفانی انسان کو تلاش کرنے میں ان دونوں کا ساتھ دے۔ کھانا کھانے کے بعد میجر نوری اور کیپٹن تنویر نے پروفیسر الیگزنڈر سے بات چیت شروع کی۔ وہ انگریزی میں گفتگو کرتے رہے حالانکہ پروفیسر الیگزنڈر اردو جانتا تھا۔ کمانڈوز کی تجویز سن کر پروفیسر نے اپنے شاگرد مائیکل سے بھی مشورہ کیا اور دلاور سے بھی۔

میجر نُوری نے گفتگو کے دوران میں پروفیسر الیگزنڈر سے پوچھا:

''اس بڑھاپے میں آپ کو برفانی انسان تلاش کرنے کا شوق کیونکر پیدا ہوا؟''

''اُڈر ہم چائیلڈ ھُڈ (بچپن) سے برفانی انسان کو دیکھنا مانگتا۔ اُڈر لائبریری میں بہٹ پہلے ہم نے اس کا فوٹو دیکھا۔'' پروفیسر نے یہ کہہ کر اپنے ہاتھوں سے اشاروں کی زبان میں برفانی انسان کا حلیہ بنایا جو خاص خوفناک تھا۔ خوف ناک یوں کہ ہاتھوں سے حلیہ بنانے کے ساتھ ساتھ پروفیسر چہرے سے خوف کے تاثرات بھی ساتھ ساتھ پیش کرتا رہا۔

''تو اُدھر آپ کو بچپن سے برفانی انسان دیکھنے کی خواہش تھی؟'' میجر نُوری نے پروفیسر کا فقرہ دُہرایا۔

''جی ہاں! اُڈر ہم بچپن سے برفانی انسان کو ملنا مانگتا۔ ہم برف کے زمانہ میں، جب اُڈر برف پڑتا تو ہم برفانی انسان کا شکل بناتا اور پھر ساتھی بچوں کو دکھاتا کہ ایسا ہوتا ہے برفانی انسانی۔''

پروفیسر ذرا دیر کے لیے رُکا اور پھر بولا:

''سکول کے بعد ہم کالج میں گیا تو ہم نے زوآلوجی کا مضمون لیا۔ کیا ہوتا ہے بھلا یہ

مضمون۔'' پروفیسر نے میجر نُوری سے پوچھا لیکن جواب دلاور نے دیا:

''یہ مضمون چڑیا گھر کا ہوتا ہے۔ چڑیا گھر کو انگریزی زبان میں زُو (Zoo) کہتے ہیں۔ زو میں چرندے پرندے اور درندے ہوتے ہیں۔ میں ایک بار لاہور کے زو میں گیا تھا۔ یہ چڑیا گھر ٹھنڈی سڑک پر ہے۔ اندر جا کر سارے جانور دیکھے۔ شیر، چیتا، بھیڑیا، لومڑی، بندر، لنگور، برفانی چیتا جو اِدھر بلتستان میں ہوتا ہے۔ دراصل وہ بلتستان کا برفانی چیتا تھا جو میں نے دیکھا۔ ایک کمرہ بنایا گیا تھا جس میں وہ چیتا بند تھا۔ سارا کمرہ برف کی بڑی بڑی سِلوں کے ذریعے ٹھنڈا کیا گیا تھا کیونکہ برفانی چیتا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے برفانی علاقوں میں پایا جاتا ہے اس لیے زیادہ گرمی برداشت نہیں کرتا۔ گرمی سے گھبراتا ہے۔ جس برفانی چیتے کو میں نے لاہور کے چڑیا گھر میں برف کی موٹی موٹی سِلوں پر بیٹھے ہوئے دیکھا، وہ بے چارہ بھی بعد میں مَر گیا۔''

''یُو مین ڈیڈ یعنی تمھارا مطلب ہے مر گیا؟'' مائیکل بڑبڑا کر بولا۔

''یَس سر۔ وہ برفانی چیتا ڈیڈ یعنی مَر گیا۔ برف پگھل گئی، کمرہ گرم ہو گیا اور برفانی چیتا ڈیڈ۔'' دلاور علی نے کہا۔

''ویری سیڈ۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔'' مائیکل منہ لٹکا کر بولا۔

میجر نُوری نے انگریزی میں پروفیسر سے مخاطب ہو کر کہا:

''آپ بات کر رہے تھے پروفیسر۔''

''اوہ یَس!'' پروفیسر کو جیسے خیال آ گیا کہ وہ کوئی اہم بات کر رہا تھا۔

''اڈر کالج میں ہم نے زُوآلوجی کا مضمون پڑھا اور ہمیں پتا چلا کہ اللہ میاں کی دُنیا میں قسم قسم کے جانور ہیں اور ان جانوروں میں ایک جانور اللہ میاں نے ایسا بنایا ہے جس میں عقل پایا جاتا ہے جو سب کا ہیڈ ہے یعنی سردار ہے۔ وہ جانور ہے انسان۔ انسان سوچتا ہے، بُرا بھی سوچتا ہے بھلا بھی سوچتا ہے پھر وہ اپنی عقل کے مافق کام کرتا ہے یعنی ہاتھ پیر مارتا ہے۔ جس انسان کا عقل اچھا ہے، اس کا سوچ اچھا ہے اس کا ایکشن اچھا ہے۔ گاڈ اس کو پسند کرتا ہے۔ مرنے کے بعد اسے پیراڈائیز ملتا ہے۔ تم کیا کہتا ہے پیراڈائیز کو؟'' پروفیسر الیگزنڈر نے دلاور علی سے پوچھا۔

''میں مسلمان ہوں اور مسلمان پیراڈائیز کو جنت سمجھتا ہے۔''

''اچھے انسان کو جنت ملتا ہے۔ اچھا انسان بنانے کے لیے مذاہب آیا اور ہر مذہب نے کہا کہ اچھا سوچو، اچھا کام کرو، تم کو جنت ملے گا۔ ٹھیک ہے نا؟'' پائپ بُجھ گیا تھا۔ پروفیسر نے پائپ کا تمباکو ٹھیک کیا۔ اسے آگ دِکھائی۔ سلگایا کش لیا اور دھوئیں چھوڑ کر بولا۔

''انسان کئی قسم کا ہوتا ہے۔ لمبا، چھوٹا، موٹا، پتلا، گورا، کالا۔ وہ پہاڑ پر رہتا ہے، جنگل میں رہتا ہے۔ ڈیزرٹ یعنی صحرا میں رہتا ہے۔ پانی کے نیچے رہتا ہے اور برف کے اوپر رہتا ہے۔ گاؤں میں رہتا ہے، شہر میں رہتا ہے۔ کوئی گھاس پات کھاتا ہے کوئی گوشت کھاتا ہے۔ کوئی مٹھائی کھاتا ہے۔ کوئی سانپ کھاتا ہے یعنی دنیا میں قسم قسم کا انسان رہتا ہے۔ ان میں سے ایک برفانی انسان ہے جس کو ہم دیکھنا مانگتا ہے۔ اسی کے لیے ہم اِڈر آیا ہے۔'' پروفیسر نے بات ختم کی۔ اس کا سانس اکھڑ چکا تھا اور سارا جسم ہِل رہا تھا۔

''پروفیسر صاحب، آپ نے پروفیسروں کی طرح انسان کی قسمیں بتا دیں لیکن برفانی انسان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔'' کیپٹن تنویر بولا۔ پروفیسر تھوڑی دیر کے لیے رُکا تھا پھر شروع ہو گیا۔

''ہاں کیپٹن صیب، تُم نے ٹھیک کہا۔ ہم نے برفانی انسان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ اصل بات یہ ہے کہ مجھ سے پہلے بڑے بڑے پروفیسروں نے برفانی انسان کے بارے میں کوئی پکی باٹ نہیں بتائی۔ کچھ باتیں ہیں جو سب ریسرچ سکالرز اور پروفیسرز نے مل کر بتائی ہیں یعنی جن پر سب کا اتفاق ہے۔''

''پلیز ہمیں وہ باتیں بتائیے۔'' دلاور علی کاغذ اور قلم سنبھال کر بیٹھ گیا۔

''ڈلاور علی، تُم جانتا ہے کہ برفانی انسان برف میں رہتا ہے۔ اگر وہ ریت میں رہتا تو اس کو ہم ریٹلا انسان بولتا۔ برف میں رہنے والا انسان برف میں اس لیے رہتا ہے کہ اسے برف پسند ہے۔ برف میں اس نے جنم لیا ہے۔ برف سے اسے محبت ہے، پیار ہے۔ لَو (Love) ہے۔ وہ برف کے اندر رہتا ہے اور برف کھاتا ہے لیکن برف پانی ہوتا ہے اس لیے جب برفانی انسان کا پیٹ بھوکا رہتا ہے تو وہ گھاس پات کھاتا ہے۔ جب گھاس پات کھانے کو نہیں ملتا تو وہ اِڈر اُڈر شکار کرنا مانگتا۔ وہ مارخور، برفانی چیتا، برفانی لومڑی، گیدڑ، ریچھ وغیرہ

پکڑتا اور کھاتا۔ جب شیر، چیتا، گیدڑ، لومڑی، بھیڑیا برف پڑنے سے بستیوں کو بھاگ جاتا تو برفانی انسان بستیوں کی ڈائیریکشن میں جاتا اور بھینس، گائے، بیل، گھوڑا، خچڑ، گدھا وغیرہ کو پکڑ کر مار ڈالتا اور کھا جاتا ہے۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی'' دلاور علی بول پڑا۔ ''عام انسان جب بھوکوں مرتا ہے تو اُونٹ، گائے، بیل، بکری، بکرا وغیرہ ذبح کر کے کھا جاتا ہے۔ اگر برفانی انسان ایسا کرتا ہے تو اچنبھے کی کیا بات ہوئی۔'' ٹیک ہے یہ ٹو کوئی باٹ نہ ہوئی'' پروفیسر نے کش لے کر کہا:

''اصل باٹ یہ ہے کہ اس کا قد دس بارہ فٹ ہوتا ہے اور وہ برف میں رہتا ہے اور شیر چیتے اور ریچھ سے بھی نہیں ڈرتا۔ ہم لوگ شیر چیتے اور ریچھ سے ڈرتا ہے۔''

''اب بات ہوئی نا۔''

دلاور علی بولا اور پھر کاپی پر کچھ لکھنے لگا۔

''کیا برفانی انسان سوچتا ہے؟'' میجر نوری نے پوچھا۔

''سکالرز کا خیال ہے کہ برفانی انسان سوچتا ہے۔ ویسے تو دوسرے جانور بھی سوچتے ہیں۔ بندر بہت سوچتا ہے۔ ہم نے ایسی فلمیں ڈیکھی ہیں جن میں بندر دوستی کرتے ہیں۔ پیار کرتے ہیں۔ شادی کرتے ہیں، غصے میں آتے ہیں۔ دشمن کو برا بھلا کہتے ہیں اُسے مارنا چاہتے ہیں۔ مارتے ہیں۔ مصیبت میں ساتھیوں اور دوستوں کے کام آتے ہیں۔ کوئی ان سے مہربانی سے پیش آئے تو جھک کر یا مصافحہ کر کے اس کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ میلوں ٹھیلوں میں بھیک مانگ کر اپنے مالکوں یا دوستوں کو دیتے ہیں۔ اسی طرح ہاتھی گھوڑے بھی سوچتے ہیں بس ان کا لیول ہے یعنی کسی جانور کی سوچ کا لیول نیچے ہوتا ہے۔ یعنی بندر کی سوچ کا لیول اونچا ہے اور گھوڑے کا لیول نیچا ہے۔ گھوڑا اس طرح نہیں سوچتا جس طرح بندر سوچتا ہے۔ اسی طرح برفانی انسان کی سوچ کا لیول نیچا یعنی اتنا اونچا نہیں ہے جتنا اونچا لیول عام انسان کا ہے۔ برفانی انسان یہ جانتا ہے کہ اسے دشمن سے کس طرح بچنا ہے خواہ یہ دشمن عام انسان ہو یا کوئی اور آفت۔ وہ بھوکا پیٹ بھرنا بھی جانتا ہے۔ وہ خوشی اور غمی کے جذبات سے بھی بخوبی آگاہ ہے۔ اس میں دوستی کا احساس بھی پایا جاتا ہے یعنی اسے معلوم ہے کہ یہ میری ماں ہے یہ میرا بچہ ہے یہ میری گھر والی ہے یعنی میری وائف ہے۔ آئی مین یعنی میرا مطلب یہ ہے کہ اس

میں تہذیب وتمدن موجود ہے لیکن یہ تہذیب اتنی اعلیٰ نہیں تہذیب کا لیول نیچے ہے۔'' پروفیسر کا پائپ پھر بجھ گیا تھا۔ وہ تمباکو ٹھیک کرنے لگا۔ ایک بار پھر اس کا سانس بول بول کرا کھڑ چکا تھا۔

''پروفیسر نے کوئی خاص بات نہیں بتائی'' میجر نوری بولا۔

''ہاں یہ باتیں تو ہم سب کو معلوم ہیں'' کیپٹن تنویر نے میجر سے اتفاق کیا۔

''پروفیسر! یہ بتاؤ کہ اگر برفانی انسان کو جان کا خطرہ ہو تو اس کا ردِعمل کیا ہو گا میرا مطلب ہے وہ خطرہ کا مقابلہ کس شدت سے کرے گا۔'' میجر نوری نے پوچھا۔

''میجر! تم نے بہت اچھا سوال کیا۔ برفانی انسان سے پیار کیا جائے تو وہ پیار کرتا ہے۔ یہ میں نہیں کہتا۔ بڑے بڑے ماہر کہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چونکہ برفانی انسان میں انسانیت موجود ہوتی ہے اور انسانیت کا تقاضہ ہے کہ پیار کا جواب پیار سے دیا جائے تو برفانی انسان پیار کا جواب پیار سے دے گا اور اس کی جان کو خطرہ ہو گا تو وہ دشمن کی جان لے لے گا۔ جو اسے مارنا چاہے گا وہ اُسے مار ڈالے گا۔''

''یہ بات بھی کوئی نئی بات نہیں ہے۔ عام انسان بھی پیار کا جواب پیار سے دیتے ہیں اور دشمنی کا جواب دشمنی سے یعنی اینٹ کا جواب پتھر سے دیتے ہیں۔'' میجر نوری نے کہا۔

''یہ بھی کوئی خاص بات نہیں۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔

''خاص بات صرف یہ ہے کہ اس کا قد دس بارہ فٹ ہوتا ہے وہ عام انسانوں کی نظروں سے اوجھل رہنا چاہتا ہے اور اس کا بسیرا برف زاروں میں ہوتا ہے۔'' میجر نوری بولا۔

''میں نے کہیں پڑھا تھا کہ برفانی انسان بلتستان، چترال، ہنزہ، لدّاخ، تبت، نیپال، روس اور چین کے جنوبی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ وہ علاقے ہیں جو پہاڑ، جنگل اور برف کے علاقے کہلاتے ہیں۔'' کیپٹن تنویر بولا۔

''یہ ٹیک باٹ ہے۔'' مائیکل نے کہا۔

''مزے کی بات یہ بھی ہے کہ جہاں کہیں برفانی انسان ہوتا ہے، وہیں برفانی چیتا پایا جاتا ہے۔ جن علاقوں کا میں نے نام لیا ہے، ان میں برفانی چیتا ملتا ہے۔'' کیپٹن بولا۔

''اگر آپ کی بات سچ مان لی جائے تو پھر کہنا پڑے گا کہ مری کے علاقہ میں برفانی انسان پایا جاتا ہے کیونکہ مری کے علاقہ میں برفانی چیتا پایا جاتا ہے۔'' دلاور علی نے کہا۔

''مری کے علاقہ میں برفانی موسم میں یعنی نومبر دسمبر یا جنوری میں برفانی چیتا پایا جاتا ہے۔ اس موسم میں برفانی انسان بھی بلتستان کی طرف سے آتا ہوگا مری کے علاقہ میں۔ البتہ کسی نے اسے دیکھا نہیں ہے۔ 1987ء کے موسم سرما میں اسلام آباد میں یہ برفانی چیتا گھومتا ہوا دیکھا گیا تھا۔'' میجر نوری بولا۔

''برفانی انسان کا راستہ بتائیے۔'' دلاور علی نے سوال کیا۔

''اگر آپ کا مطلب ہے کہ کس طرف سے آتا ہے تو سن لیجیے تبت سے لدّاخ، لدّاخ سے بلتستان، بلتستان سے آزاد کشمیر کی وادی گریز میں براستہ دیوسائی کا میدان۔ وادی گریز سے وادیٔ نیلم یعنی دریائے کشن گنگا کی وادی میں۔ وادی نیلم سے دریائے نیلم کے ساتھ ساتھ اور دریائے جہلم کے سنگم مظفر آباد سے ہوتے ہوئے مری کے علاقہ میں واپسی بھی اسی راستہ سے ہوسکتی ہے۔''

میجر نوری کی بات پر دلاور علی حیرت زدہ ہوکر رہ گیا اور بولا۔

''آپ کا مطلب ہے کہ سرد تاریک راتوں میں جب برف باری کا امکان ہوتا ہے، تبت، لدّاخ اور بلتستان کے برفانی انسان مظفر آباد کے راستہ مری کا رُخ اختیار کرتے ہیں؟''

''کیوں نہیں۔ ایسا ہوسکتا ہے۔'' میجر نوری نے ہنس کر کہا اور پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ جب اس نے مُڑ کر دیکھا تو سامنے دس بارہ سال کا لڑکا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ لڑکے کا نام ابراہیم تھا، عمر بارہ سال، رنگ گورا، سر کے بال لمبے لمبے جیسے اس نے سال بھر سے حجامت نہ بنوائی ہو۔ کپڑے گندے اور غلیظ تھے۔ غالباً یہ کپڑے لاہور کے لنڈا بازار سے ایک لمبا سفر طے کرکے سرمو گاؤں پہنچے تھے۔ اس کے پیروں میں گھاس کے بنے ہوئے چپل تھے۔ اس کی آنکھیں شربتی تھیں۔ ایسی آنکھیں صرف شہزادوں کی ہوسکتی ہیں۔ میجر نوری نے سوچا اور پھر دلاور علی سے پوچھا۔

''یہ لڑکا کون ہے؟''

''پتہ نہیں!'' دلاور علی نے مختصر جواب دیا۔

''صاحب جی! میرا نام ابراہیم ہے میں سرمو گاؤں کے چوکیدار عبدالخالق کا بیٹا ہوں۔ میں پوچھنے آیا تھا کہ آپ چائے پئیں گے۔ میں مائی جوہان کے ساتھ باورچی ہوں اور مجھے

سرمو کے نمبردار نے بھیجا ہے۔ وہ ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا۔

''تمھارا باپ کہاں ہے؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

''صاحب جی، اس کی طبیعت خراب ہے۔ وہ گھر پر ہے۔ میرا باپ بیمار ہو جائے تو اس کی جگہ میں چوکیدار کا کام کرتا ہوں۔ دن کو بھی اور رات کو بھی۔'' ابراہیم نے پھر جلدی جلدی جواب دیا۔

''بھئی ہم تو چائے پئیں گے۔'' میجر نوری بولا۔

ابراہیم ایک دم اُٹھا اور خیمے کی طرف بھاگا۔ پھر وہ تھوڑی دیر بعد تھرماس اور پیالے اٹھا کر آ گیا اور پیالوں میں چائے انڈیل کر سب کو دینے لگا۔

''تم بھی پیو گے۔'' میجر نوری نے ابراہیم سے کہا۔

''صاحب جی، میں آپ کے بعد بی بی کے ساتھ چائے پیوں گا۔'' چائے سے فارغ ہو کر وہ چل دیے۔

تیاری

پروفیسر الیگزنڈر کا شاگرد مائیکل جوان آدمی تھا۔ اس نے پروفیسر سے کہا کہ انہیں گولڈن ٹاور تک ضرور جانا چاہیے۔ حاجی احمد اور محمد علی پورٹر تھے۔ انہوں نے بھی یہی مشورہ دیا۔ وہ دونوں کام کرنے والے آدمی تھے اور جنگل میں بیٹھے بیٹھے لقمے توڑ توڑ کر تنگ آ چکے تھے۔ ان کے لیے اب وہاں کوئی کام نہ تھا۔ وہ بلندی کی طرف جانا چاہتے تھے کیونکہ وہ پیشہ ور پورٹر تھے۔ ایک اور بات بھی تھی اور وہ بات بہت دلچسپ اور سچی ہے۔ بات یہ ہے کہ بلتی پورٹر دُنیا کے بہادر ترین پورٹر ہیں۔ یعنی وہ سامان کمر، کندھوں اور سروں پر اٹھا کر جس طرح پہاڑ کی بلندی کی طرف چلتے ہیں کوئی دوسرا نہیں چل سکتا۔ نیپال لیفی اور کھٹمنڈو کے پورٹر جن کو شرپا کہا جاتا ہے۔ نمبر دو پورٹر ہیں۔ حاجی احمد اور محمد علی انگریزوں کو بتانا چاہتے تھے کہ وہ کتنے بڑے پورٹر ہیں؟ کتنے دلیر اور کتنے بہادر ہیں۔

گولڈن ٹاور پر جانے کے لیے جب اخبار نویس دلاور علی سے پوچھا گیا تو اس نے انکار کر دیا جانے سے۔ وہ بولا۔

''میں سکردو یا خپلو میں رہوں گا تاکہ مجھ تک مہم کی جو خبریں پہنچیں، وہ اپنے اخبار روزنامہ ''صدائے وطن'' راولپنڈی میں چھپواؤں تاکہ باہر کی دنیا کو معلوم ہو کہ کماؤنڈوز برفانی انسانوں کو پکڑنے کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں۔''

دلاور علی نے یہ بھی کہا کہ وہ ان سب کی ڈاک ان تک پہنچائے گا جو مہم پر ہوں گے۔ اور اگر ضرورت پڑی تو وہ اعلیٰ سرکاری افسروں سے مل کر دواؤں اور ہیلی کاپٹر کا انتظام بھی کرے گا۔

جوہان نے بھی جانے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ بروق پا کی زندگی سے مایوس ہوگئی ہے اور واپس خپلو جانا چاہتی ہے۔

دلاور نے دونوں انگریزوں سے مل کر جوہان کی تنخواہ کا حساب کیا اور اسے ایک ہزار روپے کی رقم دلوائی۔ ایک ہزار روپے کے علاوہ گوروں نے جوہان کو پانسو روپے انعام کے طور پر دیئے۔ اسے ایک ڈبہ چائے، ایک ٹین گھی اور دو کلو چینی بھی دی۔ جو گرم کپڑے اسے پہننے کے لیے دیئے گئے تھے، وہ بھی اسے دے دیئے۔ ایک کمبل بھی دیا تاکہ راستہ میں سردی سے بچاؤ ہو سکے۔ پہاڑی جنگل کے ایک مقام پر ویگنوں اور جیپوں کا راستہ تھا جو سکسہ اور پیون کی طرف سے آتا تھا اور خپلو سے ہوتا ہوا سکردو جاتا تھا۔ ابراہیم جوہان کو لے کر اس راستہ پر آیا۔ انہوں نے تھوڑی دیر انتظار کیا پھر ایک جیپ آ گئی جس میں اس نے جوہان کو سوار کروا دیا اور خود واپس پیدل چل کر جنگل میں آ گیا۔ جوہان کی ڈیوٹی اب ابراہیم نے سنبھال لی۔ ڈیوٹی کیا تھی؟ آگ جلانا۔ آٹا گوندھنا، روٹی پکانا، چائے تیار کرنا۔

پاکستان میں بلتستان ایک ایسا علاقہ ہے جہاں لڑکے بالے ہانڈی اور روٹی پکانا جانتے ہیں۔ وہ بہت اچھے باورچی اور خانساماں ثابت ہوتے ہیں۔ یہ خوبی ابراہیم میں بھی تھی۔ اس نے اپنی تنخواہ طے نہ کی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ انگریزوں کے پاس وافر پیسے ہیں اور وہ کنجوس نہیں ہوتے۔

رات بڑے خیمے میں جو پروفیسر الیگزنڈر کا تھا، منصوبہ بندی کی میٹنگ ہوئی۔ اس میٹنگ میں پروفیسر الیگزنڈر، مائیکل، دلاور علی، محمد علی، ابراہیم اور حاجی احمد کے علاوہ میجر نوری اور کیپٹن تنویر نے شرکت کی۔ میٹنگ میں سب سے زیادہ گفتگو میجر نوری اور کیپٹن تنویر نے کی۔

''میرا خیال ہے کہ یتی گولڈن ٹاور کے امریا میں مل جائیں گے۔ اب تک جو لوگ ہمیں ملے ہیں، ان سب نے یہ کہا ہے کہ گولڈن ٹاور کے امریا میں برفانی انسان اس موسم میں بسیرا کرتے ہیں اور جب گرمیوں کا موسم شروع ہوتا ہے تو وہ گونگے دریا کے راستے سے کے۔ٹو اور سیاچن گلیشئر کی طرف نکل جاتے ہیں۔ پھر وہ وہاں سے لدّاخ کی نوبرا وادی کے ساتھ درہ قراقرم کا رُخ کرتے ہیں اور چینی علاقہ میں چلے جاتے ہیں۔ یہی راستہ ان کی واپسی کا ہے۔'' میجر نوری نے میٹنگ کو بتایا۔

''کیا برفانی انسانوں کا ایک ہی گروہ بلتستان میں گھومتا پھرتا ہے؟'' مائیکل نے سوال کیا۔

''مجھے معلوم نہیں کہ بلتستان میں برفانی انسانوں کا ایک ہی خاندان ہے یا کئی خاندان ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اگر کئی خاندان ہیں تو وہ ایک ہی جگہ رہتے ہیں یا مختلف مقامات

پر قیام کرتے ہیں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ بلتستان میں ایک ہی خاندان ہے برفانی انسانوں کا۔ یہ وہی خاندان ہے جو برفوق پا کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔'' میجر نوری نے کہا۔

''کیا خیال ہے برفوق پا اب تک زندہ ہوگا؟'' پورٹر حاجی احمد نے پوچھا۔

''کہاں زندہ ہوگا۔ اسے تو برفانی انسان چٹ کر گئے ہوں گے۔ وہ تو گھوڑے ہاتھی کھا جاتے ہیں۔'' دوسرے پورٹر محمد علی نے حاجی احمد کو جواب دیا۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر ہم گولڈن ٹاور کیا کرنے جا رہے ہیں؟'' حاجی احمد بولا۔

''اُڈر ہم یٹی کو پکڑنا مانگٹا ہے۔'' پروفیسر الیگزنڈر نے کہا۔

''کہیں یہ نہ ہو کہ اُلٹا وہ ہمیں پکڑ لیں۔'' دلاور علی بولا۔

''اُڈر یہ بھی ہوسکٹا ہے۔'' پروفیسر بولا۔

''اگر یہ بات ہے تو پھر جانے کا کیا فائدہ؟ کیوں ہم اپنی جان جوکھوں میں ڈالیں۔ گھر والے ہمارا انتظار کریں اور یتی ہمیں ہڑپ کر چکے ہوں۔'' دلاور علی گھبرا کر بولا۔

''جو ساتھی ہمارے ساتھ گولڈن ٹاور نہیں جانا چاہتے، وہ خوشی سے نہ جائیں۔ میں اور کیپٹن تنویر تو پکا ارادہ کر چکے ہیں کہ گولڈن ٹاور کے ایریا کی ریکی کریں گے۔'' میجر بولا۔ لفظ ریکی دلاور کی سمجھ میں نہ آیا تو اس نے پوچھا۔

''یہ ریکی کیا ہوتی ہے جی؟''

''ریکی انگریزی لفظ ہے۔ مطلب ہے چھان بین۔ تلاش و جستجو۔ دشمن کا پتہ لگانا۔ یہ فوجی لفظ ہے۔'' میجر نے دلاور علی کو بتایا۔

''ٹھیک ہے جی۔ آپ ضرور ریکی کریں۔ میں تو نہیں جاؤں گا۔'' دلاور علی جلدی سے بولا۔

''میں جاؤں گا۔'' ابراہیم جواب تک خاموش تھا، جلدی سے بول اُٹھا۔

''بے وقوف، نادان۔ تیری اتنی زیادہ عمر نہیں ہے۔ میں نہیں جانا چاہتا تو کیوں جاتا ہے؟'' دلاور علی نے ابراہیم کو ڈانٹا۔

''میں اپنے صاحبوں کی خدمت کروں گا۔ ان کے لیے آگ جلاؤں گا، چائے تیار کروں گا۔'' ابراہیم جوش میں آ کر بولا۔

''جوش نہ دکھاؤ۔ ہوش دکھاؤ۔ وہ تو کماٹڈو ہیں۔ بہادر ہیں۔ تم تو بچے ہو۔ تجھے تو

پستول چلانا بھی نہیں آتا۔'' دلاور علی نے سختی سے کہا۔

''میں پستول چلانا سیکھ لوں گا۔ کیوں صاحب آپ مجھے پستول چلانا سکھلائیں گے؟'' ابراہیم کے لہجہ میں التجا تھی۔

''کیوں نہیں ہم اپنے بچڑے کو پستول، ریوالور اور گرینیڈ چلانا سکھائیں گے۔'' میجر نوری نے پیار سے ابراہیم کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ''ہم دلیر اور بہادر بچوں کی قدر کرتے ہیں۔''

''میجر صاحب کا بیٹا بھی تیری عمر کا ہے ابراہیم۔'' کیپٹن نے بتایا۔

''اچھا جی!'' ابراہیم کے لہجہ میں خوشی بھی تھی اور حیرت بھی۔

میٹنگ برخاست ہوئی تو میجر نُوری اور کیپٹن تنویر ابراہیم کے ساتھ اپنے خیمے میں آ گئے۔ کیپٹن تنویر، ابراہیم کو ریوالور اور پستول کے کل پرزے سمجھانے لگا۔ یہ ابراہیم کا پہلا سبق تھا، اسلحہ استعمال کرنے کا۔

ڈبل نمونیہ

پارٹی گولڈن ٹاور کی حد میں داخل ہوئی اور بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بنیادی کیمپ قائم کیا۔ پروفیسر الیگزنڈر تھک کر چُور ہو چکا تھا۔ مائیکل کا بھی بُرا حال تھا۔ البتہ کماغڈوز اور دو پورٹرز ان کی نسبت زیادہ تھکّے ہوئے نہیں تھے۔ تین خیمے نصب کیے گئے۔ ایک گوروں کے لیے، ایک کماغڈوز کے لیے اور ایک قُلیوں کے لیے۔ قُلیوں نے تیل سے جلنے والے چولھے پر قہوہ تیار کیا اور اس کے بعد کھانا۔ قہوہ پی کر اور کھانا کھا کر ان کی جان میں جان آئی۔ دوپہر کے بعد کماغڈوز نے ادھر اُدھر سکی اننگ کی اور شام کو واپس آ گئے۔ شام کو موسم خراب ہوا لیکن پھر ٹھیک ہو گیا۔ البتہ ساری رات گولڈن ٹاور کی طرف سے برف کے تودے گرنے کی آواز مسلسل آتی رہی۔ پارٹی کے ساتھ ارکان تھے۔ انہوں نے رات ایک ایک گھنٹے تک جاگ کر پہرہ دیا۔ اس پارٹی کا انچارج میجر نُوری تھا اور سیکنڈ ان کماغڈ کیپٹن تنویر۔

رات وہ سلیپنگ بیگوں میں سوئے تھے۔ اس لیے سردی کی کسی نے شکایت نہ کی، سوائے پروفیسر کے۔ وہ شاید اس لیے کہ وہ بوڑھا آدمی تھا اور آرام طلب بھی۔ دن کو دھوپ تاپ کر وہ بھی چاق و چوبند ہو گیا۔ سب نے مل کر ناشتہ کیا۔ پورٹر محمد علی اور حاجی احمد نے مکھن کے ساتھ باسی روٹی کے ٹکڑے کھائے۔ یہ بلتی روٹی تھی۔ گول اور موٹی۔ انگریزوں نے ڈبل روٹی کے سلائس، جام اور مکھن۔ کماغڈوز نے ہنٹر بیف، پورٹرز نے چائے اور باقی سب نے کافی پی۔ ناشتہ کے بعد وہ گولڈن ٹاور کی طرف چل پڑے۔ ان کی رفتار سُست تھی کیونکہ برفانی لکیر کے بعد ہر طرف برف ہی برف تھی۔ برفانی لکیر اس فرضی لکیر کو کہا جاتا ہے جس کے اُوپر درخت اور جھاڑیاں نہیں ہو پاتے کیونکہ سردی زیادہ ہوتی ہے۔ دوپہر کو دو گھنٹے سستانے اور کھانا کھانے کے بعد وہ پھر چل پڑے اور شام پانچ بجے انہوں نے سترہ ہزار فٹ

کی بلندی پر پہلا کیمپ لگایا۔ گزشتہ رات کی طرح انہوں نے یہاں بھی تین خیمے نصب کیے اور کھانا کھانے کے بعد لیٹ گئے۔ پہرے کا انتظام بھی وہی تھا جو کل رات تھا۔

گولڈن ٹاور دُھند میں چُھپا ہوا تھا اور دُھند سے اوپر بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔ برف کے تودے گرنے کی مسلسل آوازیں آ رہی تھیں موسم خراب ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ہلکی ہلکی برف باری شروع ہو گئی اور پھر ہوا چلنے لگی۔ خطرہ تھا کہ کہیں بلزرڈ یعنی برف کا طوفان شروع نہ ہو جائے۔

جب کیپٹن تنویر گارڈ ڈیوٹی پر تھا تو اس نے ''ہیلو ہیلو'' کی آواز سُنی جو گوروں کے تنبو سے آ رہی تھی۔ وہ خیمہ کے اندر گیا تو دیکھا کہ پروفیسر الیگزنڈر بے ہوش پڑا ہے اور لمبے لمبے سانس لے رہا ہے۔ پہاڑوں پر بلندی کی وجہ سے تھکاوٹ بہت ہوتی ہے اور تھکاوٹ کی وجہ سے نیند بھی بہت آتی ہے، بعض اوقات یہ نیند موت بن جاتی ہے۔

''کیا بات ہے مسٹر مائیکل۔ پروفیسر کو کیا ہوا ہے؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

''پروفیسر صاحب کو نمونیہ ہو گیا ہے۔'' مائیکل نے انگریزی میں اس کا جواب دیا۔

''اگر نمونیہ ہے تو دوائی دو۔'' کیپٹن نے مشورہ دیا۔

''دوائی دی ہے لیکن علاج نہیں ہو گا۔'' وہ بولا۔

''علاج کیوں نہیں ہو گا؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''ایک تو پروفیسر بوڑھا بہت ہے، دوسرے سردی بہت ہے اور تیسرے نمونیہ ڈبل ہے۔'' مائیکل نے بتایا۔

''تو بتاؤ کیا کیا جائے؟''

''پروفیسر صاحب کو نیچے لے جانا چاہئے۔'' مائیکل نے تجویز پیش کی۔

''آل رائیٹ!'' کیپٹن تنویر نے کہا اور حاجی احمد اور محمد علی کو جگا کر لے آیا۔ اب وہ دونوں پروفیسر کی تیمارداری کرنے لگے اور کیپٹن تنویر اور مسٹر مائیکل صبح کا انتظار کرنے لگے۔

جوں توں کر کے صبح ہوئی۔ مائیکل کا بھی بُرا حال تھا۔ سردی بھی تھی اور پھر اسے ساری رات جاگنا پڑا۔ اسے پروفیسر کی بھی زیادہ فکر تھی۔ البتہ کیپٹن تنویر چاق و چوبند تھا جیسے رات بھر جاگنے کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا ہو۔ جیسے وہ رات جاگنے کا عادی ہو۔

پروفیسر الیگزنڈر کو اب ہوش آ گیا تھا لیکن کمزوری بہت زیادہ تھی۔ اسے اب بھی نمونیہ تھا۔ ظاہر ہے اتنی بلندی پر تسلی بخش علاج کا تصور بھی ممکن نہیں تھا۔ سولہ سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر مؤثر دوا دارو کہاں .....؟ ڈاکٹر بھی ساتھ نہ تھا۔ محمد علی، حاجی احمد اور مائیکل اپنے طور پر اوڈ پوڈ کر رہے تھے یعنی اٹکل پچو علاج کر رہے تھے۔ میجر نُوری نے تمام حالات کا جائزہ لیا اور حکم دیا کہ دونوں قلی یعنی پورٹر پروفیسر الیگزنڈر کو باری باری اپنی کمر پر بوری کی طرح اٹھا کر واپس لے چلیں اور خپلو کے سرکاری ہسپتال میں اس کا علاج کروائیں۔ مسٹر مائیکل بعد میں خپلو آ جائے گا۔

لیکن مسٹر مائیکل نے گولڈن ٹاور پر جانے سے انکار کر دیا۔ وہ بھی چڑھائی اور سردی سے ڈر گیا تھا۔ اس کے علاوہ وہ پروفیسر الیگزنڈر کو اکیلا چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ بھی اس دن محمد علی اور حاجی احمد کے ساتھ پروفیسر کو لے کر خپلو کی طرف روانہ ہو گیا۔

میجر نے ابراہیم سے کہا کہ وہ بھی قُلیوں اور مائیکل کے ساتھ واپس چلا جائے لیکن اس نے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ کیپٹن تنویر نے بھی زور دے کر اسے کہا کہ وہ واپس گاؤں چلا جائے لیکن اس نے نہایت ادب سے کہا کہ وہ نہیں جائے گا۔

''کیوں نہیں جائے گا؟'' کیپٹن نے ابراہیم سے پوچھا۔

''بس صاحب! آپ کے ساتھ رہے گا۔ خدمت کرے گا۔ اگر میرا باپ بیمار نہ ہوتا تو وہ آپ کے ساتھ ہوتا۔ اب وہ بیمار ہے تو ہمارا ڈیوٹی ہے کہ آپ جناب کا ساتھ دے۔'' میجر اور کیپٹن یہ جواب سُن کر بہت خوش ہوئے اور اسے شاباش دیتے ہوئے کہا:

''ہمیں تمھارے جذبے کی قدر ہے لیکن حالات خراب بھی ہو سکتے ہیں۔'' میجر بولا۔

''صاحب! پرواہ نہیں، حالات اچھے ہوں یا خراب، پھر بھی میں آپ کے ساتھ رہوں گا۔ آپ کے ساتھ جیئوں گا اور آپ کے ساتھ مروں گا۔''

ابراہیم نے ایک بہادر پہاڑی لڑکے کی حیثیت سے جواب دیا۔ ''ہم تو سیانے ہیں، مرد ہیں۔ تم تو بچے ہو۔'' کیپٹن بولا۔

''صاحب! آپ مرد ہیں تو میں مرد کا بچہ ہوں۔'' وہ دلیری سے بولا۔

''شاباش!'' میجر نُوری خوش ہو کر بولا۔

''بہادر بچے اسی طرح سوچتے ہیں۔'' کیپٹن تنویر نے کہا اور اسے گلے لگا لیا۔

''ابراہیم تم اسی خیمے میں بیٹھو۔ ہم دونوں جا رہے ہیں ریکی کے لیے، یعنی اِدھر اُدھر دیکھ بھال کرنے کے لیے جا رہے ہیں۔ ہم سورج ڈوبنے سے پہلے آ جائیں گے۔ اگر دیر ہو جائے تو گھبرانا مت۔ ہم ضرور آئیں گے۔ سردی محسوس ہو تو چائے بنا کر پینا۔'' میجر نُوری نے ہدایات دیں۔

''جی بہتر۔ میں یہیں رہوں گا۔ کہیں نہیں جاؤں گا۔'' ابراہیم بولا۔

''تو ریوالور کی لبلبی دبا سکتا ہے۔ ریوالور وہ پڑا ہے۔ اگر برفانی چیتا یا برفانی ریچھ آئے تو لبلبی دبا کر فائر کرنا۔'' کیپٹن نے کہا۔

''ٹھیک ہے جی۔'' ابراہیم خوشی سے بولا۔ اسے ریوالور چلانے کی اجازت مل گئی تھی اور ریوالور چلانا اس کی سب سے بڑی خواہش تھی۔

میجر نوری اور کیپٹن تنویر نے برف پر چلنے والے بوٹ پہنے۔ اپنے اپنے ہتھیار زیب تن کیے۔ سکی اسٹک کی چھڑیاں اٹھائیں اور خیمے سے باہر آ گئے۔

برفانی گنبد

کیمپ نمبر ایک کا ایریا سکی انگ کے لیے زیادہ مناسب اور موزوں نہیں تھا کیونکہ ہر طرف برف کے چھوٹے بڑے قلعے کھڑے تھے۔ کہیں کہیں ٹیالی اور کہیں کہیں دودھیا چٹانیں تھیں جو بڑے برفانی پہاڑ کا حصہ تھیں۔ ان چٹانوں کے درمیان گھاٹیاں تھیں جن پر برف ہی کے پُل بنے ہوئے تھے۔ یہ پُل ٹوٹتے پھوٹتے رہتے تھے۔ پھر برف کی آبشاریں تھیں جو پہاڑ سے لٹک رہی تھیں بعض اوقات دس گز کا فاصلہ طے کرنے کے لیے بیس گز کا چکر لگانا پڑتا۔ کئی جگہ ان کو رسّوں کی مدد سے پہاڑ پر چڑھنا اور اُترنا پڑا۔

گولڈن ٹاور، سُرموٹاپ اور علاقہ چھورمبٹ کے درمیان تھا۔ وہ دونوں برفانی انسان کو گولڈن ٹاور کے اردگرد پھیلے ہوئے برف زار میں تلاش کرتے رہے۔ جب شام ہوئی تو وہ اپنے کیمپ سے کافی دُور تھے۔ راستہ کٹا پھٹا اور خطرناک تھا۔ سارا دن گھومنے سے وہ بے حد تھک چکے تھے۔ آخر وہ انسان تھے، مشین تو نہ تھے۔ رات دبے پاؤں آ رہی تھی۔ مایوسی کی بات یہ تھی کہ ان کو برفانی انسان کا کوئی کھوج نہ ملا تھا۔ آخر انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ رات ایک پہاڑی غار میں بسر کریں گے۔

ٹارچ کی روشنی میں انہوں نے غار کو دیکھا۔ غار خالی تھا۔ البتہ اس میں کئی جگہ ہڈیاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ ہڈیاں گھوڑے اور یاک کی تھیں۔ اس بات کا ثبوت گھوڑے اور یاک کے بالوں سے بھی ملا تھا۔

''گھوڑے اور یاک کا شکار کون کر سکتا ہے اتنی بلندی پر کیپٹن؟'' میجر نے پُوچھا۔

''برفانی چیتا، انسان اور برفانی انسان۔'' کیپٹن بولا۔

''برفانی چیتا مارخور کا شکار خوشی سے کرتا ہے۔ مارخور نہ ملے تو آبادی کا رُخ کرتا ہے۔

سترہ اٹھارہ ہزار بلندی کا رُخ نہیں کرتا۔ انسان کو گھوڑا یا یاک مارنے سے کیا فائدہ؟ اب اگر اس بلندی پر ہم گھوڑا یا یاک مار ڈالیں تو کیا فائدہ؟ یعنی ہم کیوں ماریں؟'' میجر نے پُوچھا۔

''آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ یہ کارروائی برفانی انسان کی ہے۔'' کیپٹن نے کہا۔

''جی ہاں۔ میرا یہی خیال ہے۔'' میجر بولا۔

''یہ تو بہت اچھا ہے۔ آج رات ہم عام انسان، برفانی انسان کے مہمان ہوں گے۔'' کیپٹن خوش ہو کر بولا۔

''آپ برین گن، گرینیڈ، ریوالور اور پستول اور خنجر لے کر پہرہ دیجیے، ہم تو لگے سونے، تھک کر چُور ہو گیا ہوں۔ چار گھنٹے بعد جگا دینا۔ میں پہرہ دوں گا۔'' کیپٹن سے میجر نوری نے کہا۔

کیپٹن تنویر پہرہ دینے لگا اور میجر نُوری سو گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسم خراب ہو گیا۔ تیز ہوا چلی، برف باری شروع ہوئی۔ تیز ہوا جھکڑ میں تبدیل ہوئی اور برف باری شدت اختیار کر گئی۔ ہوا اور برف کا طوفان زور شور سے آ گیا تھا۔ کیپٹن تنویر کے دیکھتے دیکھتے غار کے منہ کے سامنے برف کا پہاڑ کھڑا ہو گیا اور باہر نکلنے کا راستہ بند۔

اس نے میجر کو جگایا۔ رات کا ایک بج رہا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

''برف سے راستہ بند ہو گیا ہے۔'' کیپٹن بولا۔

''معلوم نہیں برف کب پگھلے گی۔'' میجر نوری نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

''اللہ ہی جانتا ہے۔'' کیپٹن نے جواب دیا۔

اُن دونوں نے محسوس کیا کہ وہ برفانی غار میں بند ہیں۔ درحقیقت وہ برف کے گنبد میں قید ہو گئے تھے۔ ہزاروں من وزنی برف کا تودہ غار کا منہ پوری طرح بند کر چکا تھا۔ ان دونوں کے اردگرد سیاہ تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

موت

کیپٹن تنویر نے ننھی مُنی ٹارچ جلائی جو وہ ساتھ لایا تھا اور اس کی پتلون کی جیب میں تھی جو اس کی دائیں ٹانگ کے ساتھ تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں برف چمکنے لگی اور برف کی یہ چمک دمک روشنی کو دوبالا کرنے لگی۔ ٹارچ کی روشنی سے برف کی سفیدی عکس ریز تھی، جس سے محسوس ہوتا تھا کہ روشنی ڈبل ہوگئی ہے اور غار کے اندر کئی بلب روشن ہو گئے ہیں۔

وہ دونوں باہر نکلنے کا راستہ تلاش کرنے لگے لیکن راستہ کوئی نہ تھا۔ باہر برف و باراں کا طوفان امڈ رہا تھا لیکن برفانی غار کے اندر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ یہ خاموشی قبرستان کا سناٹا محسوس ہوتی تھی۔

''راستہ کوئی نہیں ہے۔ ہزاروں لاکھوں من برف نے اس غار کا راستہ روک لیا ہے۔'' کیپٹن تنویر بولا۔

''کچھ بھی ہو ہمیں گھبرانا نہیں ہے۔'' میجر بولا۔

''درست کہا آپ نے، اگر گھبرا گئے تو مارے گئے۔'' کیپٹن بولا۔

''جب سورج طلوع ہوگا تو برف پگھل جائے گی اور ہمیں راستہ مِل جائے گا۔'' میجر نے تسلی دی۔ خود کو بھی اور کیپٹن کو بھی۔

''ہمیں خطروں سے مقابلہ کرنے کی ٹریننگ دی گئی ہے اور پھر یہ اتنا بڑا خطرہ بھی نہیں ہے۔'' کیپٹن نے حوصلہ سے کہا۔

''ہمارے کھانے پینے کی چیزیں تو نہیں ہیں۔'' میجر بولا۔

''پینے کے لیے تو برف بہت ہے۔ اسے چُوس لیں گے، پانی کا مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن ہمارے کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے۔'' کیپٹن بولا۔

''ہاں میں سمجھتا ہوں۔ ہمیں تو واپس جانا تھا۔ اگر رات ٹھہرنے کا پروگرام ہوتا تو کچھ ساتھ لاتے۔'' میجر یہ کہہ کر سوچ میں گم ہوگیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ بولا۔

''کیپٹن۔ ممکن ہے بلزرڈ دو دن رہے۔''

''عین ممکن ہے۔ بعض اوقات تین دن تک رہتا ہے۔'' کیپٹن بولا۔ وہ جغرافیہ کا ماہر تھا۔

''ہم بھوک سے نہیں مریں گے۔'' میجر نے کہا۔

''یقیناً ہم سردی سے مریں گے اگر مرے تو۔'' کیپٹن عام انداز میں بات کر رہا تھا۔ جیسے لوگ نمک، دال، مرچ کا ذکر کرتے ہیں۔

''بھوک سے کیوں نہیں مریں گے؟'' میجر نے پوچھا۔

''اس لیے کہ ہمارے پاس برف کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ ہم برف کھاتے رہیں گے۔ البتہ برف کھانے اور برف کے اندر رہنے سے نمونیہ ہوسکتا ہے۔''

''اور نمونیہ ڈبل نمونیہ میں بدل کر ہمارے پھیپھڑوں کو ناکارہ بنا سکتا ہے جس سے موت واقع ہوسکتی ہے۔''

''سر۔ آپ نے ٹھیک کہا۔'' کیپٹن بولا۔

وہ دیر تک آپس میں باتیں کرتے رہے۔ جب باتوں سے ان کا جی اُکتا گیا تو وہ چُپ ہو گئے اور پھر برف پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگے لیکن نیند کہاں؟ سردی آہستہ آہستہ ان کے فولادی جسموں کو متاثر کر رہی تھی۔

ان کے پاس کھانے کو نہ بیف تھا نہ چاکلیٹ، نہ چنے نہ بسکٹ۔ برف کھانے سے سردی میں شدت آ رہی تھی۔ ان کے جسم کا درجہ حرارت آہستہ آہستہ گرنے لگا۔ اب ان دونوں نے باتیں ختم کر دی تھیں۔ وہ خدا اور اس کے رسول ﷺ کو یاد کر رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا، ان کے جسم کی توانائی کم ہونے لگی۔ اڑتالیس گھنٹوں کے دوران میں وہ ڈبل نمونیہ کا شکار ہو گئے اور کمزوری کی وجہ سے ان پر غنیم بے ہوشی چھا گئی۔ پھر یہ غنیم بے ہوشی پوری بے ہوشی میں بدل گئی اور انہوں نے آنکھوں کے اشاروں سے ایک دوسرے کو الوداع کہا۔ ساٹھ گھنٹوں کے دوران میں وہ دونوں پوری طرح بے ہوش ہو چکے تھے۔ اب موت صرف چند گھنٹے دور تھی۔

اگر وہ عام انسان ہوتے تو کبھی کے مر چکے ہوتے لیکن وہ کمانڈوز تھے اور موت کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال سکتے تھے۔ انہیں زندگی سے پیار تھا لیکن وہ موت سے خوف زدہ نہ تھے۔ وہ سچے مسلمان تھے اس لیے وہ مردانہ وار اپنی جانیں خدا کے سپرد کر رہے تھے۔

کیپٹن تنویر کو مرنے سے پہلے ابراہیم کا خیال آیا جو خیمے میں اکیلا تھا۔ تاہم اسے یہ حوصلہ سا ہوا کہ اس کے پاس گولیوں سے بھرا ریوالور تھا اور وہ لبلبی دبا کر برفانی چیتے یا برفانی ریچھ پر فائر کر سکتا تھا۔

میجر نوری کو اپنی خوبصورت بیوی اور پیارے پیارے بچوں کا خیال آیا۔ یہ اس کے ذہن میں آنے والا آخری خیال تھا۔ اس کے بعد آنکھوں آنکھوں میں اشارے ہوئے اور وہ موت کی وادی میں اُتر گئے۔

واپسی

سب سے پہلے کیپٹن تنویر کو زندگی کا احساس ہوا۔ آہستہ آہستہ زندگی اس کے جسم میں داخل ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن ذہن بند نہ تھا۔ ذہن کی طرف سے اشارہ ہو رہا تھا کہ زندگی دبے پاؤں اس کے جسم میں داخل ہو رہی ہے۔ گرما گرم کافی اس کے رگ و ریشہ کو گرم کر رہی تھی اور اس کے حواس درست ہو رہے تھے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میجر نوری کی تھی۔ جس طرح سے وہ دونوں نیم بے ہوشی اور پوری بے ہوشی کے راستہ سے موت کی وادی میں داخل ہوئے تھے، اسی طرح وہ واپس آ رہے تھے زندگی کے چمن میں۔

کافی اور دھوپ نے ان کے جسموں میں طاقت بھر دی۔ نمونیہ کی گولیاں خیمے میں موجود تھیں۔ ابراہیم نے وہ کافی میں گھول کر ان کو پلائی تھیں۔ وہ دونوں ایک گھنٹے کے اندر اندر ہوش میں آ گئے تھے۔ ابراہیم نے ہنٹر بیف کے ریزے ان کو کھانے کو دیے۔ چاکلیٹ بھی ان دونوں نے کھایا تھا۔ میٹھے اور نمکین بسکٹ بھی موجود تھے۔ تاپنے کے لیے آگ بھی تھی۔ ابراہیم نے ان دونوں کا نرس کی طرح خیال رکھا اور ڈاکٹر کی طرح علاج کیا تھا۔

''ہمیں کون لایا یہاں؟'' میجر نوری نے پوچھا۔

''جناب صاحب، آپ کو یہ آدمی لایا ہے یہاں؟''

''کون ہے یہ آدمی؟'' میجر نوری نے پھر پوچھا۔

''برفانی انسان ہے لیکن ذرا چھوٹا ہے۔ اس کے دو ساتھی جن کے قد بڑے ہیں، وہ کچھ دُور دھوپ میں کھیل رہے ہیں۔'' ابراہیم نے انہیں بتایا۔

''اس برفانی انسان کا قد تو چھوٹا ہے۔'' کیپٹن بولا۔

''یہ بونا برفانی انسان ہو گا۔'' میجر نے کہا۔

''اس برفانی انسان کا قد پورا ہے یا یہ بونا ہے، کچھ بھی ہو یہ ہمارا مُحسن ہے۔ اس نے ہمیں زندگی دی ہے۔'' کیپٹن نے کہا۔

''آپ دونوں کو ان برفانی انسانوں نے مولیوں کی طرح کندھوں پر اٹھایا ہوا تھا اور یہ بونا برفانی انسان ان دونوں کے آگے آگے چل رہا تھا۔'' ابراہیم نے بتایا۔

میجر اور کیپٹن اُٹھ کر بیٹھ گئے۔

''اسے بھی ہنٹر بیف اور کافی دو ابراہیم۔'' میجر نے کہا۔

ابراہیم نے ہنٹر بیف کا ایک پیس اور کافی کا ایک مگ اسے دیا۔ وہ عام انسانوں کی طرح بیف کھانے لگا اور کافی پینے لگا۔

''اس کی داڑھی سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بونا برفانی انسان خاصا بوڑھا ہے۔ داڑھی سفید ہو رہی ہے۔'' کیپٹن بولا۔

''مجھے تو یہ عام انسان لگتا ہے۔'' میجر نے کہا۔

''عام انسان تو ہم ہیں جو برف کے غار میں مردہ حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ اگر یہ عام انسان ہوتا تو برفانی انسان اس کا کہا کیوں مانتے.....؟ اس کو چٹ کر جاتے۔ یہ برفانی انسان ہے۔ بس ذرا قد چھوٹا رہ گیا ہے۔'' کیپٹن بولا۔

''یہ تو میری طرح آپ دونوں کا جسم باری باری دباتا تھا۔'' ابراہیم بولا۔

''اگر یہ بات ہے تو اس سے پوچھ لیں کہ یہ کون ہے۔'' میجر نے کیپٹن تنویر سے کہا۔

''تم کون ہو؟ کیا تم بھی برفانی انسان ہو؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

''جی میں برفانی انسان نہیں ہوں۔ میں عام انسان ہوں۔ میرا نام بروق پا ہے اور میں خپلو کا لکڑ ہارا ہوں۔ برفانی انسان مجھے اس جنگل میں سے اُس وقت اٹھا کر لے گئے تھے جب میں بے ہوش پڑا تھا۔'' بروق پا مسلسل بول رہا تھا۔

''ٹھہرو۔ کیا تم جوہان کے خاوند ہو۔'' میجر نوری نے کہا۔

''جی جناب۔ میں جوہان کا خاوند ہوں۔ وہ کہاں ہے؟'' بروق پا نے اشتیاق سے پوچھا۔

''پتہ نہیں وہ کہاں ہے، اس وقت۔ تم یہ بتاؤ کہ اب تم برفانی انسانوں کے ساتھ جانا پسند کرو گے؟ وہ لوگ تمھارا انتظار کر رہے ہیں۔'' میجر نے بروق پا سے پوچھا۔

''نہیں صاحب، میں ان کے ساتھ ہرگز نہیں جانا چاہتا۔ یہ تو وحشی لوگ ہیں۔ ناراض ہو گئے تو مجھے کچا چبا جائیں گے۔'' وہ گھبرا کر بولا۔

''کیا تجھے ان لوگوں کی زبان آتی ہے؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''جی جناب! میں ان کی زبان جانتا ہوں۔ ان کی زبان میں صرف پندرہ سولہ لفظ ہیں جو میں نے یاد کر لیے ہیں۔'' اس نے بتایا۔

''اچھا کیا تم نے ان کی زبان سیکھ لی، اب جلدی سے یہ بتاؤ کہ ان دو برفانی انسانوں کا کیا کیا جائے۔'' میجر بولا۔

''تم ان سے کہو کہ تم ان کے ساتھ نہیں جانا چاہتے۔ تم اپنے گھر جانا چاہتے ہو۔'' میجر نے مشورہ دیا۔

''جناب صاحب جی۔ ان کو میرے گھر کا کیا پتہ۔ وہ تو اپنا گھر ہی میرا گھر سمجھتے ہیں اور مجھے اپنا بیٹا یا بھتیجا خیال کرتے ہیں۔'' بروق پا بولا۔

''تو پھر کیا کیا جائے؟'' کیپٹن بولا۔

''ان پر فائر کھول دیا جائے؟'' میجر نے پوچھا۔

''تم سے اس لیے پوچھ رہے ہیں کہ تم ان کے رشتہ دار ہو۔'' کیپٹن بولا۔

''جناب صاحب جی، میں نہیں چاہتا کہ آپ ان کو قتل کر دیں۔'' بروق پا روہانسی آواز میں بولا۔

''تم کیوں نہیں چاہتے کہ ان کو ہلاک کیا جائے؟'' کیپٹن نے سوال کیا۔

''جی وہ بات یہ ہے کہ انہوں نے مجھے ہلاک نہیں کیا۔ مجھے کھلونا سمجھ کر میرے ساتھ کھیلتے رہے اور میری حفاظت کرتے رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے کہنے پر یہ دونوں آپ دونوں کو اٹھا کر برف میں سے چلتے ہوئے یہاں تک لائے اور یوں آپ دونوں کی جان بچ گئی۔''

''تمھاری بات تو معقول ہے لیکن ہم سوچ رہے ہیں کہ برفانی انسان کو پکڑا جائے۔'' کیپٹن بولا۔

''نہ! صاحب جی، انہوں نے ہم سے اچھا سلوک کیا تھا۔ اس لیے ان دونوں کی جان بھی بچ جانی چاہیے۔'' بروق پا بولا۔

''تم ان سے کہو کہ وہ چلے جائیں۔'' کیپٹن نے بروق پا سے کہا۔

''مجھے پتہ ہے وہ نہیں جائیں گے۔'' بروق پا نے یقین سے کہا۔

''تجھے کیسے معلوم ہے کہ وہ نہیں جائیں گے؟'' میجر نے پوچھا۔

''جب ہم چلے تھے آپ دونوں کو اٹھا کر تو ان کے سردار نے کہا تھا کہ کھلونا بھاگنے نہ پائے۔ مجھے وہ کھلونا کہتے ہیں۔'' بروق پا بولا۔

''وہ ہمیں کیوں چھوڑنے آئے تھے؟ میرا مطلب ہے کہ انہوں نے ہماری جان کیوں نہ لی۔'' کیپٹن بولا۔

''صاحب جی۔ آپ دونوں میں جان کہاں تھی آپ تو ٹھنڈے یخ تھے۔ میں نے نبض دیکھی تو جان گیا کہ آپ ابھی زندہ ہیں۔ اس لیے سوچا کہ آپ کو کسی آبادی تک پہنچا دوں تاکہ آپ کا علاج ہو۔ آپ کو لحاف ملے۔ آپ یخنی پئیں اور بھلے چنگے ہو جائیں۔ کیونکہ برفانی انسانوں میں ڈاکٹر نہیں ہوتے، ان کے پاس لحاف بھی نہیں ہوتے اور وہ یخنی بنا کر نہیں پیتے۔''

''اگر وہ بیمار ہو جائیں تو کیا کرتے ہیں؟'' میجر نے پوچھا۔

''میں نے تو ان کو بیماری کی حالت میں کبھی دیکھا ہی نہیں۔''

''ظاہر ہے وہ بیمار نہیں ہوتے اس لیے علاج کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' میجر سوچ کر بولا۔

کیپٹن نے محسوس کیا کہ دونوں برفانی انسان گھورتے ہوئے ان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس نے ریوالور نکالا اور فائر کیا فائر کی آواز کے ساتھ ہی بروق پا نے شور مچانا شروع کیا اور زور زور سے چلایا۔ ''دگوش دگوش۔'' میجر نے بھی اپنے ریوالور سے تین فائر کیے۔ تابڑ توڑ گولیاں چلیں اور ساتھ ہی بروق پا نے شور مچایا۔ ''دگوش، دگوش'' تو دونوں برفانی انسان برف کی چٹان کی اوٹ میں چھپ گئے۔

''شکر ہے اللہ تیرا ان کی جان بچ گئی۔'' بروق پا یہ کہہ کر سجدہ میں گر گیا۔ جب وہ سجدے سے اٹھا تو خوشی سے اس کا چہرہ چمک اٹھا۔

''جب میں نے فائر کیا تو تُو نے اتنا شور وغل کیوں مچایا؟'' کیپٹن تنویر نے بروق پا سے پوچھا۔

''صاحب جی! میں اِن کی زبان میں اُن سے کہہ رہا تھا کہ بھاگ جاؤ، دوڑ جاؤ۔

دگوش، دگوش یعنی بھاگو۔ دوڑو۔''

''ہمیں یہ بتاؤ کہ تم نے ہمیں غار سے کیسے نکالا؟ کیپٹن نے پوچھا۔

''جناب صاحب جی، برفانی انسان سیر اور شکار کے لیے گئے ہوئے تھے، اس لیے غار خالی تھا۔ آپ اس میں گھس گئے۔ پھر برف باری ہوئی اور طوفان آیا اور غار کا منہ برف سے بند ہو گیا۔ جب تین چار دن کے بعد برفانی انسان اس غار کی طرف آئے تو اس کا منہ بند تھا انہوں نے برف ہٹائی تو اندر آپ مردہ حالت میں تھے۔ میں نے ان کی منّت کی اور آپ دونوں کو یہاں تک اُٹھوا کر لایا۔'' بروق پا نے بتایا۔

''بہت بہت شکریہ۔'' میجر بولا۔

''شکریہ کی بات نہیں۔ چلو چلیں۔ برفانی انسان پلٹ کر حملہ نہ کر دیں۔'' اور وہ چاروں سُرموگاؤں کی طرف چل دیے۔

.....

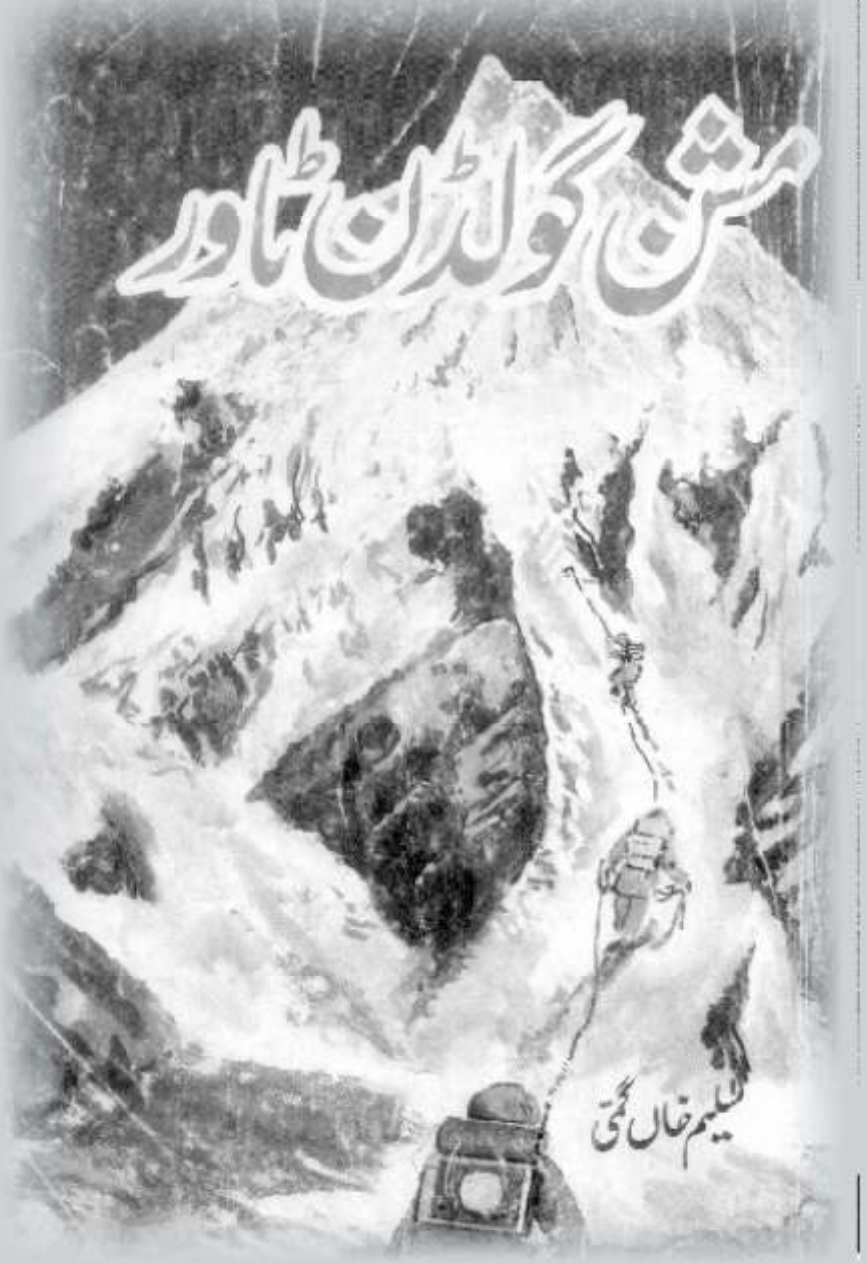

مشن گولڈن ٹاور
سلیم خاں گمی

دُشمن

پروفیسر الیگزنڈر کی ٹیم برفانی انسان کو پکڑنے کا بہانہ بنا کر ایک صبح روانہ ہوئی۔ اصل مقصد گولڈن ٹاور کا خزانہ حاصل کرنا تھا۔ اُدھر کرنل دھنی رام اور اُس کے گوریلے خزانہ کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ دونوں کے راستے الگ تھے البتہ منزل ایک تھی..... گولڈن ٹاور کا خزانہ۔ پروفیسر کی ٹیم کے بھی دو مقصد تھے..... ایک خزانے کا حصول اور دوسرے برفانی انسان کی عادات کا مطالعہ بشرطیکہ برفانی انسان کہیں مل جاتے تو کرنل دھنی رام کے ذہن میں بھی دو مقصد تھے ایک پاکستان دشمنی اور دوسرے خزانہ کا لالچ۔ پروفیسر کی ٹیم کا گائیڈ سلطان تھا جب کہ کرنل دھنی رام اپنی ٹیم کا گائیڈ خود تھا۔ پروفیسر اپنے ساتھ دس قلی بھی لایا جو غار میں سامان چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

پروفیسر اور اس کے ساتھی پہلے دن چھ گھنٹے سفر کرنے کے بعد صرف دس میل سفر کر سکے اور انہوں نے شام کو ایک چھوٹے گلیشیر پر خیمے گاڑھ دیئے۔ دوسرے اور تیسرے دن بھی انہوں نے دس دس میل کا فاصلہ طے کیا البتہ سفر دونوں دن سات سات گھنٹے کرنا پڑا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ اب تھکاوٹ کا اثر ہونے لگا تھا اور پھر پروفیسر ذرا بوڑھا بھی تھا۔ چوتھے دن سفر کے دوران انہوں نے نالہ بڑی مشکل سے عبور کیا اور رات گذارنے کے لیے غار میں پناہ لی۔ اِس غار میں میجر نوری، کیپٹن تنویر، بروق پا، سلطان اور ابراہیم ایک طوفانی رات گذار چکے تھے۔

یہاں پہنچ کر پروفیسر کو پہلے کھانسی کی شکایت پیدا ہوئی اور پھر نمونیہ ہو گیا۔ دوائیاں وہ ساتھ لائے تھے اِس لیے پروفیسر کا علاج شروع ہوا۔ دوسرے دن وہ کہیں نہ جا سکے۔ البتہ سلطان اور ابراہیم نے باہر گھوم پھر کر علاقے کا جائزہ لیا۔

چاروں طرف چٹانیں اور پہاڑ تھے جو برف سے ڈھکے ہوئے تھے۔ ان پہاڑوں کے درمیان بڑے گلیشیر تھے اور کہیں کہیں نالے تھے جن میں برف جمی ہوئی تھی۔ اگر برف کو توڑ دیا جاتا تو نیچے سے پانی نکلتا۔ لیکن یہ پانی اتنا سرد تھا کہ ایک سیکنڈ میں ہاتھ پیر سُن ہو گئے۔

لڑکے بالے پالتو جانوروں سے بہت پیار کرتے تھے۔ یہی حال ابراہیم کا تھا۔ اُسے اپنے پالتو چیتے کے بچے سے بے حد پیار تھا۔ چیتے کا بچہ اسی غار سے اُس سے الگ ہوا تھا۔ برفانی انسان نے اُسے اٹھا کر غار سے باہر طوفان میں پھینک دیا تھا۔ ابراہیم کا دل کہتا تھا کہ وہ مرا نہیں ہو گا کیونکہ بلی کی طرح چیتے کا بچہ بھی سخت جان ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ آدھی رات کے بعد اپنے سلیپنگ بیگ سے نکلا۔ کمبل کی بکل ماری اور ریوالور ہاتھ میں لے کر غار کے منہ میں آ کر بیٹھ گیا۔ چاند مشرق سے طلوع ہو رہا تھا اور نالے کی برف سے چاند کی کرنیں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں۔ ہر طرف سکوت چھایا ہوا تھا البتہ کبھی کبھی دور سے برف گرنے کی آواز آتی۔ یہ برف کی آبشار کی آواز تھی جسے پروفیسر آئس فال کہتا تھا۔

وہ غار کے منہ میں کچھ دیر بیٹھا چاندنی اور برف کی آنکھ مچولی کا نظارہ کرتا رہا۔ پھر اُٹھ کر نیچے آیا اور نالہ کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ریوالور لوڈ کیا ہوا تھا اور اُس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا اُس کا پالتو بچہ اُسے مل جائے تو مزہ آ جائے۔ اُسے خطرہ تھا کہیں اسے برفانی انسان نہ دبوچ لیں۔ اِس خیال سے وہ واپس پلٹنے والا تھا کہ نالہ کے بائیں کنارے پر بھاری بوٹوں کی آواز نے اُسے چوکنا کر دیا۔

اُس نے دیکھا نالہ کے بائیں کنارے پر پانچ چھ آدمی آہستہ آہستہ چلے آ رہے ہیں اِن کے کندھوں پر بوجھ ہے اور سروں پر بھاری ٹوپیاں ہیں۔ وہ سب خاموش تھے۔

ابراہیم نے اندازہ لگایا کہ وہ فوجی ہیں کیوں کہ اُن کا حلیہ فوجیوں کا سا تھا۔ جب وہ چلتے ہوئے اُس کی نگاہ کے سامنے آئے تو پیچھے سے آواز آئی:

''سر، یہاں سے نالہ پار کریں۔ یہاں پانی کم ہے۔''

ابراہیم نے کوشش کی کہ وہ لہجہ پہچان سکے لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ جو شخص سب سے آگے تھا وہ بولا۔

''دھیان سنگھ۔ چیک کرو برف نرم ہے یا سخت۔''

ایک فوجی آگے بڑھا اور برف پر چلنے لگا۔ کچھ دور تک چلنے کے بعد وہ پلٹ گیا اور بولا۔

''سر۔ برف سخت ہے۔''

جو شخص سب سے آگے تھا اور جس نے آرڈر دیا تھا وہ پھر بولا:

''مکھن سنگھ۔ چلو تم پہل کرو'' اور مکھن سنگھ نالہ میں سے چل پڑا۔ اُس کا رُخ ابراہیم کی طرف تھا۔ وہ اب جان گیا تھا کہ وہ سکھ فوجی ہیں چنانچہ وہ ایک بڑے پتھر کے ساتھ لگ کر پتھر ہو گیا۔ اب تین فوجی نالہ عبور کر رہے تھے اور دو کھڑے تھے۔ لیڈر نے پھر حکم دیا تھا:

''کرپا سنگھ، دیری نہ کرو۔ جلدی کرو، بہت جلد، روشنی ہونے والی ہے۔''

کرپا سنگھ نے جواب دیا ''چلتا ہوں سر! میں ذرا بوجھ ٹھیک کر رہا تھا۔''

دھیان سنگھ، مکھن سنگھ، کرپا سنگھ۔ ابراہیم کے ذہن میں سکھوں کے نام گونجنے لگے۔ اب چوتھا اور پانچواں فوجی کھڑا تھا۔

''تو کھڑا کیا سوچ رہا ہے دلدّر سنگھ، تم بھی چلو سوہن سنگھ جلدی کرو۔'' حکم پر دلدّر سنگھ بھی چل پڑا اور سوہن سنگھ بھی۔ جب دلدّر سنگھ نے نالے کی برف پر پاؤں رکھا تو لیڈر بھی پیچھے پیچھے چل پڑا۔

وہ اب سب قطار میں چل رہے تھے۔ دھیان سنگھ، مکھن سنگھ، کرپا سنگھ، دلدّر سنگھ اور سوہن سنگھ، سنگل فائل یعنی ایک کے پیچھے ایک۔ یہ سب کچھ ڈسپلن کے مطابق تھا۔ وہ سیدھے اِس پتھر کی طرف آ رہے تھے جس کی اوٹ میں ابراہیم چھپا بیٹھا تھا۔

وہ مجھے دیکھ لیں گے اور پھر پکڑ کر گولی مار دیں گے۔ کیوں نہ میں پہل کروں اور گولی چلا کر کم از کم ایک کی جان لے لوں۔ یہ سارے سکھ ہیں اور بلا اجازت پاکستان میں آ گئے ہیں۔ اُسے میجر نوری اور کیپٹن تنویر یاد آ گئے۔ کاش اِس کے ساتھ میجر نوری اور کیپٹن تنویر ہوتے اور پھر وہ تینوں مل کر اِن چھ فوجیوں کو بھون ڈالتے۔

''مجھے وہ سامنے روشنی دکھائی دے رہی ہے'' مکھن سنگھ نے غار کی طرف اشارہ کیا۔

''اپنے ہتھیار سنبھال لو اور احتیاط سے آگے بڑھو'' اُسی بارُعب آواز نے پھر حکم دیا۔

سبھی فوجی ریوالور اور پستول لوڈ کرنے لگے اور پھر اِن سب نے اِن کو ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

''میں آگے چلتا ہوں میرے پیچھے پیچھے آؤ'' کرنل دھنی رام نے کہا اور سب سے آگے آ گیا۔

''روشنی تو مجھے دکھائی دیتی ہے ہو سکتا ہو وہم ہو۔ بہرحال احتیاط ضروری ہے۔'' وہی آواز پھر آئی۔

اب لیڈر آگے آگے تھا اور وہ پانچواں اِس کے پیچھے۔ ابراہیم نے سوچا گولی چلاؤں لیکن اُس کے ذہن کے گوشہ سے آواز آئی۔ نہیں نہیں۔ گولی مت چلانا۔ ایک مرے گا اور پانچ بچ جائیں گے کوئی ایسی ترکیب ہونی چاہیے کہ یہ سبھی ختم ہوں۔

اب وہ سب احتیاط سے چلتے ہوئے غار کے قریب پہنچ گئے۔ وہ جھکے ہوئے تھے جیسے حملہ کر رہے ہوں۔ ان کے کندھوں پر بوجھ تھا اِس لیے وہ کُبڑے قلی دکھائی دے رہے تھے۔ پھر ٹارچ کی روشنی سے غار کا منہ روشن ہو گیا۔

''سر! یہ تو کوہ پیما یا مسافر دکھائی دیتے ہیں'' مکھن سنگھ نے کہا۔

''میرے خیال میں کوہ پیما ہیں۔'' لیڈر بولا

''اِن کا کیا کیا جائے؟'' مکھن سنگھ نے پوچھا

''کرنا کیا ہے پوچھ گچھ کے بعد گولی مار دیں گے۔'' لیڈر نے کہا اور پھر لپک کر غار کے اندر چلا گیا۔ اِس کے ساتھی بھی اس کے ساتھ تھے۔ غار کے اندر ہلچل مچ گئی جس میں ہینڈز اپ کے الفاظ بھی تھے۔

ابراہیم پلٹا اور نالے کے دائیں کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگنے لگا۔ دو فرلانگ کے بعد بڑی مشکل سے نالے کی دیوار پر چڑھا اور نالہ سے نکل کر گلیشیر پر آیا۔ پھر وہ اُس راستہ پر دوڑنے لگا جو اُس نے پہلے بھی تین بار دیکھا تھا اور جو سیدھا اُس کے گاؤں کو جاتا تھا۔

وہ بھاگ رہا تھا۔ برف پر سے پتھروں میں۔ روڑوں پر اُسے سردی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ ڈر سے کوسوں دور تھا۔ غصے کا طوفان اس کے حواس پر دھوئیں کی طرح چھا گیا۔ اُسے غصہ یہ تھا کہ دشمن فوجی اُس کے وطن میں بُرے ارادے سے آ گئے ہیں کیا تدبیر ہو کہ وہ پکڑے جائیں۔

وہ بچ نکلا

اُس نے بھاگتے بھاگتے سوچا کہ اُسے سکھ فوجیوں پر فائر کرنا چاہیے تاکہ ایک تو مر جاتا۔ اِس کے ذہن کے دوسرے گوشے سے آواز آئی۔

''اِس سے کیا ہوتا باقی پانچ تو زندہ رہتے۔ ایک مر جاتا اور باقی پانچ تجھے مار دیتے۔ حساب برابر۔ فائدہ کیا ہوتا البتہ تو مر جاتا بلاوجہ!!

''یہ بات نہیں'' ایک دوسری آواز نے کہا جو دراصل پہلی آواز تھی اور جو بھاگتے بھاگتے سب سے پہلے اُس کے ذہن سے اُٹھی تھی۔

''یہ بات نہیں۔ اگر میں مر جاتا تو ملک، قوم اور اسلام پر قربان ہو جاتا۔ پاکستان پر قربان ہو جاتا۔''

''تیری قربانی کا فائدہ نہ تجھے ہوتا نہ ملک کو نہ قوم کو اور نہ اسلام کو۔ قربانی ضائع ہو جاتی۔'' ذہن کی دوسری آواز نے بلند ہو کر اُسے کہا۔

''قربانی کبھی ضائع نہیں۔ خاص طور پر اپنے وطن پر قربان ہونا فخر کی بات ہے۔''

''بلاوجہ موت کے منہ میں جانا اور مر جانا فخر کی بات کیسے ہو سکتی ہے۔ ہاں بیوقوفی کی بات ضرور ہو گی، تو نے اچھا کیا، بیوقوفی نہیں کی، گولی نہیں چلائی۔ گولی چلا دیتا تو زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ ایک دشمن فوجی مر جاتا یا زخمی ہو جاتا البتہ تو جان سے ہاتھ دھو لیتا۔''

''جان۔ جان۔ جان'' پہلی آواز میں غصہ تھا، ''جان وطن اور قوم پر قربان کرنے کے لیے ہوتی ہے جب ملک اور قوم کو ضرورت پڑے، جان دینے سے گریز بزدلوں کا کام ہے۔''

''آپ کی بات سے انکار کون کرتا ہے؟ انکار تو اِس بات کا کیا جا رہا ہے کہ بلاضرورت

جان دینا بے وقوفی ہے اسے قربانی نہیں کہا جاتا۔ اگر تم اب گلیشیر پر سے چھلانگ لگا کر نالے میں کود جاؤ اور گر کر مر جاؤ تو یہ قربانی نہیں ہے، احمقانہ پن ہے۔ دشمن کو جان دینے کی نسبت دشمن کی جان لینا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ تم نے اچھا کیا کہ بلاوجہ جان نہیں دی۔ دشمن کی جان لینے کے لیے اپنے گاؤں جا رہے ہو تاکہ نمبردار کو بتاؤ اور وہ کوئی مدبیر لڑائے۔

ابراہیم کے اندر کی آوازیں جو دراصل ضمیر کی آوازیں تھیں، بند ہو گئیں اور بے فکر ہو کر اور تیز دوڑنے لگا۔ وہ پہاڑی لڑکا تھا اِس لیے پہاڑوں، چٹانوں اور برف میں سے دوڑنے کا عادی تھا۔ وہ گزشتہ دس سال سے پہاڑوں اور چٹانوں پر چڑھتا بھی رہا تھا۔ وہ نالوں اور دریاؤں میں سے بھی گذرتا رہا تھا۔ گرمیوں میں دریاؤں اور ندی نالوں کا پانی بہت ہی تیز ہوتا ہے کیونکہ پہاڑی علاقوں میں بہنے والے ندی نالے اور دریا کا بہاؤ ڈھلوان کی وجہ سے بیحد تیز ہوتا ہے اور اِس میں سے چلنا کافی دشوار ہوتا ہے۔ بعض اوقات پانی اتنا زیادہ اور اتنا تیز ہوتا ہے کہ دریا پار کرنا ناممکن ہوتا ہے اور زکھ کے ذریعے دریا پار کیا جاتا ہے۔

زکھ کیا ہوتا ہے؟ زکھ ایک کشتی ہوتی ہے جس کے ذریعے بلتستان میں دریا عبور کرتے ہیں۔ گائے اور بیل کی کھال کو اچھی طرح سی کر اِس میں ہوا بھر دی جاتی ہے۔ ایسی گول مٹول کئی کھالوں کو ساتھ ساتھ جوڑ دیا جاتا ہے بلکہ باندھ دیا جاتا ہے۔ اِن کھالوں کے اوپر بیٹھنے کے لیے جگہ بنا دی جاتی ہے۔ ملاح لمبے بانس کے لیے سواریوں کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے اور پھر کھیون ہار بن کر بانس کے ذریعے پانی کے اندر ٹیک لگا کر آہستہ آہستہ زکھ کو دوسرے کنارے لے جاتا ہے۔ اگر آپ چلو جائیں تو آپ کو گرمیوں کے موسم میں زکھ کے ذریعے ملاح کھیون ہار دریائے شیوق کے پار لے جائیں گے۔ سردیوں میں اِس دریا کو پار کرنا مشکل نہیں کیونکہ دریا میں پانی کم ہوتا ہے اور اِس پر شہتیر ڈال دیئے جاتے ہیں اور لوگ اسے پار کرتے ہیں۔ سردیوں میں پانی کم کیوں ہوتا ہے؟ اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ سردیوں میں اوپر پہاڑوں پر برف جم جاتی ہے گرمیوں میں برف پگھل کر پانی بنتی ہے اور دریائے شیوق کے ذریعے یہ پانی دریائے سندھ میں گرتا ہے اور دریائے سندھ سمندر میں۔

بات کہاں سے کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔ بات تو ابراہیم کی ہو رہی تھی، وہاں سے یہ بات زکھ اور دریائے شیوق پر آ گئی۔ بہرحال ابراہیم دوڑ رہا تھا اور مسلسل دوڑ رہا تھا۔

نمبردار سے ملاقات

ابراہیم دوڑ رہا تھا اور اب اُسے دوڑتے ہوئے سات گھنٹے ہو گئے تھے۔ وہ صبح پانچ بجے بھاگا اور اب دن کے بارہ بج رہے تھے۔ اُس کے پیر دُکھنے لگے تھے اور ٹخنے اور گھٹنے درد کی وجہ سے بلبلا اُٹھے تھے۔ پنڈلیوں کا برا حال تھا اُن میں سے ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ پھیپھڑے دُھونکنی کی طرح چل رہے تھے۔ اُس کا سر چکرا رہا تھا اور آنکھوں کے سامنے تارے ٹمٹما رہے تھے۔ آخر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ ٹھہر جائے۔ وہ ایک چٹان کی طرف گیا اور اِس کی اوٹ میں اپنا کمبل سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا اُسے فوراً نیند آ گئی۔

جب وہ سو کر اُٹھا تو شام کے پانچ بجے کا وقت ہو گا۔ وہ پھر دوڑنے لگا۔ اِس کا جسم معمول کے مطابق کام کر رہا تھا۔ تھکاوٹ دور ہو گئی تھی اور ایک بار پھر وہ تازہ دم تھا۔ لیکن کب تک دوڑتا۔ بھوک، پیاس اور تھکاوٹ کا اثر ظاہر ہونے لگا اور وہ دوڑنے کی بجائے عام رفتار سے چلنے لگا۔ وہ ساری رات چلتا رہا اور جب صبح ہوئی تو ایک پتھر کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور پھر نیند نے اس پر غلبہ پا لیا۔

جب اُس کی آنکھ کھلی دن کے گیارہ بج رہے تھے۔ وہ پھر چل پڑا۔ وہ شام کو بھوک، پیاس اور تھکاوٹ سے نڈھال لڑکھڑاتا ہوا نمبردار کی بیٹھک میں داخل ہوا اور فرش پر لیٹ گیا۔

''ابراہیم، کیا ہوا؟'' نمبردار نے گھبرا کر پوچھا۔ وہ اُس پر جھک گیا اور اُس کا ماتھا سہلانے لگا۔ پھر اُس نے گھڑے میں سے پانی لے کر اُس کے منہ میں ٹپکایا۔ اسی اثناء میں گاؤں کا ایک لڑکا بیٹھک میں آیا تو نمبردار نے اُسے ہدایت کی:

''میرے گھر جاؤ اور چائے بنوا کر لاؤ اور ہاں چوکیدار عبدالخالق کو بھی بلا کر لاؤ۔'' لڑکا نمبردار کا حکم پا کر بھاگ اُٹھا۔

چائے آئی لیکن چائے سے پہلے عبدالخالق آ گیا۔ ابراہیم کا والد۔ تب تک ابراہیم فرش پر سے اُٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

''باقی لوگ کہاں ہیں؟'' نمبردار اور عبدالخالق نے بیک زبان پوچھا۔ ابراہیم نے ساری بات اُن کو سنا دی۔

دونوں کے منہ لٹک گئے۔ اِن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔ آخر نمبردار نے فیصلہ کیا کہ وہ خپلو جا کر ڈی ایس پی صاحب کو بتائے گا۔

''ممکن ہے وہ انڈیا کے لوگ نہ ہوں۔'' عبدالخالق نے کہا۔

''ابا میں خود اِن کے نام سُنے ہیں مکھن سنگھ، دلدّر سنگھ''

''ممکن ہے وہ انڈیا کے لوگ ہوں لیکن فوجی نہ ہوں۔ کوہ پیما ہوں'' نمبردار نے کہا۔

''اُن کا لباس فوجیوں جیسا تھا وہ اپنے سردار کو سر کہہ کر پکار رہے تھے۔'' ابراہیم بولا۔

''یہ تو کوئی ثبوت نہ ہوا کہ وہ فوجی ہیں پھر رات کا معاملہ تھا۔ رات کو بھلا کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ یہ فوجی ہیں یا کوہ پیما ہیں یا عام لوگ۔'' چوکیدار نے کہا۔

ابراہیم خاموش رہا تو نمبر بولا۔

ہوسکتا ہے وہ ڈاکو ہوں اور انہوں نے جان بوجھ کا نام بدل لیے ہوں۔ پولیس تفتیش کرے اور کچھ پتہ نہ چلے مجھ پر حرف آ جائے۔ افسر لوگ پوچھیں کہ تم نے غلط اطلاع کیوں دی۔

''نمبردار صاحب نے سیانی بات کی ہے'' چوکیدار بولا۔

''ابا مجھے پتہ نہیں کہ وہ فوجی ہیں یا کوہ پیما ہیں یا ڈاکو لٹیرے ہیں۔ ہاں مجھے یہ معلوم ہے کہ گوروں کی، سلطان کی اور بروق پا کی زندگی خطرے میں ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہیں اُن کو چھوڑیں گے نہیں، جان سے مار ڈالیں گے۔''

جس لڑکے کو نمبردار نے پہلے حکم دیا تھا وہ روٹی لے آیا۔ ساگ اور چپاتی۔ نمبردار نے پیالے میں پانی بھر کر ابراہیم کے پاس رکھ دیا۔ ابراہیم روٹی کھانے لگا تو نمبردار نے اُسے تسلی دی۔

''فکر نہ کرو تم۔ پیٹ بھر کر کھانا کھاؤ۔ انشاء اللہ کوئی نہ کوئی بندوبست ہو جائے گا۔''

''ایسا نہ ہو وہ ریچھ کے انسان ہوں۔'' ابراہیم نے لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا؟ ریچھ کے انسان؟ تو بیوقوف ہو گیا ہے کیا؟ ریچھ کے انسان بھی کبھی ہوتے ہیں۔'' ابراہیم کا والد چوکیدار عبدالخالق طنزاً ہنسنے لگا۔

''ابا مجھے سر نے بتایا تھا کہ ریچھ کے انسان بھی ہوتے ہیں۔'' ابراہیم بولا:

''سر کیا تمہارے سر نے بتایا تھا؟ سب کو سر ہی بتاتا ہے۔ پیر تو کوئی بات بتاتے نہیں ہیں۔ کیا بیوقوفوں والی باتیں کر رہا ہے تو۔ شاید تیرا دماغ چل گیا ہے میرا خیال ہے تجھ پہ سردی کا اثر ہو گیا ہے'' چوکیدار بولا۔

''ہوسکتا ہے۔ ایسا ہوسکتا ہے۔ سردی سے سر شام ہو جاتا ہے اور بندہ الول غلول بکنے لگتا ہے۔ سر نے بتایا ہے۔ بھائی! سب کو سر ہی بتاتا ہے کیونکہ باتیں سر کے اندر سوچ میں آتی ہیں۔'' نمبردار عقلمند بن کر بتانے لگا۔

ابراہیم نے پانی پیا اور بولا۔

''سر سے میری مراد یہ والا سر نہیں ہے۔'' ابراہیم نے سر کو چھو کر کہا ''سر سے میرا مطلب انگریزی والا سر ہے۔''

''بے وقوف کہیں کا۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتا کہ تجھے گورے نے یہ کہا کہ ریچھ کے انسان ہوتے ہیں۔ میں انگریز کو عقلمند سمجھتا تھا لیکن یہ تو نرے بیوقوف ہیں۔ کہتے ہیں ریچھ کے انسان ہوتے ہیں۔'' عبدالخالق ناراض ہو کر بولا۔ ناراضگی اب انگریزوں سے تھی کہ وہ بیوقوفی کی باتیں کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کی شہرت یہ ہے کہ وہ عقلمند ہوتے ہیں۔

''ابا۔ میں کیپٹن تنویر کو سر کہتا ہوں۔ انگریزی زبان میں جناب کو سر کہتے ہیں۔'' ابراہیم جھنجھلا کر بولا اور پھر کھانا کھانے میں مشغول ہو گیا۔

''اب سمجھا انگریز جب بڑے آدمی کو پکارتے ہیں تو سر کہتے ہیں۔ سر کا مطلب تو پھر یہ ہوا کہ جناب عالی'' نمبردار بولا۔ چوکیدار خاموش رہا۔ اسے احساس ہوا کہ وہ ان پڑھ ہے اور اُس کا بیٹا اُس سے زیادہ لائق ہے۔

ابراہیم نے کھانا کھانے کے بعد برتن پرے دھکیل دیئے۔

''نمبردار جی! آپ کی بڑی مہربانی۔ اب ہم گھر چلتے ہیں۔ ابراہیم کی ماں اور بہنیں اُس

کا انتظار کر رہی ہوں گی۔'' چوکیدار نے کہا اور فرش پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ابا۔ جب تک بروق پا، سلطان اور گوروں کا انتظام نہیں ہو جاتا میں گھر نہیں جاؤں گا۔'' ابراہیم نے کہا۔

''بے وقوف نہ بنو۔ انتظام تو نمبردار جی کریں گے۔ اُن کو تو نے بتا دیا ہے۔ خود اُن کا اپنا بیٹا دشمن کے گھیرے میں ہے۔ وہ اُس کے لیے انتظام کریں گے تو سب کے لیے انتظام ہو جائے گا۔ گھر چلو۔ چلو اُٹھو۔'' ابراہیم بیٹھا رہا۔

''تو گھر جا ابراہیم۔ میں چلو جاتا ہوں اور ڈی ایس پی صاحب بہادر سے ملتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' نمبردار نے اُسے تسلی دی اور ابراہیم اپنے باپ کے ساتھ نمبردار کی بیٹھک سے باہر آ گیا۔

نمبردار نے جھوٹ بولا

نمبردار نے اپنی بیٹھک کو تالا لگایا اور سڑک پر آ گیا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ شام رات میں تبدیل ہوگئی تھی اور جنگلی جانوروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اُسے رات کو سفر کرنا تھا اور یہ خطرہ سے خالی نہ تھا۔ اُس نے سوچا وہ سفر ملتوی کر دے لیکن دس بارہ گھنٹے ضائع ہو جائیں گے اور جو لوگ مصیبت میں گرفتار ہیں، اُن کی مصیبت اور بڑھ سکتی ہے پھر سلطان بھی اِن لوگوں میں شامل تھا جن کے سروں پر بقول ابراہیم موت منڈلا رہی تھی۔ اُس نے سوچا وہ چوکیدار کو ساتھ لے لے۔ دو آدمیوں کا سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے۔

وہ سڑک پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ دُور سے جیپ کی بتیاں روشنی بکھیرتی نظر آئیں۔ وہ بہت خوش ہوا۔ جب جیپ قریب آئی تو وہ سڑک کے درمیان کھڑا ہو کر ہاتھ ہلانے لگا۔ جیپ قریب آ کر رُک گئی۔ اُس نے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو سلام کیا۔

''کیا بات ہے؟'' اُس آدمی نے پوچھا۔

''جی میں سُرمو کا نمبردار ہوں۔ نچلو جانا چاہتا ہوں۔ ضروری کام ہے۔ اگر آپ مجھے ساتھ لے جائیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔''

''پیچھے بیٹھ جاؤ'' اُس نے کہا۔ نمبردار بھاگ کر پیچھے گیا اور جیپ میں سوار ہوگیا۔ جیپ یہ جا وہ جا۔ جیپ کی روشنیاں بہت تیز تھیں اور دور دور تک جاتی تھیں۔ اِس لیے ڈرائیور کو جیپ تیز تیز چلانے میں زیادہ مشکل پیش نہ آتی۔ وہ ایک گھنٹے کے بعد نچلو میں پہنچ گئے۔

''ہم تو آگے جائیں گے غورڈی کی طرف، آپ اب اتر جائیں۔''

ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا۔ نمبردار نیچے اُترا۔ اُس نے زور سے کہا

''مہربانی'' جیپ چل پڑی اور وہ درختوں میں چھپے راستہ پر ہو لیا۔ یہ راستہ ڈی ایس پی صاحب کے گھر کو جاتا تھا۔ وہ نمبردار تھا اور کئی بار نچلو آیا تھا۔ اِس لیے اُسے ڈی ایس پی صاحب کے دفتر اور گھر کا راستہ معلوم تھا۔

ڈی ایس پی کے گھر جا کر اُس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک ملازم آیا اور اُس کا نام اور پتہ معلوم کر کے اندر چلا گیا۔ وہ دوبارہ آیا اور نمبردار کو ساتھ لے کر ایک کمرہ میں داخل ہوا۔ یہ کمرہ خوب سجا تھا۔ ایک میز تھا اور اس کے اردگرد کئی کرسیاں تھیں۔ میز کے بالکل سامنے ایک صوفہ پڑا تھا۔ ملازم نے اُسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ آیا تو اُس کے ہاتھ میں چائے کا ایک کپ تھا۔ ملازم نے کپ نمبردار کو دیا اور واپس چلا گیا۔ اُس کے جانے کے بعد لمبا تڑنگا رُعب دار ڈی ایس پی اندر آیا اور اُس نے السلام علیکم کہا۔ نمبر نے اُٹھ کر کپ میز پر رکھا اور ماتھے تک ہاتھ لے جا کر وعلیکم السلام کہا۔ ڈی ایس پی نے کہا ''بیٹھو'' نمبردار بیٹھ گیا۔ ''چائے پیو'' ڈی ایس پی صاحب کے حکم پر وہ چائے پینے لگا۔

''کیا بات ہے؟ اِس وقت کیوں آئے ہو نمبردار؟'' ڈی ایس پی صاحب کی آواز میں ہمدردی تھی۔

''صاحب جی۔ اللہ آپ کا رتبہ بلند کرے۔ میرے بیٹے، نچلو کے لکڑ ہارے بروقت پا اور دو انگریزوں کو برفانی انسانوں نے پکڑ لیا ہے'' نمبردار بولا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' ڈی ایس پی نے اطمینان سے کہا۔

''حضور! چوکیدار عبدالخالق کا لونڈا ابھی اِن کے ساتھ تھا۔ وہ بھاگ نکلا اور چنگے بھلے لوگ برفانی انسانوں کے قابو آ گئے۔''

نمبردار! عقل کی بات کرو' ڈی ایس پی کی آواز میں تھوڑا سا غصہ تھا۔

''جناب عالی! مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے میں نے خود تفتیش کی ہے۔ بات درست ہے۔'' نمبردار نے یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''یہ جو تیرے گاؤں میں گورے آئے ہوئے ہیں انہوں نے اجازت لی ہوئی ہے اوپر سے۔ اگر اجازت نہ ہوتی اُن کے پاس تو میں اُن کو جیپ میں بٹھا کر اسلام آباد چھوڑ آتا۔ ساری گڑبڑ اُن کی ہے'' ڈی ایس پی کے لہجہ میں ایک بار پھر غصہ تھا۔ ''یہ لوگ خواہ مخواہ مسئلے

کھڑے کر دیتے ہیں۔’’

‘‘نہیں حضور۔ وہ تو بھلے لوگ ہیں۔ دونوں پروفیسر ہیں۔ ایک بوڑھا ہے اور دوسرا جوان ہے۔ سارا دن پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے ہیں۔’’

‘‘میری اطلاع یہ ہے کہ وہ واپس چلے گئے تھے۔’’

‘‘نہیں جناب اطلاع غلط ہے۔ ایک گورا ولایت گیا تھا علاج کیلئے، اُسے برفانی چیتے نے زخمی کر دیا تھا اور پھر اُسے ولایت سے کچھ سامان بھی لانا تھا۔ کچھ دن ہوئے وہ واپس آ گیا۔ سامان لے کر اور علاج کروا کر۔’’

‘‘وہ تیری حویلی میں ٹھہرے ہوئے ہیں نا؟’’

‘‘جی جناب۔ وہ میرے مہمان ہیں۔’’

‘‘اور وہ جو کمانڈوز تھے، آرمی آفیسرز وہ بھی آپ کے پاس ٹھہرے تھے۔’’

‘‘جی حضور وہ تو کمانڈوز تھے۔ بہت بہادر۔ اُن کو دیکھ کر رُوح راضی ہو جاتی۔ وہ تو جناب سیر کے لیے آئے تھے۔ پیروں میں لکڑیاں باندھ کر برف میں بھاگتے تھے۔

‘‘ہاں۔ وہ سکی انگ کرتے تھے وہ بھی واپس آ گئے ہیں کیا؟’’

‘‘نہیں جناب۔ اِن کی چھٹی ختم ہونے والی تھی۔ وہ چلے گئے۔ وہ بہت بہادر تھے۔ کمانڈوز تھے ناں۔ اِس لیے وہ نہ تھکتے تھے نہ اُن کو بھوک لگتی تھی نہ پیاس۔ وہ تو فولادی انسان تھے۔ وہ ہوتے تو پھر فکر کا ہے کی۔ وہ تو شیر چیتے سے لڑ جاتے تھے۔ بروق پا کو انہوں نے برفانی انسانوں سے لڑ کر چھڑایا تھا۔’’ چوکیدار کمانڈوز کی تعریف کر کے خوشی محسوس کر رہا تھا۔

‘‘ہاں۔ میں نے پڑھا تھا اخبار میں۔ واقعی وہ بہادر لوگ ہیں۔ کاش میرے سپاہیوں میں بھی کمانڈوز کی کوئی خوبی آ جائے۔ میرے سپاہی سُست ہیں چست نہیں ہیں؟ جلد تھک جاتے ہیں۔ پہاڑی راستوں کا سفر سامنے آ جائے تو گھبراتے ہیں۔ اُن کو بھوک بھی بہت لگتی ہے اور پانی بھی بار بار پیتے ہیں جیسے بچے ہوں۔ کمانڈوز آپ سے مانگ کر کھاتے تھے؟ ڈی ایس پی نے اچانک سوال کیا۔

‘‘نہیں جناب’’ نمبردار چائے ختم کر کے بولا۔ انہوں نے جو کچھ کھایا پیا اُس کی پائی پائی بلکہ دمڑی دمڑی ادا کی۔ ہم تو ویسے ہی خوش تھے۔ وہ ہمارے پاس آئے ہیں۔ پروفیسر

الیگزنڈر نے جو چائے اُن کو اپنے حساب سے پلوائی اُس کا معاوضہ انہوں نے نہیں دیا۔ پروفیسر الیگزنڈر کہتا تھا یہ میرے گیسٹ ہیں۔ اب پتہ نہیں گیسٹ کیا ہوتا ہے؟’’

‘‘انگریزی میں مہمان کو گیسٹ کہتے ہیں۔ خیر۔ تو آپ کہہ رہے ہیں کہ چار آدمیوں کو برفانی انسان پکڑ کر لے گئے ہیں؟’’ ڈی ایس پی نے پوچھا۔

‘‘جناب عالی! برفانی انسان پکڑنے کے لیے جو مہم گئی تھی اس میں کمانڈوز تھے۔ جب کمانڈوز چلے گئے تو مہم ختم ہو گئی پھر دوسری مہم گولڈن ٹاور کی طرف لوٹ گئی۔’’ نمبردار یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔

‘‘چپ کیوں ہو گئے۔ کیا کرنے گئی یہ مہم گولڈن ٹاور کی طرف؟ ڈی ایس پی نے گھور کر پوچھا۔

‘‘برفانی انسانوں کو پکڑنے کے لیے’’ یہاں نمبردار نے جھوٹ بولا۔ مہم تو گولڈن ٹاور کا سونا چاندی اور ہیرے جواہرات لینے گئی تھی اور وہاں اِن کو ایسے لوگوں نے قابو کر لیا جن کے متعلق شبہ ہے کہ وہ انڈین آرمی کے آدمی ہیں اور بالکل ناجائز طریقے سے بلتستان میں گھس آئے ہیں۔ انہوں نے کرگل کی طرف سے سرحد پار کی اور کرگل کے مغرب میں آ گئے جہاں گولڈن ٹاور اور گولڈن ٹاور کا خزانہ ہے۔

کمانڈوز تو برفانی انسان کو پکڑ کر سکردو نہ لا سکے۔ یہ لوگ کیسے پکڑ سکتے ہیں۔ ڈی ایس پی نے پوچھا۔

‘‘پروفیسر الیگزنڈر اِس مہم کا سردار تھا۔ اُس کا خیال تھا وہ کسی سائنسی طریقے سے برفانی انسانوں کو پکڑ لے گا۔’’ نمبردار بولا۔

‘‘بابا! بلتستان میں برفانی انسان نہیں رہتے۔ کہیں بھی نہیں رہتے لوگ خواہ مخواہ شور مچاتے ہیں کہ انہوں نے برفانی انسان دیکھے ہیں۔ کہیں نہیں ہیں برفانی انسان۔’’ ڈی ایس پی نے نمبردار کو بتایا لیکن نمبردار بروق پا سے مل چکا ہے۔

‘‘جناب عالی! بروق پا خپلو کا ہی رہنے والا ہے کئی دن برفانی لوگوں کے پاس رہا ہے اِس سے بات کر لیں آپ۔ یقین آ جائے گا کہ ہمارے ادھر بلتستان میں برفانی انسان پائے جاتے ہیں۔’’

‘‘خیر چھوڑو اِس بحث کو تو برفانی انسان گوروں اور دو اپنے آدمیوں کو اٹھا لے گئے ہیں۔

یہی ہے نا؟''

''جناب حضور۔ برفانی انسانوں نے ہمارے لوگوں کو یعنی عام انسانوں کو رات کے وقت ایک غار میں دیکھا اور غار کے منہ سے داخل ہو گئے۔ اب پتہ نہیں عام انسان زندہ ہیں یا مار دیئے گئے ہیں۔ اُن کو بچانا ہے۔'' نمبردار نے التجا کے طور پر کہا۔

''اگر وہ مر چکے ہیں تو بچائیں گے کیسے؟ اور اگر زندہ ہیں اور برفانی انسانوں نے اِن کو قیدی بنا لیا ہے تو پھر کوشش کی جا سکتی ہے لیکن یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے یعنی پولیس اِس سلسلہ میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں ایس پی صاحب کو سکردو ٹیلیفون کر دیتا ہوں اور ساری بات بتا دیتا ہوں۔ آگے اِس کا اپنا کام۔''

''میرے لیے کیا حکم ہے جناب؟'' نمبردار نے پوچھا۔

''تم میرے اردلی کے پاس رات گذارو اور صبح کچھ کھا پی کر واپس سرمو چلے جاؤ۔'' ڈی ایس پی نے کہا۔

''مہربانی حضور۔ یہاں ایک درزی ہے۔ ذات کا سید ہے، کام درزیوں کا کرتا ہے۔ میری اُس سے دوستی ہے۔ اجازت ہو تو میں اُس کے پاس ٹھہر جاؤں۔''

''بھائی میرے اِس میں اجازت کی کیا ضرورت ہے میں تو چاہتا تھا کہ میرے پاس رہو۔ اتنی دور سے آئے ہو اطلاع دینے۔ یہ جو حرامی ہیں نا برفانی انسان اِن سے نمٹنا پڑے گا۔ عام انسان تو عام جرم کرتے ہیں یہ برفانی انسان بڑا بڑا جرم کرتے ہیں۔'' ڈی ایس پی کے ذہن پر اب برفانی انسانوں کا جرم چھا چکا تھا۔

''میں اِن کو ٹھیک کر دوں گا بس ذرا قابو آ جائیں۔''

''حضور مجھے اجازت ہے؟'' نمبردار کرسی پر سے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ہاں ہاں۔ کوئی نہیں۔ خدا حافظ۔ کوئی اور بات یعنی نئی بات جو تمہارے نوٹس میں آئے تو فوراً بتاؤ۔ میں ابھی وائرلیس پر ایس پی صاحب سے بات کرتا ہوں۔''

نمبردار ہاتھ سے سلام کر کے کمرے سے باہر آ گیا اور ڈی ایس پی نے اندر جا کر وائرلیس پر ایس پی صاحب سے سکردو رابطہ کیا۔

کمانڈوز کی روانگی

ایس پی نے پیغام وصول کرنے کے بعد گلگت ڈپٹی انسپکٹر جنرل پولیس کو بتایا۔ ڈی آئی جی نے فوراً گلگت سے فون پر بات کی۔ کمشنر صاحب نے اسلام آباد میں وزیر داخلہ امور حکومت پاکستان کو سارا واقعہ بتایا۔ وزیر مملکت برائے امورِ دفاع کھانے کی دعوت میں تھے۔ وزیر داخلہ نے اِن سے وہاں بات کی۔ اتفاق سے چیف آف آرمی سٹاف بھی اِس دعوت میں تھے۔ اِس لیے وزیر مملکت برائے امورِ دفاع نے اُسی وقت اُن سے کہا کہ وہ کمانڈوز کو گولڈن ٹاور کے امیریا میں بھجوائیں۔

کھانا کھانے کے بعد وزیر مملکت برائے امور دفاع گھر آئے اور وہاں سے انہوں نے چیراٹ ٹیلی فون کیا۔ چیراٹ سے پتہ چلا کہ میجر نوری اور کیپٹن تنویر تو چھٹی پر ہیں۔ بہرحال طے پایا کہ بریگیڈیئر صاحب اُن کو اطلاع دیں حکم دیں کہ وہ اپنے اپنے گھروں سے سیدھے بلتستان میں گولڈن ٹاور کے علاقہ میں پہنچ جائیں اور پروفیسر الیگزینڈر، مائیکل، سلطان اور بروق پا کو چھڑائیں اور اگر ہو سکے تو برفانی انسان کو زندہ پکڑ لیں تا کہ ریسرچ ہو سکے اور اگر وہ زندہ نہ پکڑے جا سکیں تو اُن کو ختم کر دیں۔ اگر یہ کمانڈوز نہ مل سکیں تو دو اور کمانڈوز بھیج دیئے جائیں بہرحال دیر نہ ہو۔

چیراٹ کے انچارج بریگیڈیئر نے فوری تعمیل کی اور میجر نوری اور کیپٹن تنویر کو انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ کے ذریعہ حکم دیا کہ اُن کی ڈیوٹی چیراٹ کے بجائے گولڈن ٹاور امیریا میں ہے اور جب تک کام ختم نہیں ہوتا وہ وہیں ڈیوٹی دیں گے۔ ساتھ ہی ساتھ بریگیڈیئر نے کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت کو حکم دیا کہ وہ سکردو روانہ ہو جائیں۔ وہاں سے خپلو اور خپلو سے گولڈن ٹاور

امریا میں اِن کو سمجھا دیا گیا کہ وہاں وہ برفانی انسان کے قبضہ میں چار آدمیوں کو چھڑائیں گے۔ برفانی انسان کو زندہ یا مردہ پکڑیں گے۔ برفانی علاقہ میں جو سامان ضروری ہو وہ ساتھ لے کر جائیں، جتنا اسلحہ درکار ہے لے کر جائیں۔ جب میجر نوری اور کیپٹن تنویر آ جائیں تو سنیارٹی لسٹ یوں ہو گی۔ میجر نوری، کیپٹن تنویر، کیپٹن شامی، کیپٹن امانت۔

کیپٹن امانت اور کیپٹن شامی نے حکم ملتے ہی دو گھنٹوں میں تیاری مکمل کی اور پھر روانہ ہو گئے۔ انہیں راولپنڈی سے سکردو بذریعہ ہوائی جہاز جانا تھا۔ سکردو میں انتظام کر دیا گیا تھا کہ جیپ اُن کو لے کر سُرمو چھوڑ آئے جہاں سے وہ گولڈن ٹاور کے امریا میں جائیں گے۔

دوسرے دن میجر نوری لاہور سے اور کیپٹن تنویر ضلع سیالکوٹ کے گاؤں بارہ منگا سے چلے اور اسی دن سات گھنٹے سفر کر کے چراٹ پہنچ گئے۔ بریگیڈیئر صاحب سے مِلے، تیاری کی اور اگلی صبح راولپنڈی کے لیے روانہ ہو گئے۔ جب وہ راولپنڈی، سکردو اور خپلو سے ہوتے ہوئے سُرمو پہنچے تو کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت نمبردار کی بیٹھک میں بیٹھے رات کا کھانا کھا رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے گلے ملے اور حال احوال پوچھنے کے بعد ڈفل کوٹ پہن کر دیر تک سردی میں ٹہلتے رہے اور برفانی انسانوں کو پکڑنے کے لیے پلاننگ یعنی سوچ بچار اور منصوبہ بندی کرتے رہے۔

نمبردار اور چوکیدار عبدالخالق بہت خوش تھے کہ کماغڈوز آ گئے ہیں اور بہت جلد آ گئے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ کماغڈوز کے آنے میں کم سے کم سات اٹھ دن تو لگ جائیں گے لیکن کماغڈوز تو تین دن کے اندر سُرمو پہنچ گئے تھے۔ جب وہ چاروں واپس نمبردار کی بیٹھک میں آئے تو وہاں نمبردار، عبدالخالق اور ابراہیم بیٹھے اُن کا انتظار کر رہے تھے۔ ابراہیم اِن سے پہلی بار ملا تھا یعنی میجر نوری اور کیپٹن تنویر اور دوسرے دو کماغڈوز کے آنے کے بعد پہلی بار ملا تھا کیونکہ کماغڈوز اچانک آئے تھے اور ابراہیم کو معلوم نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی آ جائیں گے اس لیے وہ سارا دن کام کر کے سو گیا تھا۔ یہ تو اُس کی ماں نے اُسے جگا کر بتایا تھا کہ میجر نوری اور کیپٹن تنویر آئے ہیں۔ کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت کو تو وہ نہیں جانتی تھی۔ میجر نوری اور کیپٹن تنویر کا نام تو اُس نے اپنے بیٹے کی زبانی کئی بار سنا تھا۔

ابراہیم باری باری اُن چاروں سے ملا۔ میجر نوری نے کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت سے

اُس کی تعریف کی اور اِن کو یہ بھی بتایا کہ کیپٹن تنویر نے اُسے ریوالور چلانے کی تربیت دی ہوئی ہے۔

چاروں کماغڈوز نے ابراہیم کی شروع سے آخر تک ساری بات سُنی اور جب اُس نے بات ختم کی تو میجر نوری سے کہا:

''دشمن دو ہیں، ایک تو وہی برفانی انسان اور دوسرے یہ نئے لوگ جو یقیناً انڈین کماغڈوز ہیں اور جو گولڈن ٹاور کا خزانہ لوٹنے آئے ہیں۔''

میجر کچھ دیر خاموش رہا پھر یقین بھرے لہجہ میں بولا:

''ہمیں ابھی چلنا ہو گا۔ ہم سُرمو کے نمبردار کی اِس حویلی میں رات نہیں گذاریں گے۔ ہم رات سفر کریں گے اور کل صبح تک دشمن کے قریب پہنچ جائیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

رات کا سفر

چار کمانڈوز اور ابراہیم رات کے دس بجے سُرمو گاؤں سے چل پڑے۔ اُن پانچوں کے پاس ٹارچیں تھیں لیکن سب سے آگے کیپٹن تنویر تھا، اُس کے پیچھے ابراہیم، اس کے پیچھے کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت۔ آخری سرے پر میجر نوری تھا۔ صرف کیپٹن تنویر اور میجر کی ٹارچ جل رہی تھی۔ ابراہیم، کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت کے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھے اور بائیں ہاتھ میں ٹارچیں تھیں۔ اُس کے اُلٹ میجر نوری اور کیپٹن تنویر کے دائیں ہاتھ میں ٹارچیں تھیں اور بائیں ہاتھ میں ریوالور۔ اُن چاروں نے فوجی بوٹ پہنے ہوئے تھے جبکہ ابراہیم نے چپل پہنچے ہوئے تھے۔ کیپٹن تنویر نے اُسے گرم جرابیں بھی دی تھیں تاکہ سردی محسوس نہ ہو۔ سب کے ہاتھوں پر دستانے تھے۔ پہاڑوں میں رات سرد ہوتی ہے اور پھر پہاڑی ہوا بھی چلتی ہے۔

سُرمو سے ایک میل دور اچانک ایک درندے نے چلانگ لگائی اور کیپٹن تنویر پر حملہ آور ہوا۔ کیپٹن تنویر گرتے گرتے بچا لیکن ابراہیم کی گولی سے بھیڑیا ٹھنڈا ہو گیا۔

''میرے خیال میں یہ برفانی بھیڑیا ہے۔ بھیڑیا عام طور پر انسان پر حملہ نہیں کرتا۔ لیکن یہ بھوکا ہو گا اِس لیے اُس نے حملہ کر دیا۔'' میجر نوری نے کہا۔

''سر! یہ بھیڑیا نہیں ہے۔ بلتستان میں بھیڑیئے ہوتے ہیں لیکن یہ سیاہ گوش ہے آپ اِسے غور سے دیکھیں اِس کے کانوں کی نوک پر بالوں کا گچھا ہے۔ یہ رہا، یہ بھی برفانی چیتے کے خاندان میں سے ہے لیکن برفانی چیتا نہیں ہے اِسے بلتی زبان میں ای کہتے ہیں۔ یہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی تک رہتا ہے اِس سے اوپر نہیں جاتا۔ یہ جانور اوپر دریائے سندھ کے کناروں کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ کشمیر، گلگت، لداخ اور تبت میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ گوشت

ہی کھاتا ہے خواہ یہ گوشت پرندے کا ہو یا جانور کا۔ یہ نہایت خونخوار اور وحشی جانور ہے۔ بھیڑ اور بکری پر ضرور حملہ کرتا ہے بھوکا ہو تو انسان پر بھی حملہ کر دیتا ہے۔''

ابراہیم یہ کہہ کر چل پڑا۔

''اور کوئی خاص خوبی اِس کی؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

''یہ جو جانور ہے سیاہ گوش یہ رات کو بھی دیکھ سکتا ہے اور اِس کی سننے کی طاقت بھی زبردست ہے۔ میلوں کی آواز اِس کے کان کے پردوں سے آ ٹکراتی ہے۔ ہمارے قدموں کی آواز اِس نے ایک دو میل سے سُنی ہو گی اور پھر یہ ہماری طرف بھاگا ہو گا۔ ابراہیم بولا۔

''یہ باتیں تجھے کیسے معلوم ہیں ابراہیم؟'' کیپٹن شامی نے سوال کیا۔

''سر۔ وہ میرے گاؤں کا ہے نا ایک شکاری۔ سلطان۔ نمبردار کا بیٹا۔ وہی نمبردار جس کی بیٹھک میں آپ نے کھانا کھایا، وہی بتاتا ہے مجھے۔ وہ بہت بڑا شکاری ہے۔ ہمارے گاؤں میں اتنا بڑا شکاری نہیں ہے۔ وہ عید کے دن بھی آرام نہیں کرتا، شکار کھیلنے نکل جاتا ہے۔''

''اور کوئی بات سیاہ گوش کی؟'' کیپٹن تنویر نے پھر پوچھا۔

''سیاہ گوش چڑھائی چڑھنے والا جانور ہے۔ زبردست تیزی سے پہاڑ یا چٹان پر چڑھتا ہے۔ یہ درخت پر بھی چڑھ جاتا ہے اور پھر درخت سے چھلانگ لگاتا ہے نیچے اور شکار کو دبوچ لیتا ہے برفانی چیتے کی طرح۔ بس اسے برفانی چیتے کا چھوٹا بھائی سمجھئے۔ بڑا خطرناک جانور ہے۔'' ابراہیم نے بتایا اور خاموش ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد آپ ہی آپ بولا۔

''اس کی کھال بھی بہت قیمتی ہوتی ہے گرمیوں میں کھال پر کالے دھبے ہوتے ہیں جو سردیوں میں مٹ جاتے ہیں۔''

ابراہیم خاموش ہو گیا اور وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ البتہ اُن کے چلنے کی آواز گونجتی رہی۔ چاند اب مشرق سے آہستہ آہستہ طلوع ہو رہا تھا اور اِن سب کا رُخ شمال مغرب کی طرف تھا اِس لیے اُن کے لمبے لمبے سائے اُن کے آگے آگے چل رہے تھے۔ دور سے ایک بھیڑیئے کی آواز آئی اور پھر کئی آوازیں۔ ابراہیم نے آوازیں پہچان کر کہا۔

''بھیڑیئے ہیں۔ گھوم رہے ہیں۔ شکار کے لیے نکلے ہیں۔ ریچھ یا، یاک یا مارخور کو پکڑ لیں گے۔''

''ہماری طرف بھی آ سکتے ہیں؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

''خوشی سے۔ انہیں تو بس شکار چاہیے خواہ وہ چرندے کا ہو درندے کا ہو، یا انسان کا'' ابراہیم بولا۔

وہ اسی چال سے چلتے رہے۔ یہ چال نہ تیز تھی نہ دھیمی۔ رات کا وقت تھا اور راستہ پتھروں سے اٹا ہوا تھا۔

''مجھے پسینہ آ رہا ہے۔'' کیپٹن شامی بولا۔

''یہ تو خوشی کی بات ہے۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔

بھیڑیئے کی آواز پھر آئی لیکن اِس بار آواز زیادہ دور نہیں تھی۔

''بھیڑیئے کی آواز اِس بار قریب سے آئی ہے۔'' کیپٹن شامی نے کہا۔

''بھیڑیئے ہمارے پیچھے آ رہے ہیں۔'' ابراہیم نے سادگی سے کہا۔

''سر! بھیڑیئے ہمارے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ آپ چونکہ سب سے پیچھے ہیں اِس لیے سب سے پہلے آپ کی ملاقات اِن سے ہوگی۔'' کیپٹن تنویر نے زور سے کہا۔

''مجھے معلوم ہے میں مہمانوں کی آمد کا منتظر ہوں۔'' میجر خوش دلی سے بولا۔

''سر! ہم پیچھے چلتے ہیں۔'' ابراہیم نے کہا۔ اِس سے پیشتر کہ کیپٹن تنویر کوئی بات کرے، ایک بھیڑیئے کی آواز اور قریب سے آئی اِس کے ساتھ ہی دوسرے بھیڑیئے بھی چلّانے لگے۔

''سر! آپ کے مہمان اور قریب آ گئے ہیں۔'' کیپٹن تنویر نے ہنس کر کہا۔

''جی آیاں نوں۔ خوش آمدید۔'' میجر بولا۔

وہ قطار میں چلتے رہے۔ چاند ذرا اوپر اُٹھ رہا تھا۔ چاندنی زیادہ صاف ہوگئی تھی۔ سائے زیادہ چھوٹے ہو گئے تھے اور پھر دیکھتے دیکھتے بھیڑیوں کا غول اُن کے پاس پہنچ گیا اور غرانے لگا۔ کمانڈوز اُسی رفتار سے چلتے رہے اور برفانی بھیڑیئے اُن سے چار پانچ گز دور رہ کر چلنے لگے۔

''اجازت ہو تو فائر کروں اِن پر؟'' ابراہیم نے پوچھا

''نہیں اِن بیچاروں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے۔ یہ تو ہمارا ساتھ دے رہے۔ راستہ دکھا رہے ہیں۔'' کیپٹن تنویر بولا۔

''یہ بڑا موذی اور خطرناک جانور ہے ہم اِس کو اپنی زبان میں سپیا کہتے ہیں۔ آپ

دیکھ رہے ہیں نا؟ ایک بھیڑیئے کا وزن من تو ہوگا۔ یہ جانور پندرہ ہزار فٹ کی بلندی تک پایا جاتا ہے اِس کا رقبہ بہت وسیع ہے۔ یہ ہر قسم کا شکار کرتا ہے۔ چرندہ پرندہ درندہ جو قابو آ جائے اُسے چھوڑتا نہیں۔ انسان پر بھی حملہ کرتا ہے۔ اِس وقت یہ سب ہم پر حملہ کرنے والے ہیں۔ مردہ جانور بھی کھا جاتے ہیں بھیڑیئے۔'' ابراہیم بولا۔

''اور کوئی خاص بات اِن کی؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''بھیڑیا بڑا مکار اور ظالم ہوتا ہے۔ شکار کے لیے ساری رات گشت کرتا ہے۔ تھکنے کا نام نہیں لیتا۔ اِس کی قوت برداشت حیران کر دیتی ہے۔ یہ شکار کو تھکا کر مارتا ہے۔ اب یہ سارے بھیڑیئے اپنے خیال میں ہمیں تھکا رہے ہیں۔ اگر ہم اِس وقت چلنا بند کر دیں اور زمین پر بیٹھ جائیں تو یہ ہم پر حملہ کر دیں گے۔''

''میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات۔ ہاں اور کوئی خاص بات اُن کے بارے میں؟'' کیپٹن نے پھر پوچھا۔

''برفانی بھیڑیئے برادری کی شکل میں رہتے ہیں۔'' ابراہیم بولا۔

''وہ تو صاف ظاہر ہے میرا خیال ہے پوری برادری ہمارے ساتھ مل رہی ہے۔'' کیپٹن بولا۔

''اِن کا ایک سردار ہوتا ہے۔ اِس کا حکم مانتے ہیں۔ اگر کوئی بھیڑیا مارا جائے اور اُس کے بچے یتیم ہو جائیں تو کوئی بھی مادہ بھیڑیا اُن کو پالتی ہے۔ ویسے مادہ بھیڑیا اچھا اچھا گوشت بچوں کو کھلاتی اور خواب گوشت خود کھاتی ہے۔ اگر بچوں کے لیے اُسے بھوکا رہنا پڑے تو وہ بھوکی رہتی ہے۔'' ابراہیم نے بتایا۔

''کیپٹن تنویر اور ابراہیم بھیڑیوں پر فائرنگ کریں گے۔'' میجر نے کہا۔

یہ سن کر کیپٹن جھکا اور اپنا دایاں گھٹنا زمین پر ٹیک کر بولا۔ ''فائر'' اِس کے اور ابراہیم کے فائر سے دو بھیڑیئے زمین پر گرے اور اُٹھ کر بھاگ گئے ''چلو'' میجر کی آواز آئی اور وہ صبح ہونے تک چلتے رہے اور پھر چُور چُور جسم لیے ایک چٹان کی اوٹ میں بیٹھ گئے۔ دن چڑھ آیا اور ہر طرف روشنی تھی۔ اِن سب نے نماز ادا کی اور پھر کمبل اِن کے نیچے تھے اور کمبل اُن کے اوپر اور وہ خراٹے لے رہے تھے۔

ابراہیم پکڑا گیا

جب وہ اُٹھے دوپہر سر پر تھی اور وہ سب تازہ دم تھے۔

''میں ذرا ریکی کرتا ہوں۔ شامی اور امانت ورزش کریں۔ تنویر اور ابراہیم کھانا تیار کریں۔'' میجر نے کہا اور ایک طرف چل دیا۔ شامی اور امانت ورزش کرنے لگے۔ تنویر اور ابراہیم کھانا گرم کرنے میں مشغول ہو گئے۔ تمام سالن ڈبوں میں بند تھے۔ اُن کو گرم کرنا مشکل نہ تھا۔ انہوں نے ایک وقت میں ایک سالن کے اصول پر عمل کیا۔ چپاتیوں اور ڈبل روٹیوں کی کمی نہ تھی۔ برف گرم کی تو وہ پانی بن گئی جو پینے اور منہ ہاتھ دھونے کے کام آئی۔ سب نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا اور چل پڑے۔

دن بھر کا سفر بے کیف تھا۔ کوئی واقعہ بھی پیش نہ آیا۔ وہ خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ سورج ڈوبنے سے پہلے اُن کو ایک جنگلی یاک نظر آیا جو بلندی کی طرف جا رہا تھا۔

''یہ کون سا جانور ہے؟'' کیپٹن شامی نے پوچھا۔

''جنگلی بیل ہے اسے یاک بھی کہتے ہیں۔'' ابراہیم نے کہا اور خاموش ہو گیا۔

شام ہونے سے پہلے وہ گلیشیر کے اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں ایک بار انہوں نے رات بسر کی تھی۔ اس جگہ سے وہ نالہ دور نہ تھا جس کے غار میں پروفیسر الیگزنڈر، مائیکل، سلطان اور بروق یا قید تھے۔

''یہ تو وہی جگہ ہے جہاں ہم ٹھہرے تھے۔'' میجر نے کہا۔

''ہاں اِس جگہ پہلے رات بسر کر چکے ہیں۔ یہاں سے تھوڑی دور وہ نالہ ہے جہاں ایک غار ہے۔ اس غار میں وہ لوگ قید ہیں جن کو چھڑانے ہم یہاں ہیں۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔

''ہم کب ان کو چھڑانے کے لیے چلیں گے؟'' امانت نے پوچھا۔

یہ فیصلہ میجر صاحب کریں گے۔'' تنویر نے بتایا۔

دونوں کی گفتگو میجر نے سن لی تھی۔ وہ بولا۔

''ہم یہاں آرام کریں گے۔ کھانا کھائیں گے، سوئیں گے اور پھر آدھی رات کو چل پڑیں گے۔ چاند کی کرنیں ہمیں راستہ دکھائیں گی ہمارا سارا سامان یہیں رہے گا جس کی حفاظت ابراہیم کرے گا۔ ہم انشاء اللہ صبح کو سورج نکلنے سے پہلے غار میں داخل ہوں گے اور مشن پورا کر کے واپس آ جائیں گے۔''

''سر! میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' ابراہیم نے کہا۔

''زندگی موت کا سوال ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم ہمارے ساتھ جاؤ۔'' میجر نے کہا۔

''میں نے وہ جگہ دیکھی ہوئی ہے جی۔'' ابراہیم بولا۔

''وہ جگہ تو میں اور کیپٹن تنویر نے بھی دیکھی ہوئی ہے اِس لیے اُسے تلاش کرنا ہمارے لیے مشکل نہ ہوگا۔'' میجر نے بتایا۔

''لیکن سر میں لڑائی میں حصہ لینا چاہا ہوں۔'' ابراہیم اب ضد پر اتر آیا تھا۔

''ضرور حصہ لو لیکن برفانی انسانوں کے ساتھ لڑائی میں۔ انڈین کمانڈوز کے ساتھ تم نہیں لڑ سکتے۔ وہ تربیت یافتہ لوگ ہیں۔ ہم ایک بچے کی زندگی خطرہ میں نہیں ڈال سکتے۔'' میجر نے ٹھوس لہجہ میں کہا۔

''ابراہیم۔ میجر صاحب نے جو حکم دیا ہے اُس کو ماننا ہوگا۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔ اُس کا لہجہ سخت تھا۔ ابراہیم کو خاموش رہنا پڑا لیکن اس کا ذہن اور دل لڑائی میں حصہ لینے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ دراصل وہ سُرمو سے صرف انڈین فوجیوں کے ساتھ لڑنے کے لیے چلا تھا ورنہ برفانی انسانوں سے لڑنے کا شوق اتنا زیادہ نہ تھا۔ وہ تو برفانی انسانوں کے ڈیل ڈول کا تصور کر کے ڈر جاتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد طے ہوا کہ ہر شخص ایک گھنٹہ پہرہ دے گا۔ سب سے پہلے ابراہیم پھر تنویر، پھر شامی، پھر امانت اور آخر میں میجر کی باری آئے گی۔

وہ سب سو گئے اور ابراہیم پہرہ دینے لگا۔ جب اُس کی باری ختم ہوئی تو اُس نے کیپٹن

تنویر کو نہ جگایا۔ وہ خاموشی سے نالے کی طرف چل دیا۔ ریوالور اُس کے پاس تھا۔

کیپٹن دو گھنٹے تک سویا رہا پھر اُس کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دیکھا اُس کی گھڑی پر دو بج رہے تھے۔ اُس نے ابراہیم کو اِدھر اُدھر دیکھا اُسے وہ نظر نہ آیا۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ وہ (ابراہیم) غار کی طرف چل دیا ہے۔ اب کیپٹن کے لیے دو راستے کھلے تھے۔ ایک راستہ تو یہ تھا کہ وہ ابراہیم کی تلاش میں غار کا رُخ کرے اور اسے انڈین فوج کے گوریلوں سے بچائے اور دوسرا راستہ یہ تھا کہ وہ میجر کو اطلاع دے کہ ابراہیم بھاگ گیا ہے۔ سوچ سوچ کر اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ میجر کو بتا دے چنانچہ اُس نے میجر کو جگایا اور اُسے بتا دیا کہ ابراہیم کیمپ سے لاپتہ ہے۔

''مجھے معلوم تھا وہ بے وقوف لڑکا یہ حرکت کرے گا۔ بہرحال تیاری کرو اور سارا سامان چیک کرو۔ ہمیں اِس کے پیچھے جانا ہے۔''

اُدھر ابراہیم نالے میں اتر کر آہستہ آہستہ غار کی طرف چلا۔ اُس نے ریوالور جراب کے اندر چھپا رکھا تھا ضرورت پڑے گی تو وہ جھک کر جراب سے ریوالور نکال لے گا اور فائر کر دے گا۔

جب وہ غار کے قریب پہنچا تو وہاں اندھیرا تھا۔ کوئی آواز سنائی نہ دے رہی تھی۔ اُس نے غور سے اُسے دیکھا۔ اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ وہ غار کے منہ کے قریب پہنچا تو کسی نے چھلانگ لگائی اور اس پر گر پڑا۔ مکھن سنگھ نے اُسے قابو کر لیا تھا۔

پوچھ گچھ اور ایک چیخ

مکھن سنگھ قوی ہیکل سکھ تھا۔ اُس کے مقابلہ میں ابراہیم کا قد چھوٹا تھا۔ مکھن سنگھ اُس پر گرا تو ابراہیم ایک طرح سے اُس کے نیچے پس کر رہ گیا۔ مکھن سنگھ نے اُسے بازوؤں سے اُٹھایا اور غار کے اندر پھینکا۔ وہاں دھیان سنگھ بیٹھا تھا۔ اُس نے اُسے قابو کر لیا۔ دھیان سنگھ نے اُسے پکڑے رکھا۔ اسی دوران میں مکھن سنگھ جلدی سے چھلانگ لگا کر اوپر آیا اور اُس نے ٹارچ جلائی۔

''ارے یہ تو لونڈا ہے۔'' دھیان سنگھ بولا۔

''ہاں یہ تو لڑکا ہے۔'' مکھن سنگھ نے تصدیق کی۔

''عمر ہو گی یہی کوئی بارہ سال۔'' دھیان سنگھ نے کہا۔

بروق پا، سلطان، پروفیسر الیگزنڈر اور مائیکل جاگ اُٹھے تھے۔ سلطان نے پکارا۔

''ابراہیم'' سلطان کی آواز سن کر ابراہیم نے ''ہاں'' میں جواب دیا۔ دھیان سنگھ نے پستول تان کر سلطان سے پوچھا۔

''تو اُسے جانتا ہے کیا؟''

''جی ہاں۔ جانتا ہوں یہ میرے گاؤں کا رہنے والا ہے۔ اِس کا نام ہے ابراہیم۔ اِس کے باپ کا نام ہے عبدالخالق۔ وہ چوکیدار ہے'' سلطان نے بتایا۔ ابراہیم نے دیکھا سلطان کے سر پر پٹی بندھی ہے اور پٹی خون آلود ہے۔

''اوئے تو گاؤں سے آیا ہے؟'' مکھن سنگھ نے پوچھا۔

''نہیں جناب۔ یہ تو ہمارے ساتھ تھا، یہیں پر، اسی غار میں۔ پھر پتہ نہیں کہاں چلا

گیا۔'' سلطان نے حیرت سے کہا۔ اُسے بھی معلوم نہ تھا کہ وہ سُرموگاؤں چلا گیا تھا۔

''بتا دے کہاں گیا تھا تو؟'' دھیان سنگھ نے پوچھا لیکن ابراہیم کا دھیان تو کسی اور تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر سلطان کو معلوم نہیں کہ میں کہاں تھا تو اِن سکھوں کو کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ وہ کہاں تھا وہ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک زبردست چپت نے اُس کا سر چکرا دیا۔ یہ دھیان سنگھ کا کارنامہ تھا۔

''ہم پوچھ رہے ہیں کہ کہاں تھا یہ لاٹ صاحب مزے سے چپ ہے۔'' دھیان سنگھ نے چپت لگانے کے بعد خود کلامی کے انداز میں کہا۔

''جی۔ جی۔ میں یہی تھا۔'' ابراہیم گھگھیایا۔

''یہیں پر۔ اسی نالے میں۔ ذرا آگے کی طرف۔'' وہ ٹھہر ٹھہر سوچ سوچ کر بولا۔ اُس کا ذہن اب تیزی سے کام کر رہا تھا۔

''وہاں کیا کرنے گیا تھا؟'' دھیان سنگھ نے سوال کیا۔

''میرے پاس چیتے کا بچہ تھا۔ وہ بھاگ گیا تو اُسے لینے گیا تھا۔ اُسے تلاش کرتا رہا پھر وہ نہ ملا تو طوفان آ گیا۔ طوفان میں تو کچھ نہ ہوسکتا تھا وہیں پھنس کر رہ گیا۔ طوفان کے بعد بھی برفانی چیتے کے بچے کو تلاش کرتا رہا۔ وہ نہ ملا تو دوسرا طوفان آ گیا برف والا۔''

'' بکواس بند کرو۔ چیتے کا بچہ اور طوفان۔ طوفان اور چیتے کا بچہ۔'' اُلو کا پٹھہ۔ مکھن سنگھ بولا'' کیوں اوئے سلطانے۔ یہ ٹھیک کہتا ہے؟'' مکھن سنگھ نے سلطان سے پوچھا۔

''یہ ٹھیک کہتا ہے۔ اِس کے پاس برفانی چیتے کا بچہ تھا۔'' سلطان نے تصدیق کی۔

''مکھن سنگھا! یار مجھے چیتے کا بچہ پسند ہے۔'' دھیان سنگھ بولا۔

''مجھے شیر کا بچہ پسند ہے۔'' مکھن سنگھ بولا۔

''شیر کا بچہ یہاں کہاں؟ ادھر شیر نہیں ہوتے۔ برفانی چیتے ہوتے ہیں۔'' دھیان سنگھ نے کہا۔

''چلو شیر کا بچہ نہ سہی برفانی چیتے کا بچہ سہی۔'' مکھن سنگھ بولا۔

''اِس وقت برفانی چیتے کا بچہ بھی نہیں ہے۔ بس یہ انسان کا بچہ قابو آیا ہے اِس سے تو بہتر تھا برفانی انسان کا بچہ قابو آ جاتا اور میں اُسے ساتھ لے جاتا گاؤں میں۔ سارے بچے

اِس کے ساتھ کھیلتے۔'' دھیان سنگھ نے کہا۔

''دھیان سنگھ۔ اِس کو چھوڑ دوں یا پکڑے رکھوں؟'' مکھن سنگھ نے پوچھا۔

''چھوڑ دو۔'' مکھن سنگھ نے ابراہیم کو چھوڑ دیا اور بولا'' کیا نام ہے تمہارا؟''

''جی۔ میرا نام ابراہیم ہے۔''

''ابراہیم! اِس سلطان کے پاس آرام سے بیٹھو۔ سونا چاہتے ہو تو سو جاؤ۔ بھاگنے کی کوشش کی تو گولی مار کر اڑا دوں گا۔'' مکھن سنگھ نے کہا۔

ابراہیم سلطان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مکھن سنگھ کا رُخ اُن کی طرف تھا اور دھیان سنگھ کا منہ باہر کی طرف تھا۔ وہ دونوں پیٹھ سے پیٹھ ملا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ٹارچ بجھا دیا گیا تھا اور چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر بعد مکھن سنگھ نے ٹارچ روشن کی اور اپنی گھڑی کو دیکھا۔

''کیا وقت ہوا مکھن سیوں؟'' دھیان سنگھ نے پوچھا۔

''ساڑھے چار ہوئے ہیں صبح کے دھیان سیوں؟'' مکھن سنگھ بولا۔

''ایک گھنٹے تک دن کی روشنی ہو جائے گی۔'' دھیان سنگھ نے خود سے بات کی۔

''کرنل دھنی رام اور ساتھیوں کو آج واپس آ جانا چاہیے۔ خزانہ لے کر۔ کافی دن ہو گئے ہیں۔'' ایک سکھ نے کہا۔

''انہیں تو کل آ جانا چاہیے تھا۔ ایک دن پہلے ہی لیٹ ہو گئے ہیں۔'' دوسرا سکھ بولا۔

''راستہ بھی تو خراب ہو گا نا۔ برف کے پہاڑ۔ برف کی ندیاں برف کے نالے، برفانی بھیڑیا، برفانی چیتا، برفانی یاک، برفانی شیر.....'' ایک نے کہا۔

''برفانی شیر نہیں ہوتے۔ جنگلی شیر ہوتے ہیں'' دوسرے نے اُسے ٹوکا۔

''جہاں چیتا ہو گا وہاں شیر بھی ہو گا۔'' دھیان سنگھ بولا۔

''یہ ضروری نہیں ہے۔ اِس علاقے میں شیر نہیں ہوتے۔ شیر سب کچھ برداشت کر سکتا ہے برف برداشت نہیں کر سکتا۔ اُسے نمونیہ ہو جاتا ہے۔'' مکھن سنگھ بولا۔

وہ باتیں کر رہے تھے لیکن ایک گوریلا اپنے قیدیوں پر نگاہ رکھے ہوئے تھا اور دوسرا گوریلا باہر دیکھ رہا تھا۔ ابراہیم نے آہستہ سے اپنا ایک ہاتھ جراب کی طرف بڑھایا اور ریوالور

دائیں ہاتھ میں مضبوط طریقے سے پکڑا وہ ایک ہی وار سے دونوں سکھوں کو نشانہ بنانا چاہتا تھا۔

''کیوں ہل رہے ہو تم؟'' مکھن سنگھ نے ابراہیم کو ڈانٹا۔

''نیند نہیں آ رہی جناب۔'' ابراہیم بولا۔

''تو کون کہتا ہے سونے کو۔ جاگو'' دھیان سنگھ نے نالے کی طرف آنکھیں جماتے ہوئے کہا۔

''دھیان سنگھ جی۔ اگر تم کہو تو ابراہیم کو دو لگا دوں'' مکھن سنگھ نے کہا۔

''ضرورت پڑی تو اِن سب کو گولی مار دیں گے مکھن سیاں۔'' دھیان سنگھ بولا۔

اچانک شعلہ لپکا گولی چلی۔ ڈزادوں اور پستول دھیان سنگھ کے ہاتھ سے گر پڑا۔ دھیان سنگھ چلایا ''مکھن سیوں'' مکھن سنگھ پلٹاؤ اُس کا منہ نالے کی طرف ہوا ہی تھا کہ ابراہیم نے ریوالور کی گولی چلائی ڈزاؤں۔ ابراہیم نے دیکھا سامنے میجر نوری اور کیپٹن تنویر کھڑے تھے۔ غار کے نیچے نالہ کے فرش پر۔ مکھن سنگھ دوہرا ہو کر غار کے فرش پر پڑا تھا اور مر چکا تھا۔ دھیان سنگھ کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیاں اور ایک انگوٹھا کیپٹن تنویر کے فائر سے اُڑ چکا تھا اور پستول غار کے فرش پر ایک گز کے فاصلہ پر پڑا تھا۔

''شامی، گرفتار کر لو اس کو۔'' میجر نے کہا۔

شامی اور امانت کود کر غار کے اندر آئے اور انہوں نے رسیوں سے دھیان سنگھ کو جکڑ لیا

''تنویر مرہم پٹی کرو'' تنویر غار کے اندر آیا۔ میجر باہر کھڑا رہا نالے میں۔

وہ سارے کھڑے ہو گئے تھے بروق پا، سلطان، پروفیسر الیگزنڈر، مائیکل اور ابراہیم۔

''ابراہیم سے ریوالور واپس لے لو کیپٹن تنویر'' میجر نے نالے سے حکم دیا۔

''یس سر'' کیپٹن تنویر نے خالی ہاتھ بڑھایا تو ابراہیم نے خالی ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔ پھر کیپٹن تنویر آہستہ سے بولا۔

''شاباش ابراہیم!'' دوسرے ہاتھ سے ابراہیم نے ریوالور کیپٹن کو دے دیا۔

پوچھ گچھ

میجر کے حکم پر کھانا اور چائے تیار ہوئی۔ قیدی لوگ بھوک اور پیاس سے نڈھال تھے۔ پروفیسر الیگزنڈر کو نمونیہ تھا۔ بروق پا کو تیز بخار تھا۔ البتہ سلطان اور مائیکل بھوک پیاس کا مردانہ وار مقابلہ کر رہے تھے۔

جب سلطان کو پتہ چلا کہ ابراہیم واپس سُرمو گیا تھا اور اُس کے والد نے خپلو جا کر ڈی ایس پی کو اطلاع دی تھی تو سلطان کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ آخر ابراہیم اُسی کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔

سلطان نے مکھن سنگھ کی لاش کو اُٹھایا، غار سے نیچے لڑھکایا اور پھر اُسے کندھوں پر اُٹھا کر دُور نالہ میں پھینکا لیکن ایک احتیاط کی، اُس نے سارے کپڑے اتار لیے سوائے انڈرویئر کے جسے کچھا کہا جاتا ہے۔ مکھن سنگھ کے پستول اور گولیوں پر بھی اُس نے قبضہ کر لیا۔ اُس نے اوور کوٹ بروق پا کو دے دیا۔ کمبل پروفیسر الیگزنڈر پر ڈال دیا اور پستول ابراہیم کو دے دیا۔

جب میجر کو معلوم ہوا کہ پروفیسر الیگزنڈر کو نمونیہ ہے اور بروق پا شدید بخار میں مبتلا ہے تو اُس نے سلطان اور کیپٹن امانت کو ضروری ہدایات دے کر واپس خپلو بھیجا۔ مقصد یہ تھا کہ ڈاکٹر اور دوائیاں آ جاتیں تو باقاعدہ علاج شروع ہو جائے۔ جب تک خپلو سے ڈاکٹر اور دوائیاں نہیں آ جاتیں تب تک ابتدائی طبی امداد کے اصول پر علاج ہو گا۔ میجر نے حکم دیا۔

سلطان اور امانت سُرمو اور خپلو کی طرف روانہ ہو گئے تو میجر نے کیپٹن تنویر کی مدد سے دھیان سنگھ کو ساتھ لیا اور اُس جگہ چلے گئے جہاں مکھن سنگھ کی لاش پڑی تھی۔ وہ لاش کے قریب برف پر بیٹھ گئے میجر نے بات شروع کی۔

''دھیان سنگھ تم جانتے ہو کہ ہم تمہارا نام جانتے ہیں۔ ہمیں اور بھی بہت کچھ معلوم ہے لیکن ہم تمہارے منہ سے تمہاری زبان سے تمہارے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ بتاؤ گے یا خاموش رہو گے؟''

''بتاؤں گا۔'' دھیان سنگھ بولا۔

''ایک بات یاد رکھو تم ہمارے رحم و کرم پر ہو۔ سچ سچ بتاؤ گے تو ہم تجھے کچھ نہ کہیں گے۔ جھوٹ بولو گے تو تم ہم سے بچ نہ سکو گے۔''

''میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔''

''تمہاری رجمنٹ کون سی ہے؟''

''میری کوئی رجمنٹ نہیں۔ میں فوجی نہیں ہوں۔ میں ضلع گورداسپور کی تحصیل بٹالہ کا رہنے والا ہوں اور سمگلر ہوں۔''

''شاباش۔ تم نے جھوٹ سے بات شروع کی ہے اِس لیے اب ہم اپنے وعدے پر نہیں رہیں گے۔ کیپٹن تنویر دھیان سنگھ سے پوچھ گچھ کرو،'' میجر نے حکم دیا اور خود سگریٹ سلگا کر پینے لگا۔

کیپٹن تنویر نے دھیان سنگھ کا اوور کوٹ اتارا پھر ڈفل اتارا پھر جرسی اتاری اور اِس کے بعد اِس کی قمیض کا گریبان پھاڑ دیا۔ پہاڑی ہوا میں دھیان سنگھ کا سارا جسم کانپنے لگا۔

کیپٹن تنویر نے ریوالور کو چیک کیا۔ ''اس میں پانچ گولیاں ہیں دھیان سنگھ۔ ایک گولی راستہ میں برفانی بھیڑیا پر چلائی تھی اور وہ مر گیا تھا۔ میرا نشانہ پختہ ہے افسوس آپ کو پتہ نہ چل سکے گا کیونکہ تم پرلوک سدھار چکے ہوں گے۔''

اسی دوران میں ابراہیم چائے لے آیا۔ میجر اور کیپٹن چائے پینے لگے۔

''بھاگ کر جاؤ اور دھیان سنگھ کے لیے چائے لاؤ'' میجر نے کہا ''کیپٹن اِس پر اوور کوٹ دیدو۔''

کیپٹن نے اوور کوٹ اُٹھا کر دھیان سنگھ کو پہنا دیا۔

''تمہاری ساری گفتگو ہم سن چکے ہیں۔ وہ گفتگو فوجیوں کی گفتگو تھی۔ عام سکھوں کی گفتگو نہ تھی۔ تمہارے کپڑوں سے پتہ چل گیا ہے کہ تم فوجی ہو۔ مکھن سنگھ کی لاش کو چیک کیا

ہے۔ اِس کے جسم پر چند ایسے نشانات ہیں جن سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گوریلا ہے۔ اِس لیے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔

''ہم جموں اور کشمیر کے گوریلے ہیں۔ ہمارا کمانڈر کرنل دھنی رام ہے۔ ہم تعداد میں پانچ ہیں اور پانچوں سکھ ہیں۔ کرنل دھنی رام چھٹا آفیسر ہے۔ ہم گولڈن ٹاور کا خزانہ لینے آئے ہوئے تھے۔ سلطان اور اُن کے ساتھی ہمیں اتفاقاً غار میں ملے تو ہم نے ان کو قید کر لیا۔ کرنل نے میری اور مکھن سنگھ کی ڈیوٹی قیدیوں پر لگا دی اور خود گولڈن ٹاور کی طرف چلے گئے۔ ان کے ساتھ تین گوریلے تھے۔''

ابراہیم چائے لے آیا اور اُس نے کپ دھیان سنگھ کو تھما دیا۔ دھیان سنگھ چائے پی چکا تو اُس نے کپ نیچے برف پر رکھ دیا۔

ابراہیم نے پلک جھپکتے ہی پستول سے دھیان سنگھ پر فائر کر دیا۔ وہ منہ کے بل گرا تو ابراہیم نے پستول میجر کے پیروں پر پھینک دیا اور خود کیپٹن تنویر کے پاس جا کھڑا ہوا۔ میجر نے پستول اٹھایا اُسے صبح کی روشنی میں دیکھا اور بولا۔

''تیرے پاس کہاں سے آیا یہ پستول؟''

''سر! یہ مجھے سلطان نے دیا تھا جانے سے پہلے یہ مکھن سنگھ کا پستول ہے'' ابراہیم بولا۔

''مائی گاڈ۔ مجھے کیوں یاد نہ رہا کہ مکھن سنگھ کے پاس پستول تھا۔'' میجر خاموش رہا۔ اُس نے پستول کو ایک بار پھر دیکھا اور کیپٹن کو دیتے ہوئے آہستہ سے بولا۔

''ابراہیم کو آج دوپہر بھوکا رکھا جائے۔ یہی اِس کی سزا ہے اور ان دونوں لاشوں کو دبا دیا جائے برف کے نیچے۔''

''سر اوور کوٹ؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''دھیان سنگھ کو اوور کوٹ میں ہی دفن کر دیا جائے۔ اُس نے شروع میں جھوٹ اور بعد میں سچ بولا تھا'' میجر غار کی طرف چل پڑا۔ کیپٹن تنویر اور ابراہیم نے لاشیں کھینچ کر دو پتھروں کی اوٹ میں کر دیں اور خود پرلی طرف نکل گئے سیر کے لیے۔

گلیشیر پر

جب کیپٹن تنویر اور ابراہیم واپس آئے تو غار کے اندر میجر، بروق پا، پروفیسر الیگزنڈر اور مائیکل بیٹھے تھے۔ کیپٹن شامی پہرہ پر تھا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے کیپٹن؟'' میجر نے پوچھا۔

''سر! ہم لاشوں کو دفن کر کے ذرا اوپر سے ہو کر آئے ہیں۔'' کیپٹن نے کہا ''حکم کیا ہے میرے لیے؟''

''آپ دیکھ رہے ہیں کہ پروفیسر کو نمونیہ ہے۔ بروق پا کو شدید بخار ہے یقیناً اُس کو بھی نمونیہ ہو جائے گا۔ ہم صرف پانچ آدمی سردی سے بچے ہوئے ہیں، آپ، مائیکل، ابراہیم، کیپٹن شامی اور میں۔ اب ہمیں سوچنا ہوگا کہ آگے چلیں یا پیچھے۔'' میجر بولا۔

میرے خیال میں ہم پیچھے نہیں جا سکتے۔ البتہ اگر پروفیسر الیگزنڈر اور بروق پا کو موت کے حوالہ کیا جا سکتا ہے تو واپس جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے ہم واپس نہیں جا سکتے کیونکہ ہم پروفیسر اور بروق پا کو موت کے حوالہ نہیں کر سکتے ہم اس غار میں بھی نہیں بیٹھ سکتے۔ اس غار میں بیٹھنے سے ہمیں دو دشمنوں سے خطرہ ہے۔ خطرہ کیا؟ اس غار میں موت دوبار ہم پر شبخون مار سکتی ہے۔ شب خون کا لفظ پسند نہ ہو تو پھر سر، آپ ازالٹ یعنی حملہ کا لفظ استعمال کر سکتے ہیں تو اس غار میں موت دوبار آ سکتی ہے۔ ایک بار کرنل دھنی رام کے ذریعہ اور دوسری بار برفانی انسانوں کے حوالہ سے۔''

''تم نے ٹھیک کہا کیپٹن تنویر۔ پھر؟'' میجر نے پوچھا۔

''پھر یہ کہ ہمیں آگے بڑھنا چاہیے یعنی مجھے اور آپ کو۔ مائیکل اور ابراہیم یہیں رہیں

اور پروفیسر اور بروق پا کو یہی اٹنڈ کریں اور کیپٹن شامی ان کی نگہبانی کریں، حفاظت کریں۔'' کیپٹن نے کہا اور میجر کو فیصلہ طلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''مجھے اس تجویز سے اتفاق ہے'' میجر بولا۔

''سر! میں بھی آپ کے ساتھ جانا چاہتا ہوں۔ میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا۔'' ابراہیم بولا۔

''یہ تیسری پرابلم ہے۔ ابراہیم ایک الگ مسئلہ ہے ہمارے لیے، ہم اٹھارین گوریلوں اور برفانی انسانوں سے نپٹ سکتے ہیں لیکن توانائی کے اس گولے سے نپٹنا مشکل ہے۔ آل رائٹ تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے اور ہمارے لیے کافی اور کھانا تیار کرو گے۔'' میجر نے کہا۔

''تھینک یو سر؟'' ابراہیم بولا۔

''کس سے انگریزی سیکھ رہے ہو؟ کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

''پروفیسر سے یہ دو لفظ سیکھے ہیں۔ تھینک یو۔'' وہ شرما کر بولا۔

''مسٹر تھینک یو۔ چلو جلدی سے کھانا تیار کرو۔'' میجر نے ابراہیم کو اشارہ کیا اور وہ جلدی جلدی تیل کے چولہے کی طرف لپکا اور اسے جلانے لگا۔

''سر کچھ دوائیاں اور کچھ کھانے پینے کی چیزیں ملی ہیں۔ مکھن سنگھ اور دھیان سنگھ کے سامان سے۔'' کیپٹن شامی نے میجر کو بتایا۔

''سب چیزیں ضبط کر لو اور استعمال کرو بشرطیکہ حلال ہوں۔''

''ایک بوتل میں شراب ہے۔'' کیپٹن شامی نے بتایا۔

اُسے پروفیسر الیگزنڈر کے حوالہ کرو اور اگر چاہتے ہو تو بوتل توڑ دو۔ مجھے شراب سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ شراب مسلمانوں کے لیے حرام ہے اگر بروق پا کو نمونیہ ہو جائے اور اسے دوائی نہ ملے اور وہ مرنے والا ہو اور شراب سے بچ سکتا ہو تو بھی اُسے شراب نہ دو۔'' میجر کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ''وہ زندگی کیا جو شراب سے حاصل کی جائے۔'' میجر نے بات ختم کی۔

''کیپٹن تنویر۔ کرنل دھنی رام کسی وقت بھی ہم پر حملہ کر سکتا ہے۔'' کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میجر نے کہا۔

''سر! اُس کو کون روک سکتا ہے؟ حملہ کرنا چاہتا ہے تو کرے ہم اس پر جوابی حملہ کریں

گے۔'' کیپٹن نے کہا۔

''مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کیپٹن کہ تم اس وقت مرنے مارنے پر تُلے ہو۔'' میجر نے کہا۔

''آپ نے درست سمجھا سر، میں واقعی مرنے مارنے پر تُلا بیٹھا ہوں۔ میں کرنل دھنی رام اور اس کے تین گوریلوں سے بھڑ جانا چاہتا ہوں، انہوں نے جرأت کیسے کی کہ ہمارے ملک کے اندر چوروں کی طرح آ جائیں۔'' کیپٹن نے غصہ میں کہا۔

''مجھے آپ کے جذبہ کی قدر ہے۔ کھانا کھا کر چلتے ہیں دھنی رام جی کی تلاش میں۔'' میجر نے کہا اور غار کے اندر داخل ہو کر سامان چیک کرنے لگا۔ کیپٹن تنویر بھی غار کے اندر گیا اور ضروری چیزیں اکٹھی کرنے لگا۔ ابراہیم نے تیل والے چولہے کی بتّی اور اونچی کر دی۔

کھانا کھانے اور مکمل تیاری کے بعد جب وہ تینوں غار سے نکلے تو بارہ بج رہے تھے۔ وہ گولڈن ٹاور کی چوٹی کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ کچھ دور تک تو نالہ میں سفر کرتے رہے اور پھر نالہ سے نکل کر گلیشیر پر چڑھ گئے۔ گلیشیر پر چڑھنے کے لیے انہوں نے رسّہ استعمال کیا۔

گلیشیر پر چڑھ کر اُن تینوں نے اپنے اپنے وزن اور بوجھ کو تولا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ اُن کا وزن کس قدر ہے کیوں کہ وہ گلیشیر کے سرے کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ یہ گلیشیر گولڈن ٹاور کی چوٹی سے پھوٹتا تھا جہاں سے کئی اور گلیشیر بھی جاری ہوتے تھے۔ اب انہوں نے بھاری بھرکم فوجی بوٹوں یا چپل کے بجائے ٹینس شوز پہنے ہوئے تھے جو وزن میں ہلکے تھے اُن کے پاس جرسیاں اور ڈفل بھی تھے اور کمبل اور برساتیاں بھی۔ برساتیاں (رین کوٹ) بارش اور برف باری سے بچنے کے لیے تھیں۔ سارا سامان نائیلون کے رسوں میں بندھا ہوا تھا اور ان کے کندھوں پر تھا۔ ہاتھ میں چھڑیاں تھیں۔

اب وہ گولڈن ٹاور گلیشیر کی انتہائی بلندی پر تھے جو بیس ہزار فٹ تھی۔ وہ بڑے بڑے پہاڑوں اور ان کی عظیم برف پوش چوٹیوں کے درمیان میں تھے۔ لگتا تھا زمین نے ابھی ابھی کائنات کی کوکھ سے جنم لیا ہے اور پہاڑوں، برف زاروں اور برف پوش چوٹیوں کا روپ دھار لیا ہے۔ ان پہاڑوں اور ان برف پوش چوٹیاں کو دیکھ کر انسان پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ ان کے اردگرد سارے مناظر ہیبت اور دہشت ناک تھے۔ گلیشیر کے سینے پر یخ بستہ پتھر، یخ بستہ روڑے، یخ بستہ بجری اور یخ بستہ کنکریاں تھیں۔ دراڑ منہ کھولے کھڑے تھے جن کو پار کرنا

جان کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ ان دراڑوں پر کہیں کہیں برف کے پل بنے ہوئے تھے۔ ان پلوں پر سے گذرنا موت سے مصافحہ کرنے کے برابر تھا۔ برف کے جھرنے بھی صاف دکھائی دیتے تھے جو گلیشیر کے اردگرد پہاڑوں سے گرتی ہوئی برف کے جم جانے سے بن گئے تھے۔ انگریز اس کو آئس فال کا نام دیتے ہیں۔ آبشار کے وزن پر برف شار۔

برف کی آبشار یعنی آئس فال گلیشیر کا ہی حصہ ہوتا ہے۔ جب گلیشیر سرکتے ہوئے عمودی ڈھلان پر آتا ہے تو ٹوٹ جاتا ہے۔ جس سے دراڑیں پڑ جاتی ہیں جن سے گلیشیر کی اوپر کی سطح ناہموار ہو جاتی ہے کیونکہ گلیشیر کی سطح پر برف کے ناہموار ستون کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ وہ علاقہ ہے جہاں کوئی انسان نہیں رہتا اور نہ کوئی ہوائی جہاز آتا ہے۔ آسمان کے گنبد پر بس رات کو تارے نظر آتے ہیں جو اتنے قریب ہوتے ہیں کہ جی چاہتا ہے کہ ہاتھ اُٹھا کر چھو لیں۔ بیس ہزار فٹ کی بلندی پر جسم کی توانائی کو قائم رکھنا بہت بڑا چیلنج ہے۔ یہاں صحت مند رہنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ رات کو اتنی بلندی پر نیند بھی مشکل سے آتی ہے۔ اگر زخم آ جائے یا سورج کی کرنوں سے جسم کی کھال جل جائے تو زخم جلدی اور آسانی سے ٹھیک نہیں ہو پاتے کیونکہ ہوا میں آکسیجن بہت کم ہوتی ہے اور اگر ہوا میں آکسیجن کی کمی ہو تو زخم آسانی سے ٹھیک نہیں ہوتے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا ذہن ماؤف ہو جاتا ہے یعنی اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ماؤف ہو جاتی ہے۔ وہ دولے شاہ کا چوہا بن جاتا ہے۔ شام ہونے سے پہلے بیس ہزار فٹ کی بلندی پر میجر نے کیمپ لگانے کا فیصلہ کیا اور طے ہوا کہ وہ ایک ہی کیمپ میں رات بسر کریں گے۔

ایک قیدی

وہ تینوں رات دیر تک جاگتے رہے۔ ابراہیم نے کھانا کم کھایا۔ اُس کا خیال تھا کہ کھانا زیادہ کھا لیا جائے تو سردی بہت لگتی ہے۔ میجر اور کیپٹن نے کافی پی۔ ابراہیم کو کافی کا ذائقہ بھلا نہ لگتا تھا۔ طے ہوا کہ پہلے دو گھنٹے کیپٹن پہرہ دے گا۔ میجر اور ابراہیم گیارہ بجے رات سو گئے۔

رات ایک بجے کیپٹن کے کانوں میں ایسی آوازیں آئیں جیسے لوگ سال کے آخری دن نئے سال کو خوش آمدید کہنے کے لیے خوشی مناتے ہیں اور گیت گاتے ہیں۔ گویا ضیافت کا ہنگامہ تھا۔ کیپٹن نے دیکھنے کی کوشش کی لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔ ایک تو رات اندھیری تھی دوسرے اُس کی نگاہ کے راستہ میں برف کے مینار اور ستون تھے۔ اِس شور وغل میں کسی انسان کے رونے اور چلانے کی آواز بھی شامل تھی۔ کیپٹن کا جی چاہا کہ وہ ٹارچ لے۔ برف کی دراڑیں پار کر کے اور برف کے میناروں پر چڑھ کر اور پھر اُتر کر اُس جگہ پہنچ جائے جہاں یہ ہنگامہ ہے۔ یہ دراڑیں اور برفانی مینار مشکل سے پار ہوتے ہیں۔ رات کو اور وہ بھی اُس رات کو جب ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، ان کو پار کرنا مشکل ہے۔

اُس نے آوازوں پر توجہ نہ دی اور ابراہیم کو جگایا۔ ابراہیم نے مکھن سنگھ کا پستول ہاتھ میں لیا اور بولا۔

''میجر صاحب فرماتے ہیں کہ ریوالور پولیس کا ہتھیار ہے بنیادی طور پر اور پستول آرمی جوانوں کا ہتھیار بنیادی طور پر۔''

''اور تُو ہے چوکیدار بنیادی طور پر کیونکہ تمہارا ڈیڈی بھی چوکیدار ہے بنیادی طور پر'' کیپٹن تنویر نے پیار سے اُس کے سر پر دھپا مارا اور اپنے سلیپنگ بیگ میں گھس گیا جس کا

دوسرا نام سلیپنگ پیک بھی ہے۔

ابراہیم کو بھی دور سے پہاڑی ہوا کے کندھے پر سوار ہو کر آنے والی آوازیں سنائی دیں لیکن وہ سمجھا اُس کے کان بج رہے ہیں۔ آدھ گھنٹے کے بعد آوازیں بند ہو گئیں۔ برفانی انسان برف میں کھیل رہے ہیں۔ اُس نے سوچا اور پھر جب آوازیں بند ہو گئیں تو اُس نے سوچا وہ سو گئے ہیں۔

وہ ساری رات خیمہ سے باہر کھڑا رہ کر پہرہ دینا چاہتا تھا لیکن تین بجے کے قریب میجر نے اُسے اندر جانے کا آرڈر دیا اور خود اس کی جگہ کھڑا ہو گیا۔ اب چاند نکل آیا تھا اور چاروں طرف روشنی تھی۔

''کرپا سنگھ، کرپا سنگھ'' میجر کے کانوں میں دُور سے آواز آئی۔ اُسے معلوم نہ ہو سکا آواز کس طرف سے آ رہی ہے۔ میجر نے کان کھڑے کر لیے۔

''کرپا سنگھ جی، کرپا سنگھ جی'' آواز اب قدرے قریب سے آ رہی تھی البتہ اس کی سمت کا پتہ نہ چل رہا تھا۔

''کرپا سیوں، اوئے کرپا سیوں۔'' آواز کانپ رہی تھی۔

میجر خیمہ کے اندر گیا اور فوجی بُوٹ کی ٹھوکر مار کر کیپٹن تنویر کو جگایا۔ کیپٹن کپڑوں سمیت سویا ہوا تھا پستول لے کر باہر آ گیا۔

ان دونوں نے دیکھا۔ ایک شخص چاند کی روشنی (چاندنی) میں اُن کی طرف لڑکھڑاتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ میجر اور کیپٹن نے اپنے ہتھیار تیار کر لیے۔

''کرنل صاحب، کرپا سنگھ جی۔ میں دلدّر سنگھ ہوں۔'' وہ آواز پھر بلند ہوئی۔

''آؤ، آؤ'' میجر نے کہا۔

''آپ کہاں چلے گئے تھے۔ میں راستہ بھول گیا تھا۔'' دلدّر سنگھ نے کہا۔

میجر اور کیپٹن نے اپنے سر اور چہرے ڈفل کوٹ میں چھپا لیے تھے وہ ان کو نہ پہچان سکا۔ میجر نے پستول سے اشارہ کیا کہ وہ خیمے کے اندر داخل ہو جائے۔ دلدّر سنگھ خیمے کے اندر داخل ہوا اور فرش پر بیٹھ کر پہلے اُس نے دستانے اتارے پھر بوٹ اتارے اور اُس کے بعد اوور کوٹ۔ کیپٹن نے اوور کوٹ اتار کر خود پہنا اور اُس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ایک جیب میں

پستول اور گولیاں اور دوسری جیب میں ایک گرینیڈ۔

میجر نے تیل کا چولہا جلایا اور باہر سے کیتلی میں برف لا کر اُسے چولہے پر رکھا۔

''اتنی سردی، اتنی سردی۔ اگر میری ماں بھی کہتی تو میں نہ آتا لیکن اس کرنل کے بچے نے ایسا لالچ دیا کہ بس کچھ نہ پوچھو۔'' دلدّر سنگھ نے کہا وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر بولا۔

''میں جان گیا ہوں آپ نہ کرنل دھنی رام ہیں اور نہ ہی کرپا سنگھ۔ آپ مسلمان ہیں اور ہمیں پکڑنے کے لیے آئے ہیں اور میں پکڑا جا چکا ہوں۔ میں مرنے کے لیے تیار ہوں لیکن چائے پی کر۔'' دلدّر سنگھ بولا اور پھر ہنسنے لگا۔

''کرنل دھنی رام کہاں ہے؟'' میجر نے پوچھا

''اپنی ماں کے پاس'' دلدّر سنگھ غصے سے بولا ''سر، مجھے پہلے چائے پلاؤ اس کے بعد جو جی چاہے پوچھو، بتاؤں گا، واہگورو کی قسم سچ سچ بتاؤں گا۔''

کیپٹن نے ٹھوکر مار کر ابراہیم کو جگایا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور دلدّر سنگھ کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔

''میں دلدّر سنگھ ہوں جی۔'' وہ ابراہیم سے مخاطب ہو کر بولا۔

''سمجھ گیا۔ تم مکھن سنگھ اور دھیان سنگھ کے ساتھی ہو۔'' ابراہیم کے منہ سے نکلا۔

''ہاں جی۔ آپ اسے کیسے جانتے ہیں۔ میں نے تو آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔'' دلدّر سنگھ بولا۔

تیل کے چولہے کی روشنی میں کیپٹن نے اُسے گھورا۔

''میں اُن سے ملا تھا دوبار۔''

''کہاں ملا تھا کاکا؟'' دلدّر سنگھ نے پوچھا۔

''غار میں۔'' ابراہیم بولا۔

''یہ لو چائے پیو دلدّر سنگھ۔ گرما گرم۔'' میجر نے اُسے کپ دیا جو اُس نے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔

''گولڈن ٹاور کا خزانہ ملا یا نہیں؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''مجھے تو نہیں ملا۔ میرے باقی تین ساتھیوں کو مل گیا ہو تو پتہ نہیں۔ میں تو کل رات سے اُن سے الگ ہو چکا ہوں۔ ایک آوا لانچ آیا ہماری طرف۔ وہ بھی بھاگے جان بچانے کے

لیے اور میں بھی بھاگا۔ اسی بھاگ دوڑ میں وہ الگ اور میں الگ'' دلدّر سنگھ مزہ لے لے کر چائے پینے لگا۔

چائے پینے کے بعد وہ بولا۔ میں کل رات سے بھوکا ہوں۔ اگر کچھ کھانے کو ہو تو مجھے دو۔

میجر نے ہنٹر بیف کا ٹکڑا اُسے دیا اور وہ بھیڑیئے کی طرح کھانے لگا۔ ہنٹر بیف کھا کر بولا۔

''میں سونا چاہتا ہوں۔ میرے اوپر میرا اوورکوٹ ڈال دیجیے۔'' کرپا ہو گی میرا مطلب ہے آپ کی مہربانی ہو گی۔

''آپ یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کریں گے اس سے آپ کی جان خطرے میں پڑ جائے گی۔''

''سر! میں سونا چاہتا ہوں اور جو بندہ سو رہا ہو وہ بھلا کیسے بھاگ سکتا ہے اور پھر میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا؟ یہ پہاڑ تو میری جان لینے پر تلے ہوئے تھے۔ آپ نے مجھے نئی زندگی دی ہے کیا میں اتنا بیوقوف ہوں کہ اپنے آپ کو ان پہاڑوں کے حوالے کر دوں اور پھر میرے پاس ہتھیار بھی نہیں ہیں۔ میرا پستول اور گولیاں اور ایک گرینیڈ آپ کے پاس ہے۔ میں بھاگ کر موت کے منہ میں نہیں جانا چاہتا۔ آپ اوورکوٹ مجھ پر ڈال دیجیے، آپ کی کرپا میرا مطلب ہے مہربانی۔'' یہ کہہ کر وہ خیمہ کے اندر فرش پر لیٹ گیا اور کیپٹن تنویر نے اُس کا اوورکوٹ اس پر ڈال دیا۔

تھوڑی دیر میں اس کے خراٹوں کی آواز آنے لگی۔ دور اُفق پر روشنی کی لکیر پھیل گئی۔ دن چڑھ رہا تھا۔

حادثہ

میجر نے سوچا کوئی چال نہ ہو۔ دشمن بات کرے انہونی۔ ممکن ہے کرنل دھنی رام نے جان بوجھ کر دلدّر سنگھ کو بھیجا ہو۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکتا۔ دلدّر سنگھ تھکاوٹ سے بے حال ہو رہا ہے۔ وہ بھوکا بھی تھا پیاسا بھی تھا ممکن ہے اُسے سردی بھی لگ چکی ہو۔ یہ سب کچھ ٹھیک سہی لیکن احتیاط بہرحال ضروری ہے۔ چائے پیتے ہوئے اُس نے کیپٹن سے کہا۔

''تنویر! تم اور ابراہیم کرنل دھنی رام اور اُس کے ساتھیوں کو تلاش کرو۔''

''دھنی رام کے ساتھ دو آدمی ہیں۔ ایک کرپا سنگھ اور دوسرا سوہن سنگھ دونوں سکھ ہیں۔'' دلدّر سنگھ نے لیٹے لیٹے کہا۔

''اگر چائے پینا چاہتا ہے تو اُٹھ کر بیٹھ جا'' میجر نے دلدّر سنگھ سے کہا۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔

''قسم واہگورو کی۔ آپ نے میری جان بچا لی، اگر آپ نہ ملتے تو میں بلک بلک کر مر جاتا۔ خدا نے آپ کو فرشتہ بنا کر بھیجا۔'' وہ بولا۔

میجر نے اُسے چائے کا کپ دیا اور پھر پوچھا۔

''تم لوگ تعداد میں چھ تھے۔ کرنل دھنی رام، دلدّر سنگھ یعنی تم، کرپا سنگھ، مکھن سنگھ، سوہن سنگھ اور دھیان سنگھ، کرنل دھنی رام کے ساتھ ہیں۔ کرپا سنگھ اور سوہن سنگھ۔ باقی دو یعنی دھیان سنگھ اور مکھن سنگھ کہاں ہیں؟''

''میرا خیال ہے آپ اُن کو جان سے مار چکے ہیں۔ وہ غار میں تھے قیدیوں کے پاس۔ میرا خیال ہے قیدی آزاد ہو چکے ہیں اور دھیان سنگھ اور مکھن سنگھ مر چکے ہیں آپ کی گولیوں سے۔ دلدّر سنگھ نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

''تمہارا خیال درست ہے۔ وہ مر چکے ہیں۔'' میجر نے کہا۔

''شروع سے میرا خیال تھا کہ یہ مشن کامیاب نہیں ہوسکتا'' دلدّر سنگھ نے کپ ایک طرف رکھتے ہوئے کہا ''اس کی وجہ یہ تھی کہ اس مشن کی بنیاد لالچ پر رکھی گئی تھی۔ بھلا چار پانچ سو سال پرانا خزانہ اب کیسے مل سکتا ہے۔ ہمیں تو پہلے بتایا گیا تھا کہ برفانی پہاڑوں کے اندر پاکستان ایٹم بم بنا رہا ہے اور پھر جس رات ہمیں روانہ ہونا تھا اُس رات پتہ چلا کہ ہم خزانہ لوٹنے کے لیے جا رہے ہیں۔'' دلدّر سنگھ باتیں کرنے کے موڈ میں تھا۔

''کرنل دھنی رام نے اپنے ساتھ ہندو فوجی کیوں نہیں لیے؟'' سارے سکھ فوجی کیوں لیے؟'' کیپٹن تنویر کے ذہن میں یہ سوال بار بار آ رہا تھا۔ چنانچہ اُس نے پوچھ لیا۔

''پکّا پتہ نہیں مجھے۔ میرا خیال ہے وہ ہم سکھوں کو زیادہ سخت جان سمجھتا ہے یا یہ بات ہے کہ اگر ہم مر جائیں تو ہندو قوم کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔'' وہ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بولا ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ ہم کو برفانی انسانوں کے روپ میں پیش کرنا چاہتا تھا ہمارے سروں پر لمبے لمبے بال ہیں برفانی انسانوں کے سروں پر بھی لمبے لمبے بال ہوتے ہیں۔ ہماری داڑھیاں ہیں۔ برفانی انسانوں کی بھی داڑھیاں ہوتی ہیں لیکن ہم اوور کوٹ پہنتے ہیں۔ برفانی انسان اوور کوٹ نہیں پہنتے۔ دراصل مجھے پکا پتہ نہیں کہ اُس نے صرف ہم سکھوں کو یہاں لانے کے لیے کیوں چنا۔''

''اگر کرنل دھنی رام مل گیا تو اُس سے پوچھ لیں گے۔'' میجر نے کہا۔

''اگر اجازت دیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ پرسوں رات ہم کہاں سے بچھڑے تھے۔'' دلدّر نے کہا۔

''چلیے بتائیے۔'' میجر نے کہا اور چاروں چل پڑے۔

برف پر نصف میل چلنے کے بعد دلدّر سنگھ ایک جگہ کھڑا ہو گیا اُس نے دور اشارہ کیا جہاں برف کے بڑے بڑے تودے پڑے تھے اور برفانی ستون کھڑے تھے۔

ہم وہاں پر جا رہے تھے۔ وہ گلیشیر ہے۔ اچانک بڑے بڑے تودے لڑھکنے لگے۔ وہ تینوں پرلی طرف بھاگ گئے اور میں اس طرف بھاگا۔ اسی بھاگ دوڑ میں میں ایک بہت گہری دراڑ میں گر پڑا۔ ساری رات وہاں پڑا رہا اور اگلے دن نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔ قسمت اچھی تھی کہ کسی طور ہزاروں بلکہ لاکھوں من برف سے نکل کر اوپر آ سکا۔

''ممکن ہے وہ برف کے نیچے آ گئے ہوں۔'' میجر نے دلدّر سنگھ سے پوچھا۔

''ممکن ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بھی میری طرح کسی دراڑ کے ذریعے لاکھوں من برف کے نیچے آ گئے ہوں۔'' دلدّر سنگھ نے کہا۔

''چلو چل کر دیکھتے ہیں'' میجر نے کہا اور اُس طرف چل دیا جہاں برف کے بڑے بڑے تودے پڑے تھے۔ یہ تودے ایک پہاڑی سے گرے تھے۔ یہ کوئی آوالانچ نہ تھا۔

جس جگہ ان کو پہنچنا تھا وہ جگہ بظاہر قریب دکھائی دیتی تھی لیکن اصل میں دور تھی۔ دلدّر سنگھ نے ایک آدمی دیکھا اور بولا۔

''یہ سوہن سنگھ ہے'' دلدّر سنگھ نے سوہن سنگھ کا پستول اور گرینیڈ اس کے جسم سے اتار کر میجر کے حوالہ کر دیئے اور پھر اوورکوٹ اتارنے لگا۔ جب اتار چکے تو اُسے کندھے پر رکھ لیا۔

وہ چاروں اب کرنل دھنی رام اور کرپا سنگھ کو تلاش کرنے لگے لیکن وہ دونوں نہ ملے۔ اسی دوران میں اُن کو برفانی انسانوں کے پیروں کے نشانات دکھائی دیئے جو پہاڑ کی چوٹی کی طرف جاتے ہوئے مٹ گئے تھے۔

یہ برفانی انسانوں کے پیروں کے نشان ہیں۔ میرا خیال ہے کرنل دھنی رام اور کرپا سنگھ کو برفانی انسان چُوری کی طرح کھا چکے ہوں گے۔

وہ چاروں واپس آ گئے۔ کھانا تیار کیا، کھایا اور باری باری نماز پڑھنے کے بعد اُس طرف چل دیئے جس طرف سے کل دلدّر سنگھ آیا تھا۔

دلدّر سنگھ نے وہ دراڑ دکھائی جس میں سے وہ نکلا تھا۔ یہ دراڑ اژدھے کے منہ کی طرح تھی۔ وہ اِس کے قریب کھڑے ہو کر نیچے جھانکنے لگا۔ اُن کے دیکھتے دیکھتے برف اُس کے نیچے سے کھسکی اور وہ دھڑام سے نیچے جا پڑا۔ اُس کے گرنے سے کچی برف میں جنبش ہوئی اور برف کے بڑے بڑے تودے کھسکنے اور پھر ہلنے جلنے لگے۔ اُسے موت کے منہ سے کوئی نہ بچا سکا۔

وہ تینوں جان بچانے کے لیے بھاگے اور جب ایک فرلانگ دور جا کر دیکھا تو آوالانچ تیزی سے نیچے ڈھلان پر سے دوڑ رہا تھا۔ چند سیکنڈوں میں ہزاروں من برف اُس جگہ آ چکی تھی جہاں وہ کھڑے تھے اور وہ دراڑ جس میں دلدّر سنگھ گرا تھا پُر ہو چکی تھی۔

وہ کچھ دیر ہیبت زدہ کھڑے رہے اور پھر میجر کیمپ کی طرف روانہ ہو گئے۔

طبی وفد

سلطان اور کیپٹن امانت چلو جا کر ایک ڈاکٹر، ایک نرس اور بروق پا کی بیوی جوہان کو لے کر غار کی طرف چل پڑے تھے، اُن کے ساتھ تین پورٹر بھی تھے۔ پورٹر وہ قُلی ہوتے ہیں جو سامان اُٹھا کر پہاڑ پر آتے ہیں جو قُلی اونچے اونچے پہاڑوں پر چڑھتے ہیں اُن کو ہائی الٹی چیوڈ پورٹر کہا جاتا ہے یعنی اونچی بلندی پر جانے والے قُلی۔

کیپٹن امانت کے پاس روزنامہ صدائے وطن راولپنڈی کا ایک پرچہ بھی تھا جس میں مہم کی خبر لگائی گئی تھی۔

سرمو (ہمارے خاص نمائندہ کے قلم سے) اطلاع ملی ہے کہ برفانی انسان کو پکڑنے کے لیے پروفیسر الیگزنڈر کی سرکردگی میں جو مہم گولڈن ٹاور چند دن پہلے روانہ ہوئی تھی اُس نے اپنا بیس کیمپ ساڑھے سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر قائم کیا ہے۔ یہ کیمپ ایک چھوٹے گلیشیر پر قائم کیا گیا ہے جس کے ایک طرف ایک گہرا نالہ ہے اور دوسری طرف ایک اونچا پہاڑ ہے۔

یہ علاقہ (جس جگہ کیمپ قائم کیا گیا) درندوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں برفانی چیتا، بھورا ریچھ، سیاہ گوش اور یاک عام ملتے ہیں۔ ان درندوں کا شکار کر کے برفانی انسان اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور اگر شکار نہ ملے تو پھر گھاس پات کھاتے ہیں بشرطیکہ گھاس پات دستیاب ہو۔ جب کھانے کو کچھ نہیں ملتا تو وہ بستیوں کا رُخ کرتے ہیں اور پالتو جانوروں اور انسانوں پر حملہ کرتے ہیں۔

اِس بار برفانی انسان پکڑنے کے لیے کڑے انتظامات کیے گئے ہیں اور اُمید ہے کہ پروفیسر الیگزنڈر جو معلومات حاصل کریں گے اُن کو سائنس کی روشنی پر پرکھا جائے گا۔

یہ خبر فضول تھی کیونکہ اس میں کوئی بات بھی درست نہیں تھی۔ پروفیسر الیگزنڈر بیمار تھا اور

اس کی قیادت ناکام ہو چکی تھی۔

طبی وفد تین دنوں کے سفر کے بعد غار میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے پروفیسر کو دیکھا تو بولا۔

''اگر پروفیسر کو آج شام تک دوائی نہ ملتی تو وہ مر جاتا۔''

ڈاکٹر نے اُسے ٹیکہ بھی لگایا اور کھانے کے لیے دوائی بھی دی۔ وہ مرغیوں کا گوشت ساتھ لائے تھے چنانچہ ان کو یخنی بھی پلائی گئی۔

بروق پا نے جب جوہان کو دیکھا تو اُسے یقین ہو گیا وہ بچ جائے گا۔ جوہان نے اُسے لحاف میں لپیٹا جو وہ ساتھ لائی تھی۔ اس کو دباتی رہی اور اس سے بلتی میں باتیں کرتی رہی۔ اُس نے اُسے بار بار یخنی اور دوائی پلائی۔ وہ جلد ٹھیک ہونے لگا اور اس کی صحت یابی کی رفتار تیز ہو گئی۔ بروق پا پروفیسر کے مقابلہ میں جلدی صحت یاب ہو رہا تھا کیونکہ وہ پروفیسر کی نسبت سخت جان تھا۔

''پروفیسر الیگزنڈر اور بروق پا تو بچ جائیں گے لیکن میجر کیپٹن اور ابراہیم کی بھی کوئی خبر ہے یا نہیں؟'' سلطان نے کیپٹن شامی سے پوچھا۔

''میری ڈیوٹی یہ تھی کہ ان کی حفاظت کروں اس لیے میں کہیں نہیں جا سکا۔ نہ مجھے میجر صاحب کی طرف سے کوئی اطلاع ملی ہے۔'' کیپٹن شامی نے بتایا۔

''ہمیں چاہیے کہ ہم ان کا پتہ کریں۔'' سلطان نے کیپٹن امانت کو مشورہ دیا۔

''ہمارا آج یہاں سے چلنا درست نہیں کیونکہ شام ہو رہی ہے اور پھر آپ تھک چکے ہوں گے کیوں نہ ہم کل صبح روانہ ہوں۔ رات آرام کر لیں گے۔'' کیپٹن امانت نے تجویز پیش کی۔

''بالکل ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب، مائیکل، نرس اور جوہان بی بی مریضوں کا خیال رکھیں گے اور کیپٹن شامی ان کی حفاظت کریں گے۔''

''بالکل ٹھیک۔'' کیپٹن امانت اور کیپٹن شامی نے کہا اور شام کا انتظار کرنے لگے لیکن وہ اگلے دن روانہ ہو سکے کیونکہ برف کے طوفان نے ان کو غار سے باہر نہ نکلنے دیا اور جب یہ طوفان تھما تو چاروں طرف تین تین گز برف پڑی ہوئی تھی جو کچی تھی اور جس پر چلنے سے مسافر اُس کے اندر کمر تک دھنس جاتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے میجر، کیپٹن تنویر اور ابراہیم کی تلاش میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کے برعکس طے پایا کہ اگر برف ٹھوس ہو گئی تو مریضوں کو نیچے لے جائیں گے چنانچہ طبی وفد کے آنے کے تیسرے دن مریض سُرمو روانہ ہوئے اور کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت بھی ان کے ساتھ سُرمو چلے گئے۔

بلزرڈ

برف کا طوفان جسے بلزرڈ کہا جاتا ہے گولڈن ٹاور کے تمام ایریا میں آیا تھا۔ میجر، کیپٹن اور ابراہیم سونے کی تیاری کر رہے تھے کہ تیز ہوا چلنے لگی اور اس کے ساتھ برف باری شروع ہو گئی۔ آہستہ آہستہ ہوا کی تندی میں تیزی آتی رہی اور برف باری کی تہہ موٹی ہوتی چلی گئی۔ اُن کے خیمے کی طنابیں ڈولنے لگیں اور خیمے سے ہوا ٹکرا کر شور شور کرنے لگی۔ جوں جوں رات بیتنے لگی بلزرڈ کی تندی اور تیزی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اردگرد کے پہاڑوں پر بادل گرجنے لگے اور برف کے تودے گرنے لگے۔

آسمان پر چاند نکل آیا تھا لیکن برف باری کی وجہ سے نظر نہیں آ رہا تھا۔ البتہ اس کی بھوری روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اندھیرا جو رات کو آندھی اور طوفان کی وجہ سے میدانی علاقوں میں چھا جاتا ہے، گولڈن ٹاور کے ایریا میں دکھائی نہ دے رہا تھا اور اگر اس اندھیرے کا کوئی نام ہو سکتا ہے تو اسے دودھیا اندھیرا یا بھورا اندھیرا کہا جا سکتا ہے۔

صبح تین بجے خیمے کے باہر مضبوط قدموں کی چاپ سنائی دی۔ محسوس ہوتا تھا کوئی بوجھل قدموں سے باہر کھڑا ہے۔ اس سے پہلے کہ میجر سنبھلتا، خیمے کا پردہ چاقو سے پھاڑ دیا گیا اور ٹارچ کی روشنی نے میجر اور کیپٹن کے چہروں کو نکھار دیا۔ وہ سلیپنگ بیگ میں سوئے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے اتنی تیزی سے بستروں سے نہیں نکل سکتے تھے کہ پستول یا ریوالور سے ان دو آدمیوں پر فائر کریں جو اُن کے سامنے پستول تانے کھڑے تھے۔ اُن دونوں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو ایک بھاری بھرکم آواز نے رُعب سے کہا۔

''اُٹھو نہیں۔ لیٹے رہو'' دونوں میں سے ایک آدمی خیمے کے اندر جھک کر آیا اور اُس نے

میجر اور کیپٹن کے سرہانے پڑے ہوئے ہتھیار اُٹھا کر پیچھے کھڑے آدمی کو دے دیئے۔

''تم کون ہو؟'' اسی بھاری بھرکم آواز نے پھر پوچھا۔

''ہم کوہ پیما ہیں اور گولڈن ٹاور کو سر کرنے آئے ہوئے ہیں۔'' میجر نے بتایا۔

''تم کتنے دنوں سے یہاں پڑے ہو؟ اس آواز نے سوال کیا۔

''ہم یہاں کل آئے ہیں۔'' میجر نے جھوٹ بولا تاکہ سوال کرنے والے کو صحیح پتہ چل سکے۔

''تم کچھ ایسے لوگوں کو جانتے ہو جو یہاں کہیں غار میں چھپے ہوئے ہیں میرا مطلب ہے ایسے کوہ پیما جو موسم کی خرابی کی وجہ سے غار میں رہنے پر مجبور ہوں۔''

''کیسا غار؟'' غار دو قسم کے ہوتے ہیں پتھریلا غار اور برف کا غار، ویسے ہم نے کسی شخص کو کسی غار میں نہیں دیکھا۔'' میجر بولا۔

''کسی اور شخص کو بھی نہیں دیکھا آپ نے اِدھر؟'' اُسی آواز نے بے چینی سے پوچھا۔

''نہیں ہم کل آئے تھے یہاں۔ یہ ہمارا تیسرا کیمپ ہے۔ بیس کیمپ، کیمپ نمبر ا، اور کیمپ نمبر ۲ کے دوران میں ہم نے کسی کو نہیں دیکھا۔ آپ کون صاحب ہیں؟'' میجر نے سوال کیا۔

''ہم بھی کوہ پیما ہیں۔ ہم چھ آدمی ہیں۔ ہمارے دو آدمی پیچھے ہیں کیمپ نمبر ۲ میں اور ہم چار آگے آئے ہیں۔ دو ہم سے بچھڑ گئے اُن کا پتہ لگانا چاہتے ہیں۔'' وہی بھاری بھرکم آواز بولی۔

''اگر آپ کوہ پیما یا کوہ نورد ہیں تو پھر یہ پستول کیوں تانے ہیں ہم پر؟ ہم بھی تو کوہ پیما ہیں۔ دونوں مل کر گولڈن ٹاور کو سر کریں گے، ہمارے پاس کھانے پینے کے لیے جو کچھ ہے اُس میں آپ برابر حصہ لے لیجیے۔ اگر اس وقت بھوک لگی ہے تو ہمارے پاس جما ہوا سالن، ہنٹر بیف، ڈبل روٹی، بند، دلیا، کارن فلیک، اچار، چٹنی، دودھ، چائے، کافی یعنی کھانے پینے کی کافی چیزیں ہیں۔ پیاس لگی ہو تو برف کو تیل کے چولہے پر گرم کر کے پانی بنایا جا سکتا ہے۔'' میجر نے اُن کو بتایا۔

وہ دونوں اُن دونوں کے سروں پر پستول لیے بیٹھے تھے۔ اُن کی پُشت اب اُس دروازہ کی طرف تھی جو پھاڑ کر وہ اندر آئے تھے۔ اُن کی پیٹھ پر تیز و تند برف آلود ہوا کے تھپیڑے ٹکرا رہے تھے لیکن اُن کو ذرا بھر معلوم نہ تھا کیونکہ انہوں نے جرسیاں، ڈبل کوٹ، اوور کوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ایک کا نام کرنل دھنی رام تھا اور دوسرا کرپا سنگھ۔

تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آ گیا۔

میجر نے سوچا۔ ہم ان دونوں کو تلاش کر رہے تھے اور وہ دونوں ہمارے گھر آ گئے ہیں لیکن جان لیوا ہتھیاروں سے بند ہو کر نہ معلوم ابراہیم کہاں گیا؟ پہرے پر وہ تھا۔

''وقت کیا ہو گا جناب؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

وہ جو قریب بیٹھا تھا اور جو باتیں کر رہا تھا بولا ''یہی کوئی ساڑھے تین بجے ہوں گے صبح کے'' اُس نے گھڑی دیکھنے کی تکلیف گوارہ نہ کی تاکہ میجر اور کیپٹن سے نگاہ ہٹ نہ جائے۔

''آپ ہمیں اُٹھنے کیوں نہیں دیتے؟'' کیپٹن تنویر نے زور سے کہا تاکہ اُس کی بلند آواز ابراہیم سن لے جو ساتھ والے خیمے میں ہو سکتا ہے۔ یہ خیمہ جو بڑے خیمہ کے پیچھے تھا، باورچی خانہ بنایا گیا تھا اور ابراہیم اس میں رہ کر یا سو کر خوشی محسوس کرتا تھا۔ بڑے خیمے میں اُسے آداب کا خیال رکھنا پڑتا تھا اور چھوٹے خیمہ یعنی باورچی خانہ میں وہ ایک عام دیہاتی کی طرح لاپرواہ ہو کر سوتا تھا۔

''تم لوگ کوہ پیما نہیں ہو۔ تم پاکستان آرمی کے افسر ہو۔ تمہارے ہتھیاروں سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے ہم تم کو ختم کر کے ہی آگے یا پیچھے جا سکتے ہیں۔'' کرنل دھنی رام گمبھیر آواز میں بولا۔

''آپ لوگ کون ہیں!'' میجر نے پوچھا۔

''پہلے یہ بتاؤ کہ میں نے جو کچھ کہا ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟'' کرنل نے پھر پوچھا۔

اس سے پہلے کہ میجر یا کیپٹن جواب دیتے، ریوالور کی تابڑ توڑ گولیاں چلیں۔ ڈشوں، ڈشوں اور کرپا سنگھ منہ کے بل گرا۔ کرنل نے فائر کیا لیکن میجر اور کیپٹن نے بجلی کی تیزی سے جھپٹ کر اُسے قابو کر لیا۔ ابراہیم تیزی سے آگے بڑھا اور اُس نے کرنل پر فائر کرنا چاہا لیکن میجر نے ڈانٹا۔

''بے وقوف۔ گولی نہ چلانا!!''

چند منٹ کے اندر اندر کرنل دھنی رام رسیوں میں بندھا تھا اور اس کی گٹھڑی بڑے خیمے کے کونے میں پڑی تھی۔ کرپا سنگھ کی لاش کیپٹن نے گھسیٹ کر خیمے سے کچھ دور پرے کر دی تھی جس پر برف کی موٹی تہہ جم رہی تھی۔

''آپ دونوں قیدی کی نگرانی کریں، میں چائے بناتا ہوں۔'' کیپٹن نے کہا اور چھوٹے خیمہ کی طرف چلا۔

''برف کا پانی زیادہ تیار کرلیں۔ نماز کا وقت ہونے والا ہے۔ نماز پڑھیں گے باجماعت کیوں ابراہیم؟'' میجر نے خوش ہوکر کہا۔

''یس سر!'' ابراہیم خوشی سے بولا اور پھر کرنل دھنی رام کو گھورنے لگا۔

نقشہ

''بہادر بے وقوف لڑکے تو تو پہرہ دے رہا تھا۔ دو بجے کے بعد تیری ڈیوٹی تھی پہرے پر۔ پھر تو ڈیوٹی چھوڑ کر کہاں چلا گیا؟'' میجر نے ابراہیم سے پوچھا۔

''سر! میں نے پونے تین بجے تک پہرہ دیا۔ برف باری تیز ہوگئی۔ ساتھ ساتھ پہاڑوں پر سے برف کے تودوں کے گرنے کی آوازیں لگاتار آنے لگیں۔ میں نے سوچا ایسے خراب موسم میں انسان یا حیوان کیسے آئے گا اِدھر۔ مجھے ٹھنڈک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے دل میں کہا کہ بے کار بیٹھنے سے یہ بھلا ہے کہ چائے تیار کروں۔ میں چھوٹے خیمے میں چلا گیا اور تیل کا چولہا جلانے لگا۔ ماچس گیلی تھی۔ بہت کوشش کی مگر ماچس کی تیلی نہ جلی۔ تھک ہار کر میں کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔ باہر مسلسل شور تھا طوفان کا۔ پہاڑوں پر سے برف کے بڑے بڑے تودے گر رہے تھے میں کان لپیٹ کر لیٹا رہا۔ جب کیپٹن نے زور سے کہا کہ آپ ہمیں اُٹھنے کیوں نہیں دیتے تو میں سمجھ گیا گڑبڑ ہے۔ میں باہر آیا تو دیکھا کہ دو آدمی پستول تانے آپ دونوں پر نشانہ لیے بیٹھے ہیں۔ میرے قریب جو تھا میں نے اُس پر دو گولیاں چلائیں ریوالور کی اور وہ ٹھنڈا ہوگیا۔ دوسرے کو آپ نے پکڑ لیا۔'' ابراہیم بات ختم کرکے پھر کرنل دھنی رام کو گھورنے لگا۔

''صاحب جی! اللہ کارساز ہے۔ وہ سب سے بڑا، زندگی اور موت اُس کے ہاتھ میں ہے۔ یہ دونوں جان لینے آئے تھے۔ ایک دے چکا دوسرا یہ رسیوں میں جکڑا ہوا بے بس پڑا ہے۔'' ابراہیم نے نفرت سے کرنل کی طرف دیکھا۔ کیپٹن تنویر واپس آیا اور بولا۔

''وہ والی ماچس تو گیلی ہے کوئی اور ہو آپ کے پاس تو دے دیجیے۔''

میجر نے اپنی جیب سے ماچس نکالی اور کیپٹن کی طرف بڑھائی۔ ابراہیم نے ماچس اُچک لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میں چائے تیار کرتا ہوں اور وضو کے لیے پانی بھی۔ آپ، سر، کرنل سے باتیں کریں۔ وہ ماچس لے کر باہر نکل گیا۔

''سردی تو نہیں لگ رہی کرنل صاحب''؟ کیپٹن نے پوچھا۔

''لگ رہی ہے۔'' میجر نے کرپا سنگھ کا اوور کوٹ بھی اُس پر ڈال دیا۔

''بھوک اور پیاس کا کیا حساب کتاب ہے۔'' کیپٹن بولا۔

''دو دن اور دو رات سے بھوکا اور پیاسا ہوں؟'' وہ بولا۔

''چائے تیار ہو رہی ہے۔ اُس کے ساتھ مکھن لگا سلائس اور ہنٹر بیف کھا لیں بھوک کا علاج ہو جائے گا۔'' میجر نے کہا۔

''کرنل دھنی رام! آپ نے ٹھیک خیال کیا تھا کہ ہم فوجی ہیں کوہ پیما نہیں ہیں۔'' میجر نوری نے کرنل کو بتایا۔

''آپ میرا نام کیسے جانتے ہیں؟'' کرنل نے پوچھا۔

میجر نے بات سنی ان سنی کر دی اور بولا۔

''جس وقت غار میں آپ نے اور آپ کے گوریلوں نے پروفیسر الیگزنڈر اور دوسرے لوگوں کو قیدی بنایا اِس وقت یہ لڑکا جو چائے بنا رہا ہے، باہر تھا۔ غار کے باہر۔ اُس نے ساری کارروائی دیکھی بھی اور سنی بھی۔ وہ واپس آ گیا اور اِس کی اطلاع پر ہم لوگ آپ لوگوں کو تلاش کرنے کے لیے آئے۔ آپ کے دو ساتھی دھیان سنگھ اور مکھن سنگھ غار کے اندر اور غار کے باہر پرلوک سدھار گئے۔ ایک گوریلا سوہن سنگھ برف کے تودے کے نیچے آ کر مر گیا۔ دلدّر سنگھ بعد میں ہمارے پاس آیا اور پھر ایک دراڑ میں گر کر مر گیا۔ پانچواں گوریلا کرپا سنگھ تھا وہ آپ کی آنکھوں کے سامنے شوٹ ہوا ہے۔ ابراہیم کی گولی سے اور اِس کی لاش اب تک برف میں دب گئی ہو گی۔ آپ کے ساتھ پانچ گوریلے تھے اور پانچوں سکھ تھے۔ آپ نے ان کو کیوں چنا؟''

''شریمان! یہ باتیں اب بتانے کا وقت نہیں ہے بہرحال بتا دیتا ہوں کہ میں نے سکھ فوجیوں کو اس لیے چنا تھا کہ یہ سخت اور سخت جان ہیں۔ بے وقوف ہیں۔ وفادار ہیں اور لالچی

نہیں ہوتے اور کوئی بات نہیں تھی۔''

''لیکن ان کی کوئی خوبی بھی آپ کے کام نہ آئی۔'' میجر نے اُسے کہا۔

''میرا اندازہ غلط نہ تھا۔ یہ سخت جان ہیں جس شدید اور سخت سردی سے ان کو واسطہ پڑا وہ ہندو سپاہی برداشت نہ کر سکتا تھا۔ بے وقوفی کا یہ عالم ہے کہ میری ہر بات بغیر سوال کیے انہوں نے دل سے مانی۔ ان کی وفاداری بھی شک اور شبہ سے دور تھی اور رہی یہ بات کہ لالچی نہیں تھے تو اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ نہ ہم خزانہ تک پہنچے اور نہ ہمیں خزانہ ملا۔'' کرنل افسردہ لہجہ میں بولا۔

''یہ خزانہ ہے کہاں؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''یہ خزانہ ہے علی شیر خاں دی گریٹ کا۔ وہ بہت بڑا بادشاہ ہو گذرا ہے سترھویں صدی کا۔ وہ ہیرے موتی جواہرات اور سونا لوٹ کر لایا تھا لہاسہ سے اور لہہ سے۔ لہاسہ تبت کا سب سے بڑا شہر ہے اور لہہ لداخ کا سب سے بڑا شہر۔ وہ خزانہ ساتھ نہ لے جا سکا۔ سکردو اس پہاڑ کے ایک غار میں چھوڑ کر بلتزہ اور چترال کی بغاوت مٹانے کے لیے چلا گیا اور پھر لڑائیوں میں اتنا مصروف ہوا کہ اُسے خیال ہی نہ رہا کہ اُس نے کسی پہاڑ کے نیچے کسی غار میں خزانہ دفن کیا تھا۔

''یہ ساری باتیں کہاں سے سنیں آپ نے؟'' میجر نے پوچھا۔

میں نے یہ باتیں سُنی نہیں پڑھی ہیں۔ میں بلتستان، لداخ، تبت اور کشمیر کی تاریخ کا سکالر ہوں اور بلتستان، لداخ اور تبت کی تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے۔ بلتزہ اور چترال کی تاریخوں کے مطالعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ علی شیر خاں دی گریٹ کوئی بادشاہ ہوا ہے۔ میں نے تو لندن اور پیرس کے کتب خانوں میں اور عجائب گھروں سے بھی مدد لی ہے۔ اب جب کہ میرا مشن ناکام ہو گیا ہے میں وہ نقشہ بھی آپ کو دینے کو تیار ہوں جو میرے پاس ہے اور جو میں نے گہرے مطالعہ کے بعد تیار کیا ہے۔'' کرنل نے کہا۔

''ہمیں نقشہ کی ضرورت نہیں۔ کیا کریں گے نقشہ لے کر۔ ہم کون سا خزانہ تلاش کرنے آئے ہیں؟'' میجر نے رکھائی سے کہا تو کیپٹن تنویر بول اُٹھا۔

''نقشہ تو میرے پاس ہے۔ میں نے کرنل دھنی رام کی تلاشی کے دوران میں ایک نقشہ نما چیز بھی نکالی تھی۔ ان کی گرم قمیض کی جیب سے۔''

''بس بس وہی۔ وہی نقشہ ہے خزانہ کا'' کرنل دھنی رام جلدی سے بولا۔

''سر، کون سا خزانہ اور کون سا نقشہ؟'' ابراہیم چائے اندر لاتے ہوئے پوچھنے لگا۔

''پہلے چائے پلاؤ پھر بتاتے ہیں تجھ کو کیپٹن تنویر نے کہا اور کپ پکڑ کر میجر کی طرف بڑھایا۔

''کرنل دھنی رام کا دایاں بازو کھول دو تا کہ چائے پی سکیں اور ہاں ان کو کھانے کو ہنٹر بیف دو۔''

میجر نے ابراہیم کو حکم دیا۔

طوفان تھم جاتا ہے

جب سورج نکلا اُس وقت چاروں طرف سکوت تھا ایسے جیسے رات کچھ ہوا ہی نہیں۔ برف باری کا طوفان تھم گیا تھا اور آسمان صاف تھا۔ ہر طرف برف ہی برف تھی جو کچی تھی۔ کچی برف میں سے چلنا دشوار ہوتا ہے۔ اس لیے سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی رخ سفر اختیار کریں۔ کچی برف تازہ ہوتی ہے جسے بلتی لوگ خاہ کہتے ہیں اور پرانی پختہ برف کو کنگ کہا جاتا ہے۔ گنگری کا مطلب ہے پرانی پختہ برف کی چوٹی جیسے شرپی گنگری۔

میجر نوری نے سوچا اُن کا ایک مشن کامیاب ہو گیا ہے۔ کرنل دھنی رام قید کر لیا گیا ہے اور اُس کے ساتھی گوریلے موت کے حوالے ہو چکے ہیں۔ کرنل دھنی رام کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ اُسے آزاد کر دیا جائے؟ نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اُسے گولی مار دی جائے یہ ہو سکتا ہے۔ یہ مناسب سزا ہو گی کہ اُسے شوٹ کر دیا جائے اُسے سکردو پولیس کے حوالہ کر دیا جائے یہ بھی ہو سکتا ہے۔ بلا اجازت ملک کے اندر آنے والوں پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے لیکن کرنل دھنی رام صرف ملک کے اندر ہی داخل نہیں ہوا تھا۔ وہ تو ملک کو لوٹنے کے لیے آیا تھا۔ لٹیروں کی کیا سزا ہوتی ہے؟ اُس نے اپنے دل سے سوال کیا۔ گولی اور کیا؟ میجر کے دل نے جواب دیا۔

''کیپٹن تنویر، کرنل دھنی رام کو کیا سزا دی جائے؟'' میجر نے پوچھا۔

''بہتر ہو گا کرنل دھنی رام سے پوچھا جائے۔'' کیپٹن نے کہا۔ وہ غیر سنجیدہ موڈ میں تھا۔

''کرنل! سنا تم نے؟ کیا کہا کیپٹن تنویر نے؟'' میجر نے کرنل سے مخاطب ہو کر کہا۔

''سنا ہے میں نے۔ میری سزا گولی ہے اور میں چاہوں گا کہ مجھے گولی کی سزا دی جائے۔ میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہیں مرنا چاہتا۔'' کرنل دوٹوک لہجہ میں بولا۔ کچھ دیر سوچ میں

ڈوبا رہا پھر بولا۔

''میں نہیں چاہتا آپ مجھے کسی دراڑ کے ذریعے ہزاروں لاکھوں من برف میں پھینک دیں یا مجھے کسی چھاؤنی کے قید خانہ میں ڈال کر سال دو سال پوچھ گچھ کرتے رہیں۔

ابراہیم کیپٹن تنویر سے نقشہ لے کر اُسے غور سے دیکھ رہا تھا وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ میجر اور کرنل میں جو مکالمہ بازی ہو رہی تھی اُسے اس سے دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو نقشہ کو ہی دیکھے جا رہا تھا۔

نقشہ صاف تھا۔ وہ گلیشیر نمبر۲ پر بیٹھے تھے جو تقریباً بیس ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ اکیس ہزار فٹ کی بلندی پر آئس فال تھا یعنی آئس فال سے کسی وقت بھی برف گر کر تباہی لا سکتی ہے۔ آئس فال سے اوپر گلیشیر نمبر۳ کی لائی ہوئی بجری کی موٹی اور وسیع تہہ تھی جو بائیس ہزار فٹ کی بلندی پر تھی اس سے اوپر ایک اور آئس فال تھی جس کا تعلق ٹیڑھی چوٹی سے تھا۔ ٹیڑھی چوٹی تئیس ہزار فٹ بلند تھی اس سے نو سو فٹ اوپر غار تھا جس میں سونا دفن تھا۔ اس غار سے اوپر گولڈن ٹاور کی چوٹی تھی جو پورے پچیس ہزار فٹ بلند تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ان سب کو سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی اور تھکاوٹ سے بدن چُور تھے۔

''سر، خزانہ کس جگہ ہے؟'' ابراہیم نے کیپٹن تنویر سے پوچھا۔

''کرنل۔ بتاؤ خزانہ کس جگہ دفن ہے؟'' کیپٹن نے سوال کرنل کی طرف لڑھکا دیا۔

''غار میں۔ کیوں کیا ارادہ ہے تیرا؟'' کیپٹن نے ابراہیم سے پوچھا وہ چپ رہا۔

''نقشہ چھوڑو اور کرنل سے پوچھو کوئی اور چیز تو نہیں چاہیے اُن کو۔'' میجر نے ابراہیم سے کہا لیکن ابراہیم نے کرنل سے کچھ نہ پوچھا اور اُسے نفرت سے گھورتا رہا۔ یوں جیسے کھا جائے گا اُسے۔

''اگر چائے کا ایک کپ اور مل جائے تو مزہ آ جائے اس وقت۔'' کرنل بولا۔

''جاؤ چائے لاؤ ایک کپ اور'' میجر نے ابراہیم کو حکم دیا اور وہ اُٹھ کر دوسرے خیمہ میں چلا گیا تاکہ میجر کے حکم کے پیش نظر چائے تیار کر سکے۔

''آپ کہاں سے آئے تھے؟'' میجر نے پوچھا۔

''میں پہلے لہہ میں تھا۔ اس کے بعد میرا تبادلہ کرگل ہو گیا۔ یعنی چھ ماہ پہلے۔ لہہ سے پہلے میں سونا مرگ میں تھا۔'' میں وہاں دو سال رہا۔ فوجیوں کو برفانی چوٹیوں پر چڑھنے کی

ٹریننگ دیتا تھا۔ کرنل دھنی رام نے بتایا۔

''صرف سونا مرگ ہی نہیں اور بھی تو ہیں آپ کے ٹریننگ سکول ہائی آلٹی چیوڈ ٹریننگ کے لیے۔'' میجر نے کہا۔

''ہاں کئی ہیں۔ ہمارے کئی مرکز ہیں جہاں اونچی اونچی برف پوش چوٹیوں کو سر کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ہم تو اپنے فوجیوں کو قطب شمالی اور قطب جنوبی میں بھی ٹریننگ دلواتے ہیں تاکہ وہ برفانی حالات کا مقابلہ کر سکیں۔ اگر یوں نہ کرتے تو سیاچن گلیشیر پر قبضہ کیوں کر کرتے۔'' کرنل دھنی رام نے طنز کیا تھا۔ میجر نے طنز کی کاٹ واضح طور پر محسوس کی۔

''آپ کی کامیابی کا انحصار دھوکہ پر تھا۔ اس بات پر نہیں کہ آپ کے فوجی زیادہ تربیت یافتہ تھے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں کہ ہم نے دھوکہ دیا لیکن آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ خود آپ کے پیغمبر نے فرمایا ہے کہ لڑائی دھوکہ ہے۔'' کرنل پڑھا لکھا آدمی تھا۔ لیکن اس کی بات درست نہیں تھی۔

''حضور نبی اکرم ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ جنگ یا لڑائی دھوکہ ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جنگ چال ہے سٹریٹجی ہے۔'' کیپٹن تنویر بول پڑا۔

''ایک ہی بات ہوئی ناں۔ دھوکہ اور چال میں زیادہ فرق نہیں ہوتا میجر۔'' کرنل بولا۔

''دھوکہ دینا اور چال چلنا دو مختلف باتیں ہیں۔ شطرنج کی چال دھوکہ نہیں ہے۔'' کیپٹن نے خوشی سے کہا ''کشتی میں داؤ پیچ لڑانا دھوکہ نہیں ہے۔ یہی بات جنگ کی ہے۔''

''تھینک یو میجر۔ جنگ چال ہے دھوکہ نہیں ہے۔'' کرنل نے کہا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

''میں تھکا ہوا ہوں، اجازت ہو تو سو جاؤں؟'' کرنل نے میجر سے پوچھا۔

''ضرور'' میجر نے اُسے اجازت دی اور وہ لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔

فیصلہ

دوپہر کو کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت بھی اُن سے آ کر مل گئے۔ انہوں نے بتایا کہ پروفیسر الیگزنڈر، مائیکل، بروق پا، اس کی بیوی جوہان، ڈاکٹر، نرس اور رپورٹر واپس خپلو چلے گئے ہیں۔ سلطان اُن کے ساتھ گیا ہے۔ کیونکہ اُسے راستے کا پتا تھا۔ وہ کسی دوسرے راستہ سے جانا چاہتے تھے جو ذرا لمبا تو ہے لیکن دشوار نہیں ہے۔

کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت کھانے پینے کی چیزیں اور نمونیہ کی دوائیاں بھی لائے تھے۔ جب ان کو بتایا گیا کہ دلدر سنگھ، سوہن سنگھ اور کرپا سنگھ مر چکے ہیں تو وہ حیران ہوئے۔ خیمہ میں کرنل دھنی رام کو دیکھ کر وہ اور زیادہ حیران ہوئے۔ جب اُن کو خزانہ کا نقشہ دکھایا گیا تو ان کی حیرت کی حد نہ رہی۔ اُن دونوں نے کہا کہ کوشش کرنی چاہیے خزانہ مل جائے ہم اتنے قریب آ چکے ہیں اگر اب بھی کوشش نہ کی تو ساری افسوس رہے گا کہ ہم نے کوشش نہ کی خزانے کے لیے۔

ابراہیم بار بار کیپٹن تنویر سے کہہ رہا تھا کہ خزانہ تلاش کرنا چاہیے۔

آخر سب کے کہنے پر میجر نوری مان گیا کہ کل صبح خزانہ کی تلاش کے لیے مہم روانہ ہوگی اور کرنل دھنی رام ساتھ جائے گا، ایک قیدی کی حیثیت سے۔

''اس مہم میں میری حیثیت کیا ہوگی؟'' کرنل نے پوچھا۔

''وہی جو قیدی کی ہوتی ہے۔ آپ ہمارے قیدی ہیں اور قیدی سے کوئی بھی کام لیا جا سکتا ہے۔'' میجر نے کہا۔

''اگر میں آپ کے ساتھ نہیں جا رہا تو بتا دوں غار تنگ جانے کے دو راستے ہیں، ایک وہ جو ذرا دشوار گذار ہے لیکن لمبا نہیں ہے اور دوسرا وہ جو لمبا ہے لیکن دشوار گذار نہیں ہے۔

چھوٹے اور دشوار گذار راستے میں برفانی انسان کی بستی ہے۔'' کرنل نے کہا۔

''کیا فضول باتیں کر رہے ہو'' کرنل کیپٹن تنویر نے کہا ''برفانی انسانی بستیاں بسا کر نہیں رہتے۔ وہ وحشی مخلوق ہے اور اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں میں گھومتی رہتی ہے، صبح کہیں شام کہیں اُن کے لیے چاروں چک جاگیر ہے۔''

''میں نے اُن کو دیکھا نہیں ہے۔ میں نے اُن کے متعلق صرف پڑھا ہے۔ فرانس کے جس شخص نے نقشہ تیار کیا ہے اس کے ہاتھ کی ایک تحریر بھی ملی ہے۔ برفانی انسانوں کے بارے میں وہ یہی لکھتا ہے کہ:

''برفانی انسان بستیاں آباد کر کے گولڈن ٹاور کے غاروں میں رہتے ہیں۔''

''کیا فضول بات ہے۔'' کیپٹن تنویر نے ہنس کر کہا۔

''اب جب کہ تم جا رہے ہو خود دیکھ لینا۔ مجھے تو شاید آپ جانے سے پہلے گولی مار دیں۔'' کرنل نے کہا۔

''ہم نے ابھی گولی مارنے کا فیصلہ نہیں کیا اگر تم ہمارے ساتھ چلو اور ایسی ویسی حرکت نہ کرو تو تم بھی برفانی انسانوں کی بستی دیکھ سکتے ہو۔'' میجر بولا۔

''تو کیا یہ طے ہو گیا کہ آپ مجھے ساتھ لے جائیں گے۔'' کرنل خوشی سے بولا۔

''طے ہو گیا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ جائیں لیکن اگر کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو آپ کو اُسی وقت گولی مار دی جائے گی۔'' میجر نے صاف الفاظ میں کرنل کو بتایا۔

''مجھے یہ بات منظور ہے۔ میں خود تو کامیاب نہیں ہو سکا ممکن ہے آپ کی وجہ سے میں دنیا کا سب سے بڑا خزانہ دیکھ سکوں۔ ایسا خزانہ جو لہہ اور لہاسہ کی عبادت گاہوں سے لُوٹا گیا تھا۔''

''یہ خزانہ لوٹا نہیں گیا تھا، تبت اور لداخ کے حکمرانوں نے تاوان جنگ کے طور پر علی شیر خاں انچن کو دیا تھا۔ آپ کہتے ہیں کہ آپ تاریخ کے طالب علم ہیں پھر آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ علی شیر خاں لٹیرا نہیں تھا بہادر بادشاہ تھا اور بہادر بادشاہ لٹیرے نہیں ہوتے۔'' کیپٹن نے غصہ سے کہا۔

''میں نے جو کچھ پڑھا بتا دیا۔ اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں آئندہ خزانہ کو تاوان جنگ کہوں گا۔ لوٹ کا مال نہیں کہوں گا۔'' کرنل نے آہستہ سے کہا۔

''کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت۔ آپ دونوں کرنل کی نگرانی کریں گے۔ ان کی رسیاں کھول دی جائیں اور کرنل! ایک فہرست بناؤ ایسی چیزیں جو ہمیں درکار ہوں گی راستہ میں مثلاً نائیلون کے رسّے۔''

کرنل پنسل اور کاغذ لے کر خیمہ کے اندر بیٹھ گیا۔

اُس رات اُن سب نے دن اور رات کا ایک بڑا حصّہ مہم کی تیاری میں گذارا۔ ایک ایک چیز کو دوبارہ چیک کیا اور اگلے دن جب برف پوری جمی ہوئی تھی اور سورج نکلنے میں ابھی دو گھنٹے تھے وہ چائے پی کر چل پڑے۔ اُن کے پاس کوہ پیمائی کی ہر چیز تھی سوائے گیس کے سلنڈروں کے۔

وہ سامنے تھے

وہ سارا دن سفر کرتے رہے بس دوپہر کو ایک گھنٹہ بجری پر آرام کیا اور کھانا کھایا۔ شام وہ گلیشیر نمبر ۳ پر پہنچ گئے۔ یہ سب سے بڑا گلیشیر تھا جو ڈیڑھ میل چوڑا تھا اور پندرہ میل لمبا۔ اس کی سمندر کی سطح سے بلندی ۲۳۰۰۰ فٹ تھی۔ ہوا میں آکسیجن کی کمی کی وجہ سے کرنل دھنی رام ساری رات کھانستا رہا۔ ابراہیم کا بھی برا حال تھا پھیپھڑے ٹھیک تھے لیکن شام کو اُس نے اچار اور چٹنی سے شغل فرمایا تھا۔

وہ کل چھ تھے، ایک خیمہ میں میجر، کیپٹن تنویر اور ابراہیم سوئے اور دوسرے خیمہ میں کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت اپنے قیدی کرنل کے ساتھ سوئے۔ طے یہ ہوا کہ آدھی رات تک شامی پہرہ دے گا اور اس کے بعد امانت کی ڈیوٹی ہوگی۔

آدھی رات کو شور سا بلند ہوا۔ کیپٹن شامی نے سب کو جگایا وہ خیموں سے باہر آ گئے۔ کرنل دھنی رام بھی اُن کے ساتھ آ کھڑا ہوا۔ جس جگہ اُن کے خیمے تھے اُس سے اوپر ٹیڑھی چوٹی کے نیچے دس بارہ برفانی انسان ناچ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ وہ سارے ان کو دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔

برفانی انسان کبھی ایک ٹانگ اُٹھا کر ناچتے کبھی کدکڑے لگاتے۔ کبھی ایک دوسرے سے معانقہ کرتے۔ کبھی برف کا گولہ بنا کر کسی دوسرے کو نشانہ بناتے۔ کبھی زور زور سے ہنستے۔ کبھی برف پر گر کر لوٹ پوٹ ہو جاتے اور کبھی منہ سے کھردری آوازیں نکالتے جیسے گا رہے ہوں۔ ان آوازوں میں نہ سریلا پن تھا اور نہ لے کاری۔ ہر آواز اوٹ پٹانگ تھی بے سُری اور بے تالی۔ عام انسانوں کے لیے اُن کی محفل موسیقی بے ڈھنگے شور وغل کے سوا کچھ نہ تھی۔

ایک گھنٹے تک ناچنے کودنے اور شور مچانے کے بعد وہ ایک طرف کو چل دیئے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

''اب آپ سمجھ گئے؟'' میجر نے پوچھا۔

''یہی کہ یہ لوگ خزانے کے وارث ہیں۔'' کرنل بولا۔

''کرنل! کیا فضول باتیں کرتے ہو۔ ان بے چاروں کو سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کی قدر و قیمت کا پتہ؟ یہ وحشی لوگ ہیں۔ ہیرے موتی ان کے کس کام کے؟ سونا چاندی ان کے کس کام کا؟ یہ کون سا زیور پہنتے ہیں۔ آپ چپ رہیں۔ ہمیں فضول باتیں نہ سنائیں۔'' کیپٹن تنویر کو کرنل دھنی رام کی ہر بات پر غصہ آ جاتا تھا یہ بات ابراہیم کو بُری لگتی تھی۔

وہ واپس آ گئے ار دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگے۔ برفانی انسانوں کا رقص دیکھ کر بھلا نیند کس کو آ سکتی تھی؟ پھر بھی سبھی لوگ سونے کی کوشش کرنے لگے سوائے کیپٹن امانت کے جو اب پہرہ پر کھڑا تھا۔ کرنل دھنی رام کی چوکیداری کے علاوہ اُسے وحشی انسان اور وحشی درندوں کا بھی خیال رکھنا تھا۔

آکسیجن کی کمی

صبح سویرے ناشتہ کرنے کے بعد وہ چل پڑے۔ وہ جس گلیشیر پر سے جا رہے تھے وہ برف کا دریا تھا۔ جمی ہوئی برف، یخ بستہ دریا، یہ دریا کئی سو فٹ گہرا تھا۔ اس گلیشیر پر کم از کم درجہ حرارت منفی اٹھارہ فارن ہائیٹ تھا۔

دوپہر سے پہلے وہ برف کے بڑے بڑے میناروں میں گھوم رہے تھے۔ اُن کو کئی پل عبور کرنا پڑے جو برف کے بنے ہوئے تھے۔ یہ پُل دراڑوں کے اوپر تھے۔ اُن سب نے ایک دوسرے کی کمر سے رسے باندھے ہوئے تھے تاکہ اُن میں سے کوئی گر پڑے تو دوسرے لوگ اُسے رسی کی مدد سے دراڑ سے نکال سکیں یا اگر کوئی شخص برف میں دھنس جائے تو وہ رسے کی مدد سے آگے یا پیچھے ہٹا سکے۔

دوپہر کو وہ آئس فال کے پاس پہنچ گئے جہاں گلیشیر ختم ہو جاتا ہے۔ ایک گھنٹہ آرام کرنے اور کھانا کھانے کے بعد چل پڑے۔ کرنل دھنی رام، کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت ہوا میں آکسیجن کی کمی کی وجہ سے وہ پریشان تھے۔ اُن کا سانس بار بار اُکھڑ جاتا تھا اور انہیں کچھ دور چل کر سانس لینے کے لیے رکنا پڑتا تھا۔ اس کے باوجود وہ شام کو ٹیڑھی چوٹی کے نیچے پہنچ گئے اور انہوں نے اپنا پانچواں کیمپ لگایا جو ۲۳۰۰۰ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔

اس رات کچھ بھی نہ ہو سکا۔ ایک تو سردی بہت تھی دوسرے مارے کھانسی کے کرنل دھنی رام کا برا حال تھا اور تیسرے اُن سے کچھ دُور نیچے کی طرف برفانی انسان حسب دستور محفل رقص و موسیقی کا اہتمام کیے ہوئے تھے۔

جب صبح ہوئی تو میجر نے کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت سے کہا کہ وہ کیمپ نمبر ۵ میں رہیں

گے۔ ابراہیم ان کے لیے کھانا تیار کرے گا اور وہ شام تک واپس آ جائیں گے۔ کرنل دھنی رام بیمار تھا اس لیے اُسے نمونیہ کی دوائی دی جائے اور سوپ گرم کر کے پلایا جائے لیکن یہ بات کرنل کو پسند نہ آئی اور وہ کانپتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ چلنے کا تقاضا کرنے لگا چنانچہ طے پایا کہ وہ سب غار کی تلاش میں جائیں گے۔ گلیشیر نمبر ۳ پر کیمپ نمبر ۵ میں خیمے، سکی انگ کا سامان اور ہنٹر بیف جوں کے توں رہیں گے۔

ٹیڑھی چوٹی سے برف کی ایک دیوار گولڈن ٹاور کو جاتی تھی۔ وہ اب اُس پر چل رہے تھے۔ سب سے آگے کیپٹن تنویر تھا اس کے پیچھے میجر پھر ابراہیم اس کے بعد کرنل دھنی رام پھر شامی اور آخر میں امانت۔

وہ صبح آٹھ بجے روانہ ہوئے تھے۔ دس بجے کے قریب وہ ایک کے پیچھے ایک کے اصول پر عمل کرتے ہوئے برف کی دیوار پر سے گذر رہے تھے۔ یہ بہت خطرناک راستہ تھا اگر پاؤں دائیں بائیں پڑ جائے تو بندہ گر گیا۔ سینکڑوں گز نیچے۔ توازن قائم رکھنا بھی مشکل تھا۔ یہ کچی برف کی دیوار ایک طرح سے موت کی دیوار تھی۔

کرنل دھنی رام نے محسوس کیا کہ اُس کا سر چکرا رہا ہے اور اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ رُک گیا اور پھر برف کی دیوار پر بیٹھ گیا۔ اُسے بڑی مشکل سے اٹھایا اور میجر اُسے سہارا دے کر چلنے لگا۔ کرنل پھر گرنے لگا تو میجر نے پھر سہارا دیا۔ خطرناک دیوار جان لیوا ثابت ہو رہی تھی۔ ہر طرف خاموشی تھی۔ کسی کے منہ سے کوئی لفظ نہ نکل رہا تھا۔ سبھی دم بخود تھے اور خود کو سنبھال رہے تھے۔

''آؤ میرے پیچھے!'' کیپٹن تنویر کی رعب دار آواز ان کے کانوں میں گونجی اور وہ چل پڑے۔

خزانہ اور برفانی انسان

برف کی دیوار پار کرنے کے بعد چبوترہ نما جگہ آ گئی جو ٹیڑھی چوٹی سے ذرا بلند تھی اور خاصی چوڑی تھی۔ وہ سب اس چبوترہ پر بیٹھ کر آرام کرنے لگے۔ ابراہیم نے تیل کا چولہا جلا کر اُس پر کیتلی رکھی اور چائے تیار کرنے لگا۔ اُس نے ہنٹر بیف کے ٹکڑے سب کو دیئے اور پھر خود ایک ٹکڑا چبانے لگا۔ چائے تیار ہو گئی تو اُس نے سب کو پیالیاں بھر بھر کر دیں۔ چائے پینے کے بعد ان سب کو جیسے ہوش آ گیا اور وہ پھر سے جوان اور توانا ہو گئے۔ آکسیجن کی کمی کی وجہ سے سانس لینا دشوار ہو رہا تھا۔ کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت کا برا حال تھا تاہم وہ ہمت سے کام لے رہے تھے۔

''وہ کیا ہے سامنے کالا کالا نشان؟'' میجر نے کیپٹن تنویر سے پوچھا۔

''پتہ نہیں۔ میرے خیال میں غار ہے۔ ابھی پتہ کرتے ہیں۔''

کیپٹن تنویر نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ باقی سب بھی کھڑے ہو گئے۔

لیکن دھنی رام اُٹھا تو اُسے چکر آیا اور تیورا ہو کر گر پڑا۔ تنویر اُسے دیکھنے کے لیے جھکا تو میجر بولا۔

''یہیں پڑا رہنے دو واپس آ کر دیکھیں گے۔'' میجر چل پڑا۔ اُسے دیکھ کر وہ سب کالے کالے نشان کی طرف چل دیئے وہ واقعی غار کا منہ تھا۔ کالا کھلا منہ۔

''یہ وہی غار ہے جس کا ذکر تاریخ کی کتابوں میں اور کرنل دھنی رام کی باتوں میں ملتا ہے۔'' میجر نے کہا اور وہ سب تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ آخر غار کا منہ آ گیا۔

کیپٹن تنویر نے ٹارچ روشن کی اور غار کے اندر داخل ہوا۔ اُس نے دور اندر جا کر آواز

دی'' آ جاؤ۔ راستہ صاف ہے۔

میجر اندر داخل ہوا تو اُس نے دیکھا کہ واقعی غار کافی چوڑا ہے باقی سب میجر کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہوئے۔ اب اُن سب نے اپنی اپنی ٹارچیں جلا لی تھیں اور وہ آرام سے لیکن احتیاط سے آگے بڑھ رہے تھے۔

غار کے اندر سردی اتنی زیادہ نہ تھی جتنی باہر تھی۔

''اپنے اپنے ہتھیار تیار رکھو مجھے کچھ گڑبڑ محسوس ہوتی ہے۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔ وہ سب اُس کے حکم سے پہلے ہی ریوالور اور پستول لوڈ کر کے اپنے اپنے دائیں ہاتھ میں پکڑ چکے تھے۔

غار ختم ہونے کا نام نہ لیتا تھا۔ اُن سب کو پسینہ آنے لگا۔ پھر ایک دم کیپٹن تنویر کی آنکھوں کے سامنے روشنی پھیل گئی۔ غار اور چوڑا ہو گیا تھا اور اُس کا دوسرا سرا بند تھا۔ پانچ گز نصف قطر کے دائرہ میں سونے اور ہیرے جواہرات کا بڑا ڈھیر چمک رہا تھا اور اُن سے پرے برفانی انسان سو رہے تھے۔ غار کے اندر اُن کے خراٹوں سے شور اُمڈ رہا تھا۔ کیپٹن تنویر نے میجر کا کندھا پکڑ کر اُن کی طرف اشارہ کیا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو برفانی انسانوں پر فائر کروں۔'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔ وہ میجر سے کُھسر پُھسر کے انداز میں بات کر رہا تھا اور باقی سارے منتظر کھڑے تھے۔

''نہیں خزانہ میں سے اپنا حصہ اُٹھاؤ اور پلٹ جاؤ۔'' میجر نے ٹھوس اور مضبوط لہجہ میں کہا۔

کیپٹن تنویر نے سونے کی چند ڈلیاں اور کچھ ہیرے جواہرات اٹھا کر جیب میں ڈالے اور دبے پاؤں پیچھے ہٹا اور آہستہ سے پلٹ آیا۔ اب میجر کی باری تھی۔ میجر نے ٹارچ اور ہیرے جواہرات کی روشنی میں برفانی انسانوں کو دیکھا، مسکرایا اور خالی ہاتھ پلٹ آیا۔ اُس کے چہرے پر اتھاہ اطمینان کا نور بکھرا ہوا تھا۔ وہ جس مشن کو لے کر چلا تھا، کامیاب رہا تھا۔ اُسے دولت سے پیار نہ تھا۔ مشن کی کامیابی سے پیار تھا۔

ابراہیم کی باری آئی تو اُس نے سونا نہ اُٹھایا۔ ہیرے جواہرات سے اپنی جیبیں بھر لیں۔ یہی کچھ کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت نے کیا۔ میجر اب تنگ خزانہ کے پاس پستول تانے اور گرنیڈ پکڑے کھڑا تھا کہ کہیں برفانی انسان حملہ نہ کریں۔ جب اُس کے تمام ساتھی خزانہ میں سے اپنا

اپنا حصہ لے کر واپس چل دیئے تو میجر بھی احتیاط سے الٹے قدموں چلنے لگا۔ برفانی انسان مزے سے لیٹے ہوئے تھے اور خوب خراٹے لے رہے تھے۔

غار سے واپسی مشکل نہ تھی کیونکہ انہوں نے راستہ دیکھا ہوا تھا۔ ایک بار پھر کیپٹن تنویر سب سے آگے اور میجر نوری سب سے پیچھے وہ نہایت احتیاط سے باہر آ رہے تھے۔ جب وہ غار سے باہر نکلے تو کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے پانچ عدد برفانی انسان کھڑے ان کو گھور رہے ہیں۔ ان کے قد دس سے بارہ فٹ تک اونچے تھے۔ جسم پر ہلکے سنہری بال تھے جو بہت لمبے تھے۔ آنکھیں موٹی موٹی اور چمک دار تھیں۔ اُن سب کے چہروں پر مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی۔ ان میں ایک بچہ بھی تھا جس کا قد پانچ فٹ ہو گا وہ اچھل رہا تھا۔

سارے مہم جو حیرت زدہ اور پریشان تھے۔ کریں تو کیا کریں۔ موت سامنے نظر آ رہی تھی۔ بچنا محال تھا۔

''اگر اجازت ہو تو گولی چلاؤں سر؟'' کیپٹن نے پوچھا۔ لڑنے مرنے کے لیے وہ ہر وقت تیار رہتا تھا۔

''غار کے چاروں طرف برف ہی برف ہے۔ آپ کی گولی کی آواز سے آوالانچ شروع ہو سکتا ہے۔ ہم سب برف میں دب کر مر جائیں گے۔'' میجر بولا۔

''واپس غار میں چلتے ہیں۔'' کیپٹن نے تجویز پیش کی۔

''وہ جو سوئے ہوئے ہیں وہ بھی جاگ اُٹھے ہوں گے۔ ہم دونوں گروہوں کے درمیان آ جائیں گے۔'' میجر نے کہا۔

''برف میں دھنس کر چُھپ جائیں پھر؟'' کیپٹن نے پھر پوچھا۔

''یہ تلاش کر لیں گے۔ یہ برفانی انسان ہیں۔ ان کے لیے برف دوست ہے ہمارے لیے دشمن۔'' میجر نے کہا اور پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ اب میجر سب سے آگے تھا اور کیپٹن تنویر اس کے پیچھے۔ باقی تین اپنی جگہ پر گھبرائے ہوئے کھڑے تھے۔ میجر برفانی انسانوں کی طرف چلنے لگا۔

''سر! مرنے کا ارادہ ہے کیا؟ یہ وحشی انسان چبا ڈالیں گے آپ کو۔'' کیپٹن بولا۔

میجر نے اس کی بات پر توجہ نہ دی اور برفانی انسانوں کے قریب جا کر زور زور سے چلایا

''دگوش۔ دگوش۔''

برفانی انسان دیکھتے دیکھتے راستہ چھوڑ کر برف میں لڑھکتے ہوئے ڈھلوان کی طرف چل دیئے۔ بروق پا نے بتایا تھا کہ برفانی انسان کی زبان میں دگوش کا مطلب ہے، جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔''

اُن سب کی جان میں جان آئی اور وہ میجر کی دلیری، بہادری اور حاضر دماغی پر عش عش کر اُٹھے۔ میجر نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر لیڈری کی مثال قائم کی تھی۔

چبوترہ پر پہنچ کر وہ سب ستانے لگے۔ میجر نے غار کی طرف دیکھا اب اُس کا منہ کالا نہ تھا سفید تھا۔ غار کے منہ میں برفانی انسانوں کی موٹی موٹی آنکھیں دمک رہی تھیں۔

''اُٹھو چلیں۔'' میجر نے اُٹھتے ہوئے کہا ''جلدی کرو خطرہ ہے۔''

''اب پتہ چلا کہ رات کو کون لوگ جشن مناتے ہیں اور ناچتے ہیں۔'' کیپٹن تنویر نے کہا اور برف کی پتلی دیوار پر تیز تیز چلنے لگا۔ وہ سب سے آگے تھا اور باقی اُس کے پیچھے۔ عین اُس وقت برف ہلنے لگی اور کیپٹن تنویر نے رفتار تیز کر دی۔

سُرموگاؤں میں واپسی

پہاڑی خیمہ گاہ سے وہ بعد دوپہر روانہ ہوئے تھے۔ بروق پا سب سے آگے تھا۔ اس کے پیچھے ابراہیم اور میجر اور میجر کے پیچھے کیپٹن۔ میجر نے کیپٹن کو حکم دیا تھا کہ وہ ریوالور کو تیار رکھے کیونکہ ابھی معاملہ طے نہ ہوا تھا کہ برفانی انسان برفانی پہاڑ چھوڑ کر اپنے علاقے کی طرف بھاگ گئے ہیں۔ ممکن ہے وہ پہاڑ کے پیچھے ہی چھپ گئے ہوں کہ وقت کو ٹالا جائے۔ ان دونوں برفانی انسانوں پر برا وقت آیا تھا کیونکہ میجر نوری اور کیپٹن تنویر نے ان دونوں پر فائر کیے تھے اور بروق پا نے چلّا کر ان کو بھاگ جانے کا مشورہ دیا تھا۔ بروق پا نے دونوں برفانی انسانوں کو کہا تھا ''دگوش، دگوش۔'' یہ لفظ دگوش برفانی انسانوں کی زبان میں ''بھاگ جاؤ، دوڑ جاؤ'' کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

بروق پا نے برفانی انسانوں کے ساتھ جو وقت گزارا تھا، اس دوران میں اس نے برفانی انسانوں کی زبان سیکھنے کا چارہ بھی کیا تھا اور اس نے ان کی زبان سیکھ لی تھی۔ بروق پا محنتی آدمی تھا اور محنت سے دُنیا کا ہر کام ہو جاتا ہے۔ بس ذرا یہ بات ہے کہ تھوڑا بہت ذہن سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ اگر آدمی ذہین ہو اور کام نہ کرے تو کچھ نہیں ہوتا۔ ذہن منصوبے سوچ سکتا ہے لیکن ان میں رنگ نہیں بھر سکتا۔ یہ محنت ہے جس سے منصوبوں میں رنگ بھرا جاتا ہے۔ حضور نبی اکرم ﷺ نے بھی تو فرمایا ہے ''الکاسب حبیب اللہ'' یعنی محنت اور کام کرنے والے کو اللہ تعالیٰ پیار کرتے ہیں۔ یہ بات بروق پا کو بھی معلوم تھی اور پھر وہ محنتی شخص بھی تھا اس لیے وہ برفانی انسانوں کی زبان سیکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان کی زبان میں صرف پندرہ سولہ الفاظ تھے۔

میجر نوری اور کیپٹن تنویر اب بھی نمونیہ میں مبتلا تھے۔ اس لیے وہ زیادہ تیز نہیں چل سکتے تھے۔ یہ ہلکا نمونیہ تھا، شدید نمونیہ نہیں تھا جسے ڈبل نمونیہ کہا جاتا ہے ڈبل نمونیہ میں دونوں پھیپھڑے سردی سے متاثر ہوتے ہیں۔ بہرحال وہ شام کو سُرموگاؤں پہنچے تو سب سے پہلے ان کو گاؤں کے چوکیدار عبدالخالق نے دیکھا۔ وہ بھاگ کر نمبردار کی حویلی میں آ گیا جہاں نمبردار، پروفیسر الیگزنڈر، مسٹر مائیکل، پورٹر محمد علی، پورٹر حاجی احمد، اخبار نویس دلاور اور نمبردار کا جوان بیٹا سلطان احمد ایک کمرے میں آگ جلا کر بلتی چائے پی رہے تھے۔ اس چائے میں چائے کی پتی، دودھ، مکھن (یا گھی) اور میٹھا سوڈا ہوتا ہے۔ یہ چائے جسم کو گرمی پہنچاتی ہے اور طاقت بھی۔ اس چائے میں کھانڈ کی بجائے نمک استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ ہاضم بھی ہوتی ہے اور بلتستان کے لوگ اسکے گھونٹ گھونٹ کے ساتھ بندا یسی موٹی روٹی بھی کھاتے ہیں۔

عبدالخالق گھبرا کر نمبردار کے کمرے میں داخل ہوا اور چلایا۔

''وہ آ گئے۔''

سب چونک اُٹھے کیونکہ چوکیدار عبدالخالق کی آواز میں خطرہ کی گھنٹیاں بج رہی تھی۔

''کون آ گئے؟'' بوڑھا نمبردار بولا۔ نمبردار کو بلتی میں 'ترمپا' کہا جاتا ہے۔

''ترمپا جی۔ برفانی انسان آ گئے۔'' عبدالخالق بولا تو دلاور علی کانپنے لگا۔ پروفیسر الیگزنڈر نے مائیکل کو دیکھا البتہ نمبردار کا بیٹا سلطان نہ گھبرایا۔ اس نے محمد علی اور حاجی احمد کی طرف دیکھا اور بولا۔

''میرے ساتھ آؤ۔ جلدی کرو۔''

وہ تینوں بیٹھک سے نکل کر باہر آئے۔

نمبردار غصے میں آ کر بولا۔

''چوکیدار تم بھی باہر جاؤ اور سلطان کو بتاؤ کہ وہ کس راستہ سے آ رہے ہیں۔ جاؤ۔''

عبدالخالق اٹھ کر باہر آیا اور سلطان اور دونوں پورٹروں کو لے کر گلی میں آ گیا۔ ان کے سامنے بروق پا، میجر اور کیپٹن چلے آ رہے تھے۔

''جی چاہتا ہے تجھے جان سے مار ڈالوں۔ یہ تو کماؤنڈوز ہیں اور ان کے ساتھ ایک عام آدمی ہے۔ ''غالباً، مزدور ہے۔''

''جی۔ میں تو سمجھا تھا کہ یہ برفانی انسان ہیں۔'' چوکیدار شرمندہ ہو کر بولا۔

''تیرے ذہن پر برفانی انسان سوار ہیں ہم نے تو آج تک برفانی انسانوں کو دن دہاڑے انسانی بستیوں کی طرف آتے نہیں دیکھا۔'' سلطان جلدی سے بولا۔

اسی اثناء میں بروق، میجر اور کیپٹن ان کے پاس آ گئے۔

''میرا بیٹا ابراہیم کہاں ہے؟'' عبدالخالق نے پوچھا لیکن کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

''السلام علیکم!'' بروق پا نے کہا۔

''وعلیکم السلام!'' سلطان نے جواب دیا۔

''ان دونوں صاحبوں کو سہارا دو۔ ان کو نمونیہ ہو گیا ہے ٹھنڈک لگ گئی ہے۔'' بروق پا بولا۔

''چلو محمد علی اور علی احمد دونوں میجر صاحب اور کیپٹن صاحب کو سہارا دو اور ہماری بیٹھک میں لے چلو۔'' سلطان نے پورٹروں کو حکم دیا۔ دونوں پورٹر آگے بڑھے لیکن میجر نے ہاتھ کے اشارہ سے ان سے کہا کہ وہ تکلیف نہ کریں۔

''صاحب جی! آپ بیمار ہیں۔'' بروق پا بولا۔

''ہم ٹھیک ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔'' کیپٹن تنویر بولا۔

جب وہ سب بیٹھک میں داخل ہوئے تو نمبردار لپک کر آگے بڑھا اور اس نے باری باری میجر اور کیپٹن کو گلے لگایا۔ دلاور علی سہم کر بیٹھک کے کونے میں کھڑا تھا۔ پروفیسر الیگزنڈر اور مائیکل دلچسپی سے بروق پا، میجر اور کیپٹن کو تک رہے تھے۔ نمبردار نے فرش پر ان کے بیٹھنے کے لیے جگہ بنائی تو بروق پا بولا۔

''میجر صاحب اور کیپٹن صاحب کو ٹھنڈ لگ گئی ہے۔ نمونیہ ہے۔ ان کے لیے چائے اور یخنی کا انتظام ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔''

''سب کچھ ہوگا گھبراؤ نہیں۔'' سلطان بولا اور پھر اُس نے فرش پر دو لحاف ڈالے۔ ان پر میجر اور کیپٹن کو بٹھا کر لیٹنے کے لیے کہا۔

''ہم نہیں لیٹیں گے البتہ بیٹھ کر گپ لگاتے ہیں۔ ہمیں معمولی نمونیہ ہے آپ فکر نہ کریں۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے ہم۔'' کیپٹن بولا۔

نمبردار نے خود دو پیالیوں میں چائے ڈال کر دونوں کو پیش کی۔ چوکیدار اور لکڑیاں لے آیا اور ٹین کے بنے ہوئے چولہے میں ڈال دیں۔ پروفیسر الیگزنڈر، مسٹر مائیکل، دلاور علی، دونوں پورٹر اور نمبردار دائرہ بنا کر ان کے آس پاس بیٹھ گئے۔ کمرہ پہلے بھی گرم تھا، لکڑیاں جل اٹھیں تو اور گرم ہو گیا۔ سلطان یخنی بنانے کے لیے مرغ کی تلاش میں باہر نکل گیا۔ چوکیدار نے ابراہیم کے بارے میں پوچھا۔

''وہ کیمپ نمبر ا میں ہے۔ گھبراؤ نہیں، مزے میں ہے۔'' میجر چائے کا گھونٹ بھر کے بولا۔

وہ اس چائے کا عادی نہ تھا اس لیے اس کے چہرہ پہ بے زاری کی کیفیت ابھری لیکن وہمنہ سے کچھ نہ بولا۔ بروق پا نے میجر کی کیفیت بھانپ لی۔

''صاحب جی! یہ جو چائے ہے نا ہماری یہ آپ کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔'' بروق پا نے میجر کو بتایا۔

''یہ کون ہے؟'' نمبردار نے میجر سے پوچھا۔

''ہاں۔ میں نے آپ کو بتایا نہیں۔ یہ ہے بروق پا۔ لکڑ ہارا جسے برفانی انسان اٹھا کر لے گئے تھے۔'' میجر بولا۔

اس کے الفاظ سن کر سب حیرت زدہ ہو گئے۔ پروفیسر الیگزنڈر جلدی سے بولا۔

''تُم نے میجر صیب اسے کہاں سے پکڑا؟''

''اسے ہم نے نہیں پکڑا۔ اسے برفانی انسانوں نے پکڑا اور پھر برفانی انسانوں نے ہم کو پکڑا اور پھر ہم تینوں نے برفانی انسانوں سے جان چھڑائی۔'' کیپٹن تنویر ہنس کر بولا۔

''کیپٹن ٹم اڈر ہمارے ساتھ جوک کرتا ہے (مخول کرتا ہے) ہم سیریس ہے۔ بروق پا کو کس طرح سے آپ نے حاصل کیا؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بس یہ سمجھ لو کہ بروق پا کی جان بچ گئی اور ساتھ ہماری بھی۔'' میجر بولا۔

''میرا بیٹا، ابراہیم کہاں ہے جی؟'' عبدالخالق روہانسی آواز میں بولا۔

''بتایا نا! وہ کیمپ نمبر ایک میں ہے۔ اس کے پاس کھانے پینے کی تمام چیزیں ہیں۔ اس

کے پاس پستول بھی ہے۔ بہادر بچہ ہے اللہ اسے خوش رکھے۔''

میجر نے چائے پی کر پیالہ ایک طرف رکھ دیا۔

''گھبراؤ نہیں وہ ٹھیک ہے۔'' کیپٹن نے عبدالخالق کو تسلی دی۔ دلاور علی اپنی نوٹ بک پر کچھ لکھ رہا تھا۔

''دلاور علی! کیا لکھ رہے ہو؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''میں خبر بنا رہا ہوں۔ بہت بڑی خبر اور اس خبر کو میں آج خپلو پہنچ کر اپنے اخبار ''صدائے وطن'' راولپنڈی کو بھجوا دوں گا۔ یہ بہت بڑی خبر ہے شہ سرخی ہو گی۔ کل چھپ جائے گی۔'' دلاور علی خوشی خوشی بولا۔

''اب تو رات ہو گئی کیسے جاؤ گے خپلو؟ راستہ تو برفانی انسانوں نے روکا ہو گا۔'' کیپٹن بولا۔

''میں صبح تڑکے اٹھ کر چلا جاؤں گا۔ کل خبر بھجوا دوں گا اور پھر پرسوں خبر چھپ جائے گی۔''

دلاور علی کی خوشی کی کوئی حد نہ تھی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔

''کیا میں آپ سب کا انٹرویو لے سکتا ہوں؟''

''ابھی ایک دو دن ٹھہر جاؤ۔ ابھی طبیعت پوری طرح جو بن پر نہیں آئی۔ جب آ جائے تو پھر ایک کے بجائے دس انٹرویو۔'' کیپٹن نے دلاور سے کہا۔

''خدا آپ سب کو صحت دے۔'' عبدالخالق کے منہ سے دعا نکلی۔

''ہم ولائیت جانا مانگٹا تھا لیکن اب واپس نہیں جائے گا۔ ہم اِڈر سُر موگاؤں میں اپنا دفتر بنائے گا۔ دفتر کا کرایہ نمبردار کو دے گا اور پھر کتاب لکھے گا۔'' پروفیسر الیگزنڈر بولا۔

''یہ بہت اچھی بات ہے۔'' میجر بولا۔

''یہ میری عزت افزائی ہے کہ میری بیٹھک میں گورے پروفیسر کا دفتر ہو گا۔ میں ان سے کرایہ نہیں لوں گا اور جو خدمت ہو گی وہ کروں گا۔'' نمبردار نے کہا۔

''تھینک یُو ہیڈ مین۔ ہمارے پاس بہت پیسہ ہے۔ ہمیں عجیب و غریب حیوانات عالم پر ریسرچ کرنے والی فاؤنڈیشن نے بہت پیسہ دیا ہے۔ ہم مفت خورہ نہیں ہے پورا پورا کرایہ دے گا اور جو ہماری خدمت کرے گا ہم شکریہ کے ساتھ اس کا معاوضہ دے گا۔'' پروفیسر اعتماد

بھرے لہجے میں بولا۔

کچھ دیر تک وہ سب چپ چاپ بیٹھے آگ تاپتے رہے پھر کیپٹن تنویر بولا۔

''میں تو ٹھیک ہو گیا ہوں۔ سردی کا احساس نہیں رہا۔ کمزوری بھی دور ہو گئی ہے۔ گاؤں والوں کا شکریہ۔ خاص طور پر نمبردار کا بہت بہت شکریہ۔''

''میری حالت بھی بہتر ہو گئی ہے۔ میں بھی شکر گزار ہوں۔''

''صاحب جی، یہ چائے کا اثر ہے۔ یہ چائے بہت عمدہ ہے۔'' بروق پا بولا۔

''آپ نے ٹھیک کہا چائے کا اثر ہے لیکن ساتھ ساتھ اس آگ کا بھی اثر ہے۔'' میجر نے خوش ہو کر کہا۔

''آپ یخنی پئیں گے تو اور بھلے چنگے ہو جائیں گے۔'' بروق پا بولا۔

''اِڈر ہم کو یاد آیا ہمارے پاس نموتیہ کی گولیاں ہیں۔ پتہ نہیں ہم کیوں بھول گیا کہ آپ کو گولیاں دینا چاہئیں۔ دراصل ہم بروق پا کے آپ کو ساتھ دیکھ کر حیران رہ گیا۔''

پروفیسر نے یہ کہہ کر ایک تھیلا اٹھایا۔ اس میں سے بہت سی گولیاں نکال کر اپنے دامن میں ڈالیں اور لالٹین کی مدھم روشنی میں نموتیہ کی گولیاں تلاش کرنے لگا۔ پھر اُس نے دو گولیاں میجر کو اور دو کیپٹن کو دیں۔

نمبردار نے گلاس میں پانی بھر کر میجر کو دیا۔ میجر نے پانی کے ساتھ دو گولیاں کھائیں اور گلاس کیپٹن کی طرف بڑھا دیا۔ کیپٹن نے بھی پانی کے گھونٹ کے ساتھ دو گولیاں کھائیں۔

''ابھی تھوڑی دیر میں نموتیہ بھاگ جائے گا اور آپ گھوڑے کی طرح فٹ ہو جائے گا۔'' پروفیسر نے تھیلا اپنی جگہ رکھ کر کہا۔

تھوڑی دیر بعد سلطان یخنی لے آیا۔

''یخنی چھوڑ جاؤ سلطان اور مہمانوں کے لیے کھانا لاؤ'' نمبردار بولا۔ ''بہت اچھا جی۔'' سلطان یہ کہہ کر بیٹھک سے باہر چلا گیا اور دونوں مریض یخنی پینے لگے۔ اسی دوران میں ان دونوں نے چوکیدار عبدالخالق کو پھر تسلی دی۔

''گھبراؤ نہیں۔ ابراہیم ٹھیک ہے۔ کل صبح ہم جا رہے ہیں اوپر اسے لانے کے لیے۔ اس کے پاس ہر چیز ہے۔'' میجر نے کہا۔

کیا وہ زندہ تھا؟

دوسرے دن صبح دلاور علی اور بروق پا خپلو کے لیے روانہ ہوئے۔ میجر نے بروق پا سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ کسی قسم کا بیان نہ دے۔ اگر دلاور علی کوئی بات پوچھے تو معذرت پیش کرے۔ میجر نے بروق پا کو بتایا کہ وہ اور کیپٹن ایک ماہ کی رخصت پر ہیں۔ پندرہ دن بیت چکے ہیں اور باقی دنوں میں وہ برفانی انسانوں کو پکڑنے کی کوشش کریں گے۔ ہاں ابراہیم کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ کیمپ نمبر ا میں زندہ و سلامت ہے۔

''اخبار میں خبریں چھپنے سے نہ آپ کو کوئی فائدہ ہو گا اور نہ ہمیں۔ ہاں سنسنی پھیل سکتی ہے اور بلتستان کے سیدھے سادے لوگوں کی زندگیوں میں بھونچال آ سکتا ہے۔''

میجر نے بروق پا کو بتایا۔ بروق پا نے وعدہ کیا کہ وہ کسی سے بات نہیں کرے گا حتیٰ کہ وہ اپنی بیوی کو بھی نہیں بتائے گا۔

خپلو کے لیے دونوں کی روانگی کے بعد میجر، کیپٹن، چوکیدار، مائیکل اور سلطان روانہ ہوئے۔ پروفیسر نے سلطان، محمد علی اور حاجی احمد کو اپنے سٹاف میں شامل کر لیا اور ان کی تنخواہ دو ہزار روپیہ فی ماہ فی کس مقرر کی یعنی وہ ہر ماہ پروفیسر الیگزنڈر سے دو ہزار روپیہ لیں گے اور برفانی انسان کی تلاش کے سلسلہ میں جو تحقیق ہو رہی تھی اس میں پروفیسر کی مدد کریں گے۔ تینوں بہت خوش تھے کیونکہ گھر بیٹھے بٹھائے نوکری مل گئی تھی۔

وہ پانچوں دو بجے سے پہلے پہاڑی جنگل میں پہنچ گئے اور پھر وہاں سے کیمپ نمبر ا کے لیے روانہ ہوئے۔ ان میں سے سکی انگ کا سامان صرف میجر اور کیپٹن کے پاس تھا جو انہوں نے پروفیسر اور مائیکل سے لے لیا تھا اور جسے وہ گولڈن ٹاور کے علاقہ میں استعمال کرنا چاہتے

تھے۔ پہاڑ پر چڑھنے کے لیے بھی انہوں نے پروفیسر ہی سے رسے لیے تھے۔ دوائی اور کھانے پینے کا سامان بھی پروفیسر ہی نے دیا تھا البتہ میجر اور کیپٹن کو امید تھی کہ وہ جب کیمپ نمبرا میں پہنچ جائیں گے تو ان کو ان کا سامان مل جائے گا تاہم احتیاط کے طور پر انہوں نے پروفیسر سے ضروری سامان لے لیا تھا۔ جب وہ کیمپ نمبرا سے چلے تھے تو سامان چھوڑ آئے تھے۔

ان کے پاس دو خیمے بھی تھے جو مائیکل اپنے ساتھ اٹھالایا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ موسم کی خرابی کی وجہ سے خیمے ہوا کی تندی و تیزی سے پھٹ سکتے ہیں یا اڑ سکتے ہیں۔ اس لیے محفوظ خیمے ساتھ ہوں تو اچھی بات ہے۔ اس کا یہ اندیشہ بعد کے واقعات نے درست ثابت کیا۔

شام گہری ہو رہی تھی کہ وہ کیمپ نمبرا میں پہنچے جو بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھا۔ کیمپ میں خیمہ موجود نہیں تھا۔ سلطان نے خیمہ کو اِدھر اُدھر تلاش کیا تو وہ اسے برف میں دبا ہوا ملا۔ جب برف ہٹا کر خیمہ نکالا تو اس کے اندر میجر اور کیپٹن کا کھانے پینے کا سامان، گولی، سکہ، دوائیاں، رسے، لالٹین، کپڑے (گرم) اور شیو کا سامان بھی مل گیا۔

یہ جان کر کہ ابراہیم گُم ہے، اس کا والد چوکیدار عبدالخالق برف پر بیٹھ کر زور زور سے رونے لگا۔ میجر نے بڑی مشکل سے سمجھایا تو وہ خاموش ہوا۔ مائیکل نے اپنا خیمہ الگ گاڑھا اور سلطان اور کیپٹن تنویر نے گرے ہوئے خیمے کو کھڑا کیا۔ جو خیمہ مائیکل کے پاس فالتو تھا اسے کھڑا کر کے باورچی خانہ بنا لیا گیا۔

رات کو کسی نے کچھ نہ کھایا۔ صرف چائے پی۔ سبھی افسردہ تھے اور سوچ میں گم تھے۔

''یہ طے ہے کہ ابراہیم زندہ ہے۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔

''خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔'' سلطان بولا۔

''وہ زندہ ہے اور وہ انشاء اللہ ہمیں کل مل جائے گا۔'' میجر بولا۔

''میرے خیال میں ہوا یوں ہے کہ جس رات ہم واپس کیمپ نمبرا میں نہ آ سکے اسی رات وہ برف کے طوفان میں دائیں بائیں چلا گیا۔'' کیپٹن نے کہا۔ دراصل جس بلزرڈ کی وجہ سے ہم رات واپس نہ آ سکے اسی بلزرڈ کی زد میں وہ آیا ہوگا۔ اگر وہ بلزرڈ نہ آتا تو ہم غار میں پناہ نہ لیتے۔ کیمپ نمبرا میں ابراہیم کا خیمہ نہ گرتا اور وہ پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر نہ جاتا۔ اگر خدانخواستہ اس کی موت واقع ہوئی تھی تو پھر لاش کہاں گئی؟ یقیناً سامان کے ساتھ لاش بھی

برف میں دب جاتی اور آج ہمیں سامان کے ساتھ مل جاتی۔ چونکہ خیمہ اور خیمہ کے اندر سارا سامان جوں کا توں مل گیا ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ابراہیم بلزرڈ میں آنے سے پہلے اِدھر اُدھر پناہ کی تلاش میں چلا گیا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے'' کیپٹن تنویر میجر سے مخاطب ہو کر بولا ''جو ریوالور ہم نے ابراہیم کو دیا تھا وہ سامان کے ساتھ ہمیں نہیں ملا۔ اس کا مطلب یہ ٹھہرا کہ ریوالور ابراہیم کے پاس تھا۔ وہ ریوالور لے کر کسی طرف نکل گیا۔ اب یہ پتہ لگانا ہمارا فرض ہے کہ وہ کس طرف کو گیا۔''

سارے خاموش تھے کیونکہ کسی کو معلوم نہ تھا کہ ابراہیم رات کی تاریکی میں جب برف کا طوفان اٹھنے والا تھا یا اٹھ رہا تھا تو وہ اس طرف نکل گیا۔ ممکن ہے وہ تند و تیز طوفان میں اڑ گیا ہو مگر یہ ممکن تھا ہی نہیں، اگر ممکن ہوتا تو سب سے پہلے خیمہ اڑتا۔ اس کے بعد سامان اور ان سب کے بعد ابراہیم۔ کیونکہ ابراہیم ہی سب سے زیادہ وزنی اور بوجھل تھا۔ وہ ہلکا پھلکا پر نہیں تھا کہ اُڑ جاتا۔ پہلے برف گرنا شروع ہوئی پھر ہوا چلی اس کے بعد ہوا میں تندی اور تیزی آئی۔

لیکن کیا وہ زندہ تھا؟ دو دن اور دو راتوں کے بعد بھی وہ زندہ تھا کیا؟ بھوک پیاس اور سردی کی شدت سے بچ جانا بہت مشکل تھا۔ میجر نے یہ سب کچھ سوچا اور پھر سو گیا لیکن نیند کہاں؟ اسے رہ رہ کر ابراہیم کا خیال ستا رہا تھا۔ کیپٹن تنویر الگ بے چین تھا۔ نیند اس سے بھی کوسوں دور تھی یہی حال دوسروں کا تھا۔

ابراہیم پر کیا گزری

پہاڑوں کی دنیا ایک نرالی دنیا ہے۔ اگر ان پہاڑوں پر ہزاروں لاکھوں من برف جمی ہوئی ہو تو یہ پہاڑ اور نرالے ہو جاتے ہیں۔ سمندر ریگستان اور پہاڑ ہمیشہ انسان کے لیے دلچسپی کا باعث رہے ہیں۔ سمندر کی اپنی ایک دنیا ہے۔ ریگستان کی اپنی اور پہاڑ کی اپنی۔ سمندر میں پانی ہوتا ہے اس لیے یہ پانی کی دنیا ہے۔ ریگستان میں ریت ہوتی ہے اس لیے یہ ریت کی دنیا ہے اور پہاڑوں پر پتھر کنکری اور روڑے ہوتے ہیں اس لیے یہ پتھروں، کنکریوں اور روڑوں کی دنیا ہے لیکن جب پہاڑ پر کئی کئی گز برف کی تہہ جم جاتی ہے تو یہی پہاڑ برف کے پہاڑ بن جاتے ہیں اور دُنیا میں کئی پہاڑوں پر صدیوں سے برف جمی ہوئی ہے۔ یہی حال قراقرم کے پہاڑوں کا ہے۔ قراقرم کے پہاڑ ایک نہیں کئی ہیں۔ قراقرم نام ہے، پہاڑوں کے سلسلہ کا اور ہر پہاڑ کی اپنی ایک چوٹی ہے جو خطرناک بھی ہے اور برف پوش بھی ہے۔ مثلاً ایورسٹ کی چوٹی، کے ٹو کی چوٹی، نانگا پربت کی چوٹی، ہڈن پیک (پوشیدہ چوٹی) براڈ پیک (چوڑی چوٹی) راکا پوشی کی چوٹی چوگولیسا (مغرور چوٹی) گشا بروم مشابروم چوٹیاں غرضیکہ قراقرم کے سلسلہ کے جو پہاڑ ہیں ان کی کم از کم ایک سو تئیس چوٹیاں بے حد اہم ہیں۔ ان چوٹیوں میں ایک چوٹی گولڈن ٹاور تصور کیجیے۔

برف صرف پہاڑ کی چوٹی پر ہی نہیں ہوتی، نیچے راستے پر بھی ہوتی ہے۔ بعض اوقات سارا امیریا برف سے ڈھکا ہوتا ہے۔ دراصل ایک سنو لائن ہوتی ہے جو بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تصور کی گئی ہے۔ بارہ ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر ہر جگہ برف پائی جاتی ہے۔ اس بلندی سے اوپر درخت نہیں اُگتے، پودے اور جھاڑیاں بھی اس بلندی یعنی بارہ ہزار کی بلندی سے اوپر

پروان نہیں چڑھتے۔ جب سردی کے سبب بیج مر جائے گا تو پھر پودے، درخت اور جھاڑیاں ایسے اُگ سکیں گی۔ برف کی اس فرضی لائن یعنی سنو لائن کے اوپر برف کا راج ہوتا ہے۔

گولڈن ٹاور سنو لائن سے اوپر تھا اس لیے نہ وہاں کوئی درخت تھا اور نہ کوئی گُل بوٹا۔ اگر ایسے اونچے مقامات پر پودے یا پھول مِل جائیں تو سمجھ لیجیے یہ پودے اور پھول بڑے بہادر ہیں اور برف اور پتھروں سے غذا حاصل کرتے ہیں مثلاً سیاچن گلیشیر کو سیاچن اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس گلیشیر میں جنگلی گلاب اُگتا ہے۔ سیاہ چن کا مطلب ہی جنگلی گلاب ہے۔ گولڈن ٹاور کا مطلب ہے سنہرا برج یعنی وہ برج جس میں سونا ہے۔ مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ گولڈن ٹاور میں سونے اور دوسرے موتیوں کا خزانہ دفن ہے۔ یہ خزانہ شیر علی خاں لداخ سے اس وقت لایا تھا، جب اس نے لداخ فتح کیا۔ لداخ کا بادشاہ بدھ مت کا پیرو تھا اس نے تاوان جنگ کے طور پر ایک بڑا خزانہ دیا جو بلتستان کا شیر دل بادشاہ، شیر علی خاں گولڈن ٹاور میں رکھ کر یارقند کی فتح کے لیے چل دیا اور پھر وہ لڑائیوں اور فتوحات میں اس قدر مگن ہوا کہ خزانہ بھول گیا۔ یاد رہے کہ شیر علی خاں جسے علی شیر خاں بھی کہتے ہیں، بلتستان میں مغلوں کے دور کا خود مختار بادشاہ تھا۔

بات کہاں سے کہاں تک پہنچ گئی۔ گولڈن ٹاور کے امیریا میں برف کا طوفان آیا تو اس نے میجر نوری اور کیپٹن تنویر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب برفانی طوفان آتا ہے تو ایک خاص قسم کی گونج پیدا ہوتی ہے۔ پہاڑوں پر رہنے والے لوگ اس گونج کو پہچان لیتے ہیں اور پھر پناہ گاہ میں چلے جاتے ہیں۔ یہی بات ایوالانچ کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

جب گولڈن ٹاور کے علاقہ میں برفانی طوفان (بلزرڈ) آیا تو ابراہیم کے کانوں تک آواز آئی۔ وہ پہاڑی لڑکا تھا اور جانتا تھا کہ برفانی طوفان آ رہا ہے۔ چنانچہ وہ ریوالور اور ہنٹر بیف لے کر ٹارچ کی روشنی میں چل پڑا۔ وہ برف پر چل رہا تھا۔ برف سپاٹ تھی یعنی راستہ میں نہ درخت تھا نہ پودا نہ جھاڑی تھی نہ پتھر۔ اسے اگر ڈر تھا تو درندوں کا تھا لیکن درندے بھی تو برفانی طوفان کی آمد کی آواز سُن رہے تھے۔ اس نے سوچا جب درندے برفانی طوفان کی آواز سُنتے ہیں تو وہ بھی پناہ کی تلاش میں دوڑتے ہیں اور جو جاندار خود پناہ کی تلاش میں ہو گا وہ دوسرے جاندار کو نقصان نہیں پہنچائے گا۔ خطرہ تھا تو برفانی انسان کا تھا جو برف کے طوفان

میں بھی خوش رہتے ہیں بلکہ طوفان میں گھرے ہوئے جانداروں کا شکار کرتے ہیں۔

برف سفید ہوتی ہے کالی تو ہوتی نہیں، اس لیے برف باری ہو رہی ہو یا برف کا طوفان آ رہا ہو تو زیادہ اندھیرا نہیں ہوتا۔ اس لیے ابراہیم کو راستہ تلاش کرنے میں مشکل پیش نہ آئی۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پہاڑ پر چڑھنے سے سانس پھول جاتا ہے کئی بار اکھڑ جاتا ہے اس لیے اس نے پہاڑ پر چڑھنے کے بجائے ڈھلان کا رُخ کیا اور پھر ایک گھنٹہ دوڑنے کے بعد اسے ایک چٹان کی اوٹ میں پناہ مل گئی جس رُخ سے برف کا طوفان آیا تھا وہ اُس کی الٹی جانب تھا تاکہ برف باری میں دب نہ جائے اور برف کے تند تھپیڑوں سے بچ سکے۔ وہ ایک بہت بڑے جھکے ہوئے پتھر کے نیچے دو دن اور دو راتیں ٹھہرا رہا۔ دوا کی گولیوں، ہنٹر بیف اور ریوالور کی بدولت وہ زندہ بھی رہا اور صحت مند بھی۔ تیسرے دن دوپہر سے پہلے جب مطلع صاف تھا اور وہ پہاڑی جنگل کی طرف اور وہاں سے اپنے گاؤں سرموں جانے کے لیے پتھر کے سائبان سے باہر آیا تو میجر نوری اور کیپٹن تنویر نے اسے دیکھ لیا اور اسے کیمپ نمبر ا میں لے آئے۔

جب دوسرے ساتھیوں نے ابراہیم کو دیکھا تو خوشی کے نعرے مارنے لگے۔ عبدالخالق کی خوشی کی تو کوئی حد نہ رہی۔ اس نے کئی بار اس کا ماتھا چوما اور اسے کئی بار گلے لگایا۔

اس کی آمد کے بعد کھانا تیار ہوا اور سب نے مل کر کھایا۔ ابراہیم کی تلاش میں جو کامیابی ہوئی وہ ان سب کے لیے عید کی خوشی سے کم نہ تھی۔

عبدالخالق نے نماز ادا کی اور نماز کے بعد شکرانہ کے نفل بھی ادا کیے۔ نماز میں بیٹے نے باپ کی پیروی کی۔

گول دائرہ

طے یہ ہوا کہ عبدالخالق اپنے بیٹے ابراہیم کو لے کر واپس چلا جائے۔

''میں واپس نہیں جانا چاہتا۔'' ابراہیم نے اپنے باپ کو بتایا۔

''تمہارا واپس جانا بہت ضروری ہے۔ تیری ماں تیری جدائی میں ہلکان ہو رہی ہو گی۔'' عبدالخالق بولا۔

''آپ واپس جا کر ماں کو بتا دیں کہ میں بھلا چنگا ہوں۔'' ابراہیم نے کہا۔

''نہ صرف تمہاری ماں بلکہ تمہاری بہن بھی پریشان ہے۔'' اس کے باپ نے کہا۔

''آپ فاطمہ کو بھی بتا دیں کہ میں بھلا چنگا ہوں مجھے کچھ نہیں ہوا۔'' ابراہیم کسی طور پر واپس جانے کے لیے تیار نہ تھا۔

''تم واپس کیوں نہیں جاتے؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

''صاحب جی، میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بولا۔

''تم اپنے باپ کے ساتھ چلے جاؤ۔ اس کا کہا مانو۔ جب ماں اور بہن کو مل لو گے تو پھر واپس آ جانا۔'' کیپٹن نے اسے سمجھایا۔

''پھر بھلا مجھے کون آنے دے گا جی؟'' وہ افسردہ ہو کر بولا۔

''بھئی اگر ابراہیم نہیں جانا چاہتا تو اسے کیوں مجبور کرتے ہو۔ وہ دلیر اور بہادر لڑکا ہے۔'' میجر نے کہا۔

''ٹھیک ہے صاحب! اگر ابراہیم آپ کی خدمت کرنا چاہتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہے۔'' عبدالخالق نے کہا اور ابراہیم کو پیار کر کے کیمپ نمبر ا سے پہاڑی جنگل کی طرف روانہ ہو

گیا۔ کچھ دیر ابراہیم نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور پھر خیمہ میں آ کر چائے تیار کرنے لگا۔

چائے پی کر وہ گولڈن ٹاور کی طرف روانہ ہونے والے تھے کہ برف باری شروع ہوگئی۔ میجر نے مناسب خیال کیا کہ خراب موسم میں سفر اختیار نہ کیا جائے چنانچہ طے ہوا کہ رات کیمپ نمبر ا میں بسر ہو۔ اس فیصلہ کے بعد مائیکل اپنے لیے سوپ تیار کرنے لگا۔ ابراہیم نے میجر، کیپٹن اور سلطان کے لیے آٹا گوندھا، پھر دال پکائی اور اس کے بعد چپاتیاں پکانے لگا۔ سلطان نیزہ لے کر برف باری کے دوران میں باہر سیر کو چل دیا۔ اس نے مائیکل کا رین کوٹ پہن لیا تھا تا کہ برف میں بھیگنے سے بچ جائے۔ کیپٹن ایک ایسی کتاب کہنیوں کے بل لیٹ کر پڑھ رہا تھا جس میں نئے ہتھیاروں کے استعمال کی ترکیبیں درج تھیں اور میجر کے پاس ایک ایسا ناول تھا جس کا ہیرو دہشت پسند تھا اور جو لندن کو تباہ کرنا چاہتا تھا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔

تھوڑی دیر بعد سلطان واپس آیا۔ اس کے رین کوٹ پر برف پڑی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کپاس کے کھیت سے نکل کر آیا ہو۔

''میرا خیال تھا سر، کہ سردی سے ٹھٹھرتا ہوا کوئی مارخور یا خرگوش مل جائے گا لیکن کچھ بھی نظر نہیں آیا۔'' سلطان بولا۔

''تم بہت جلدی آ گئے سلطان۔ کچھ دیر تک شکار تلاش کیا ہوتا تو شاید مل جاتا۔'' کیپٹن تنویر کتاب سے آنکھیں اٹھائے بغیر بولا۔

''سر موسم خراب ہے۔ تمام جانور بلندی سے اتر کر ڈھلان کی طرف چلے گئے ہیں۔ اتنی بلندی پر صرف برفانی انسان ہی رہ سکتا ہے۔'' سلطان نے رین کوٹ اتار کر ایک کونہ میں رکھا اور کیپٹن تنویر کے پاس بیٹھ گیا۔ کیپٹن تنویر نے کتاب بند کر دی اور غور سے دیکھ کر بولا۔

''کاش ہم برفانی انسان کو پکڑ سکیں۔''

''آپ یقیناً کامیاب ہوں گے کیونکہ آپ نے تو بروق پا کو برفانی انسان کے پنجہ سے چھڑایا ہے۔''

''نہیں بابا! ہم نے بروق پا کو نہیں چھڑایا، بروق پا نے ہمیں برفانی انسان کے چنگل سے چھڑایا ہے۔'' میجر بول اٹھا۔

''وہ کیسے سر؟'' سلطان نے پوچھا۔

''یہ طے ہو چکا ہے کہ ہم تینوں یعنی میں، کیپٹن تنویر اور بروق پا کسی کو کچھ نہیں بتائیں گے۔''

''صاحب! اگر بروق پا نے دلاور علی کو بتا دیا تو جو آپ چاہتے ہیں وہ تو نہ ہو پائے گا یعنی پردہ فاش ہو جائے گا۔'' سلطان نے یہ دلیل صرف اس لیے دی تھی کہ میجر ان کو بروق پا کی رہائی کے بارے میں بتا دے۔

''ہم نے بروق پا کو اچھی طرح سمجھا دیا ہے اس کے باوجود اگر وہ اخبار والوں کو بیان دیتا ہے تو اس کی خوشی، دراصل ہماری مہم تو ابھی ختم نہیں ہوئی اس لیے ابھی کچھ بتانا غلط ہوگا۔ ہوسکتا ہے ہمیں بروق پا کو بلوانا پڑے کیونکہ وہ برفانی انسانوں کی زبان جانتا ہے۔ اگر ہمیں برفانی انسانوں سے گفتگو کرنے کی ضرورت پڑی تو دنیا میں صرف ایک آدمی ہے جو مترجم کی ڈیوٹی سرانجام دے سکتا ہے اور وہ ہے بروق پا۔''

میجر کی سنجیدگی دیکھ کر سلطان ہنس پڑا اور بولا۔

''صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں بھلا برفانی انسانوں سے گفتگو کیسے ہوسکتی ہے۔ وہ تو وحشی انسان ہیں بلکہ وحشی جانور ہیں۔ گھوڑے، گدھے، اونٹ، شیر، چیتا، مارخور، گیدڑ، بھیڑیا، انسان، گھاس، جڑی بوٹیاں ہر چیز کھا جاتے ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ ریچھ کے بڑے بھائی ہیں۔''

''تمہارا خیال غلط ہے'' میجر بولا ''برفانی انسان شکار ضرور کرتے ہیں اسی طرح جس طرح آپ کرتے ہیں۔ آپ بھی تو شکاری ہیں۔ آپ میں اور برفانی انسان میں اور برفانی انسان کے شکار میں فرق صرف اتنا ہے کہ آپ شوق سے مجبور ہو کر شکار کرتے ہیں اور وہ بھوک سے مجبور ہو کر شکار کرتے ہیں۔ ہاں یہ طے ہے کہ انہوں نے ابھی تک کسی انسان کا شکار نہیں کیا۔ بروق پا کی مثال ہمارے سامنے ہے۔''

''یہ بات تو ٹھیک ہے سر، برفانی انسان نے آج تک کوئی انسان ہلاک نہیں کیا۔''

لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ برفانی انسان نے قسم کھائی ہے کہ وہ ہم جیسے انسان کو جان سے نہیں مارے گا۔ برفانی انسان بہرحال وحشی انسان ہے۔ تہذیب و تمدن سے کوسوں دور۔ وہ بستیوں سے کوسوں دُور رہتا ہے۔ اس کی ایک وجہ ہے اور وہ وجہ یہ ہے کہ وہ بستی والوں سے نفرت کرتا ہے یا ان سے ڈرتا ہے۔ نفرت اور ڈر کی وجہ سے عام انسان کو جان سے مار ڈالتا ہے۔ اگر وحشی انسان جو غیر مہذب ہے اور بستی سے دور رہتا ہے۔ نفرت اور ڈر کی وجہ

سے عام انسان کو جان سے مار ڈالے یا ہلاک کر ڈالے تو کسی کو اچنبھا نہیں ہونا چاہیے۔'' میجر نوری نے فیصلہ کُن انداز میں کہا اور کتاب تھپ کر کے ایک طرف رکھ دی۔

''میرا خیال ہے کہ ہم گولڈن ٹاور کے کسی نہ کسی غار میں وحشی انسان کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔'' سلطان نے یقینی انداز میں کہا۔

''سلطان! ایک تو برفانی انسان وحشی نہیں ہے کیونکہ ہم نے اس کی وحشت کا مظاہرہ نہیں دیکھا اس لیے اسے وحشی انسان کے بجائے صرف برفانی انسان یا یتی کہا جائے تو مناسب ہے۔ رہی بات یہ کہ ہم اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوں گے تو یہ بڑا کٹھن کام ہے اگر ہم بھوک، پیاس، تھکاوٹ اور بیماری سے بچ گئے اور برفانی انسان نے لداخ، تبت یا کشمیر کا رُخ نہ کیا تو شاید ہمارا اور اس کا آمنا سامنا ہو۔'' کیپٹن بولا۔

''کیپٹن! یہ بھی تو کہو کہ چھٹی کم ہے۔ چودہ پندرہ دن ہیں ہمارے پاس۔'' میجر بولا۔

''سر! اور چھٹی لے لیں گے'' کیپٹن بولا۔

''معلوم نہیں ملے گی یا نہیں ملے گی'' میجر نے کہا۔

''سلطان دیکھو برف باری ہو رہی ہے یا تھم گئی ہے؟'' کیپٹن نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ سلطان نے خیمہ میں سے گردن باہر نکالی اور بولا:

''سر! برف باری ہو رہی ہے۔''

''ہونے دو، ہم چلتے ہیں دوڑ لگانے'' میجر بولا اور برف پر بھاگنے والے بوٹ پہننے لگا۔ کیپٹن پہلے ہی بوٹ پہن رہا تھا۔ پھر وہ دونوں خیمہ سے باہر نکل گئے لیکن جانے سے پہلے سلطان سے کہہ گئے کہ وہ واپس آ کر کھانا کھائیں گے۔ سلطان اس خیمہ میں چلا گیا جو باورچی خانہ تھا۔ ابراہیم تیل کے چولہے پر آگ تاپ رہا تھا۔ ''کھانا کھاؤ گے؟'' اس نے سلطان سے پوچھا۔

''دو کمانڈوز دوڑ لگانے گئے ہیں وہ آئیں اور کھانا کھا لیں تو پھر ہم کھائیں گے۔'' سلطان نے کہا۔

''اگر یہ بات ہے تو تم ان برتنوں کے پاس بیٹھو، کہیں کوئی برفانی انسان آ کر سارا کھانا چٹ نہ کر جائے۔ میں کمانڈوز کو دیکھ کر آتا ہوں'' یہ کہہ کر ابراہیم خیمہ سے نکلا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میجر اور کیپٹن خیموں سے کچھ دور برف پر گول دائرہ میں بھاگ رہے تھے وہ بڑے اشتیاق سے انہیں دیکھنے لگا۔

کیمپ نمبر۲ کی تلاش

اگلی صبح گولڈن ٹاور دہک رہا تھا۔ آسمان صاف تھا اور سورج کی کرنیں گولڈن ٹاور کی چوٹی پر دستار بندی کر رہی تھیں۔ لگتا تھا کہ ہر سُو سونا اُمڈ رہا تھا۔ گولڈن ٹاور کے اندر سونا پوشیدہ تھا یا نہیں، گولڈن ٹاور کے اوپر اور چاروں طرف سونا ہی سونا اُمڈ رہا تھا۔ کیا خوبصورت منظر تھا۔ سورج کی سنہری کرنیں جب چاروں طرف بکھری ہوئی برف سے گلے ملتی تھیں تو لگتا تھا گولڈن ٹاور برف میں نہا رہا ہے۔

میجر نوری، کیپٹن تنویر، مسٹر مائیکل، سلطان اور ابراہیم نے اپنا اپنا سامان لیا اور کیمپ نمبر۲ کی تلاش میں چل دیئے۔ ان کا رُخ گولڈن ٹاور کی چوٹی کی طرف تھا۔ موسم صاف تھا۔ برف باری آدھی رات کے بعد تھم گئی تھی چاروں طرف خاموشی کا ڈیرہ تھا اور وہ پانچوں آہستہ آہستہ سنہری چوٹی کی طرف رواں دواں تھی۔ ابراہیم جو ننگے پیر گھومنے کا عادی تھا، اب بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ یہ بوٹ برف پر چلنے والے تھے یعنی ان کے تلے چوڑے تھے تاکہ پیر برف میں دھنس نہ جائیں۔ برف پر چلنا آسان نہیں ہوتا۔ پاؤں سیدھا آنا چاہیے اور سیدھا اٹھنا چاہیے۔ پاؤں گھسیٹ کر چلنے سے پاؤں برف میں دھنس سکتا ہے۔ برف پر سیدھا پاؤں ڈالنے سے پنڈلیوں پر زیادہ زور پڑتا ہے اور وہ جلدی تھک جاتی ہیں۔

کوہ پیما اور کوہِ نور، جوں جوں پہاڑ پر چڑھتا ہے اس کا سانس پھول جاتا ہے۔ وجہ یہ ہوتی ہے کہ اوپر کی ہوا پتلی ہو جاتی ہے یعنی ہوا میں آکسیجن ہر چڑھائی کے ساتھ کم ہوتی جاتی ہے۔ پھیپھڑوں میں ننھی منی تھیلیاں ہوتی ہیں۔ ان تھیلوں میں ہوا بھر جاتی ہے۔ اس ہوا میں آکسیجن ہوتی ہے لیکن جب اونچائی شروع ہوتی ہے تو ہوا میں آکسیجن کی کمی بھی ہوتی چلی

جاتی ہے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھیپھڑوں کی ننھی منی تھیلیوں میں آکسیجن کی مقدار کم ہوتی چلی جاتی ہے اور سانس پھولنے لگتا ہے۔ سمندر کی سطح کے برابر زمین ہو تو انسان کے پھیپھڑوں میں آکسیجن کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے یعنی ایک مربع انچ میں آکسیجن کا دباؤ دو پونڈ (ایک کلو وزن) کے برابر ہوتا ہے لیکن یہ آکسیجن خون میں شامل ہو جاتی ہے اور سارے جسم میں گردش کرتی ہے۔ پہلے خون کا رنگ لاجوردی یعنی نیلا ہوتا ہے جب آکسیجن شامل ہو جاتی ہے تو اس کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ بیس ہزار فٹ کی بلندی پر ایک مربع انچ میں آکسیجن کا دباؤ آدھا رہ جاتا ہے یعنی صرف ایک پونڈ۔ انسان گہرا اور تیز تیز سانس لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ پھیپھڑوں کی کارکردگی زیادہ بڑھ جاتی ہے یعنی پھیپھڑوں کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ وہ جلدی تھک جاتے ہیں چونکہ آکسیجن کی سپلائی جسم کے دوسرے حصوں میں بھی کم ہو جاتی ہے اس لیے آکسیجن جسم کے دوسرے حصوں میں بھی کم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جسم کے دوسرے حصے بھی جلدی تھک جاتے ہیں۔ گویا انسان کا سارا جسم تھکاوٹ سے چور ہو جاتا ہے۔ سخت کام ہو نہیں پاتا، چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پھیپھڑے دس فیصد تک بڑھ جاتے ہیں اور دل کا دایاں حصہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ پھیپھڑے اور دل اس لیے بڑھتے ہیں کہ پھیپھڑوں میں خون اور آکسیجن کی کمی کو پورا کر سکیں۔

وہ صبح آٹھ بجے چلے تھے اور اب ایک بج رہا تھا۔ پانچ گھنٹے سفر ہونے کے بعد میجر نوری نے فیصلہ کیا کہ اب آرام کرنا چاہیے۔ چنانچہ وہ رُکے اور انہوں نے اپنے خیمے گاڑھ لیے۔ یہ کیمپ نمبر ۲ قرار پایا۔

میجر اور کیپٹن کھانا کھانے کے بعد امریا کی ریکی کرنے کے لیے چل پڑے۔ سلطان نے نیزہ لیا اور مارخور کے شکار کے لیے چل پڑا۔ مائیکل پتھروں کے موضوع پر کتاب پڑھنے لگا اور ابراہیم نماز پڑھنے کے بعد رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگا۔

وہ سب شام کو اکٹھے ہو گئے اور کھانا کھانے کے بعد سو گئے۔ وہ پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر سو رہے تھے اس وقت۔

برفانی چیتا

رات برفانی چیتا مائیکل کے خیمہ میں گھس آیا اور اس نے مائیکل پر حملہ کر دیا۔ مائیکل کا شور سن کر سبھی اس کے خیمہ کی طرف بھاگے۔ برفانی چیتے کا وزن پچاس پونڈ سے لے کر نوے پونڈ تک ہوتا ہے۔ مادہ چیتا تین یا چار بچوں کو جنم دیتی ہے۔ یہ بچے پلوں سے بڑے ہوتے ہیں لیکن بہت دلیر اور گوشت کھانا پسند کرتے ہیں۔ گوشت نہ ملے تو دودھ پر گزارہ کرتے ہیں۔ کوہ پیماؤں کو کئی بار یہ بچے برف زاروں میں مل جاتے ہیں اور وہ ان کو پالتے ہیں لیکن ان سے ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ لاڈ پیار بھی کریں تو کاٹ کھاتے ہیں۔

برفانی چیتا سخت قسم کی برفانی چٹانوں میں بسیرا کرتا ہے۔ بھوک مٹانے کے لیے اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا ہے اور شکار کرتا ہے۔ لیل (پہاڑی بکرا)، مارخور (سانپ کھانے والا جنگلی بکرا) اور خرگوش کا خاص طور پر شکار کرتا ہے چوہے بلی کو بھی نہیں چھوڑتا۔ پالتو جانور قابو آ جائیں تو معاف نہیں کرتا۔ بھیڑ یا، لومڑی نظر آ ئیں تو ان کا پیچھا کر کے ان کو ہلاک کرتا ہے اور خوشی سے ان کا گوشت خود بھی کھاتا ہے اور اپنے بچوں کو بھی کھلاتا ہے۔

برفانی چیتے کو شکار کرنا بے حد مشکل ہے۔ اگر ناممکن کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ یہ سخت خطرناک جانور ہے اس لیے قابو نہیں آتا۔ اگر اسے زندہ پکڑ لیا جائے تو شکار گاہ سے بستی تک لانا بہت مشکل ہے، کاٹ کھاتا ہے۔ ۱۹۷۶ء میں ایک مادہ چیتا بلتستان کے ایک گاؤں میں پکڑی گئی تھی۔ اسے لاہور کے چڑیا گھر میں بھیج دیا گیا۔ اس کے لیے ایک خاص کمرہ بنایا گیا۔ اس کمرہ کو ایئر کنڈیشن کیا گیا لیکن اس کے باوجود چڑیا گھر میں زندہ نہ رہ سکی۔ برفانی چیتا اتنا خوبصورت درندہ ہے کہ اس کی کھال یعنی چمڑا امریکہ میں پندرہ سولہ لاکھ میں فروخت ہوتا

ہے۔ یاد رہے کہ برفانی چیتے کا شکار سرکاری طور پر منع ہے اور اگر کوئی شخص شکار کرتا ہوا پکڑا جائے تو اسے قید بامشقت اور جرمانے کی سزا بھگتنا پڑتی ہے۔

(اس ناول کا مصنف ۸۲۔۱۹۸۱ء میں بلتستان میں تھا اور اس نے برفانی چیتے کے ایک شکاری پر مقدمہ کی کارروائی خپلو میں اپنی آنکھوں سے دیکھی اور کانوں سے سُنی)

برفانی چیتے نے مسٹر مائیکل کا بایاں بازو اپنے تیز نوکدار دانتوں سے کھدیڑا اور ادھیڑ دیا تھا اور کیپٹن تنویر اپنے ریوالور سے ہوا میں فائر نہ کرتا تو شاید برفانی چیتا بازو کو منہ میں دبا کر وہیں بیٹھ کر ترنوالہ بنا لیتا۔ میجر، سلطان اور ابراہیم کے شور سے اور کیپٹن تنویر کے فائر سے برفانی چیتا مسٹر مائیکل کو خون میں لت پت چھوڑ کر بھاگ گیا۔

جب وہ تینوں خیمہ میں داخل ہوئے تو مائیکل مارے ڈر کے بلبلا رہا تھا۔ سلطان خود شکاری تھا۔ اس نے اپنا مفلر اتار کر اس کے بازو پر باندھا۔ مفلر خون سے تربتر ہو گیا۔ خون تھا کہ رُکنے کا نام نہ لیتا تھا۔ میجر بھاگ کر اپنے خیمے میں گیا اور مرہم پٹی لے آیا۔ اس نے روئی کے گالے پر مرہم لگائی اور پٹی باندھی۔ پٹی دیکھتے دیکھتے سرخ ہو گئی لیکن خون تھوڑی دیر بعد رک گیا۔ ٹارچ کی پیلی روشنی میں مائیکل کے چہرے کا رنگ پیلا پت ہو گیا تھا اور اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ ابراہیم بھاگ کر اپنے خیمہ میں گیا۔ ہیٹر جلایا، برف پگھلائی اور اس کا پانی لے کر آیا۔ پانی پینے سے مائیکل کا اکھڑا ہوا سانس بحال ہوا۔ دراصل درد سے زیادہ وہ خوف میں مبتلا تھا۔

میجر نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے تین بج رہے تھے۔ وہ باقی رات سو نہ سکے اور جب صبح ہوئی تو مائیکل اور سلطان نے کافی پی۔ تھوڑا تھوڑا ہنٹر بیف لیا اور واپس سرمو کی طرف چل دیئے۔ مائیکل ایک پل کے لیے بھی مہم کا ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھا۔ میجر نے روانہ ہونے سے پہلے سلطان کو حکم دیا کہ وہ بروق پا کو لے کر واپس آئے۔ بروق پا خپلو میں تھا۔

دراڑ یا درز

اب ہوا یہ کہ جو سامان پانچ آدمی اُٹھا کر لائے تھے اسے اب تین آدمی اٹھانے پر مجبور تھے۔ اصل میں یہ تین آدمی نہیں تھے، ڈھائی آدمی تھے۔ میجر اور کیپٹن دو اور ابراہیم آدھا آدمی کیونکہ وہ بارہ سال کا لڑکا تھا اور ناتجربہ کار بھی تھا۔ بہرحال وہ تینوں تین خیمے اور دوسرا سارا ساز و سامان اٹھا کر گولڈن ٹاور کی طرف چل دیئے۔

میجر نے تھرمامیٹر دیکھا درجہ حرارت بارہ ڈگری تھا یعنی نقطہ انجماد، (برف جم جانے کا نقطہ) سے بارہ درجہ اوپر۔ آلٹی میٹر (Altimeter) سطح سمندر سے بلندی ساڑھے پندرہ ہزار ظاہر کر رہا تھا۔ موسم ٹھیک تھا ہر طرف برف تھی جو جم چکی تھی۔ کہیں کہیں پتھر اور چٹانیں نظر آتی تھیں۔ ان کے سامنے گولڈن ٹاور کی چوٹی دمک رہی تھی لگتا تھا بہت قریب ہے لیکن وہ قریب نہ تھی۔ اب بھی وہ دن بھر کے فاصلہ پر تھی یعنی میلوں دور۔

ان کی دائیں جانب، نیچے گلیشیر سورج کی کرنوں میں چمک رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے لاکھوں من چاندی خشک ہونے کے لیے انڈیل دی ہے۔ منظر کی یکسانگت سے تنگ آ کر ابراہیم سیٹی پر رانی مندوق کا گیت گانے لگا:

تم بہادر ہو
تم دیس بدیس گھومتے ہو
تمہارے ساتھ تمہارے سالار اور لشکری ہیں
تم اپنے دشمنوں سے جنگ آزما ہو
اور بہادری کے جوہر دکھاتے ہو

کامیابی تمہارے قدم چومتی ہے
خزانے تمہارے قدموں میں ڈھیر ہو جاتے ہیں
میں اکیلی ہوں اور تجھے یاد کرتی ہوں
میں پانچوں وقت تمہاری کامیابی کی دعا مانگتی ہوں
میرے ساتھی، اب گھر لوٹ آؤ
میرے محل کے باغ کے پھول میری طرح
تمہارے منتظر ہیں
ان بلند پہاڑوں کے کسی درہ سے
چلے آؤ
اپنے سالاروں اور لشکروں سمیت
میرے بہادر سرتاج

جب سورج ڈھلنے لگا تو ان کے سامنے ایک بہت بڑی دراڑ (درز) منہ کھولے کھڑی تھی۔ اس کو پار کرنا انسان کے بس میں نہ تھا۔ وہ رکنے پر مجبور ہو گئے۔ انہوں نے دو خیمے برف میں گاڑھے، ایک میجر اور کیپٹن نے اپنے لیے اور ایک ابراہیم کے لیے جو باورچی بھی تھا۔

ابراہیم کھانا تیار کرنے لگا اور میجر اور کیپٹن ریکی کے لیے نکل گئے۔ وہ ایک گھنٹہ تک سکی انگ کرتے رہے لیکن ان کو نہ برفانی انسان نظر آیا اور نہ برفانی چیتا۔ جب وہ واپس آئے تو کھانا تیار ملا۔

میجر اور کیپٹن دونوں خاموش تھے وہ دونوں دراڑ کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھے۔ میجر کا علم بتا رہا تھا کہ گہری عمودی دراڑیں گلیشیر میں پڑتی ہیں۔ کیا وہ گلیشیر پر سفر کر رہے تھے؟ نہیں۔ گلیشیر تو ان کے دائیں جانب تھا اور حد نگاہ سے نیچے تھا۔ وہ تو اب اوپر جا رہے تھے۔ سیدھے گولڈن ٹاور کی طرف۔ پتھروں اور چٹانوں کو چھوڑ کر ہر طرف برف ہی برف تھی۔ یہ دراڑ کہاں سے آ گئی۔

''سر! آپ دراڑ کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟'' کیپٹن بول اُٹھا۔ وہ خاموشی سے تنگ آ گیا تھا۔

''جی ہاں۔ دراصل ایسی دراڑ اس وقت پیدا ہوتی ہے جب گلیشیر کی لاکھوں من برف نیچے کی طرف سرکتے سرکتے ایک دم ڈھلان کی وجہ سے تیز ہو جاتی ہے۔ اس وقت ڈھلان کی وجہ سے اوپر کی برف اور نیچے کی برف ٹوٹ جاتی ہے اور دراڑ بن جاتی ہے کیونکہ گلیشیر کی رفتار میں تیزی آ چکی ہوتی ہے جب ڈھلان عمودی نہیں رہتی تو گلیشیر کا آدھا کٹا ہوا حصہ یعنی برف کے نچلے حصے سے آ ملتا ہے اور دراڑ ختم ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت میں برف کی سطح ہموار نہیں رہتی۔ اس میں کٹاؤ آ جاتا ہے۔ جب دراڑ پڑتی ہے تو سورج کی گرمی سے برف کے اوپر کے حصے پگھل جاتے ہیں اور جب دوبارہ وہ حصّے ملتے ہیں تو اوپر نیچے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی سطح برابر نہیں رہتی یعنی ناہموار ہو جاتی ہے۔ دراڑ تو بند ہو جاتی ہے لیکن گلیشیر کی سطح ناہموار ہو جاتی ہے۔ دراڑ پیدا ہونے کی ایک اور صورت تب پیدا ہوتی ہے جب گلیشیر چلتے چلتے موڑ کاٹتا ہے۔ بہرحال یہ گلیشیر کی دراڑ نہیں ہے پہاڑی دراڑ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ کسی زمانہ میں اس علاقہ میں بھونچال آیا ہوگا۔'' میجر نے ایک ماہر کی طرح کیپٹن کو سمجھایا اور پھر وہ دونوں کھانا کھانے لگے۔

میجر نوری اور کیپٹن تنویر کھانا کھانے اور چائے پینے کے بعد اپنے خیمے میں کتابیں لے کر پڑھنے لگے اور ابراہیم سلطان کا نیزہ لے کر شکار کے لیے چل پڑا۔

پہاڑی ہوا چل رہی تھی۔ پہاڑی ہوا وہ ٹھنڈی ہوا ہوتی ہے جو پہاڑ کی طرف سے آتی ہے اور وادیوں اور ڈھلوانوں کی طرف چلتی ہے۔ اس کے اُلٹ وادی کی ہوا ہوتی ہے جو پہاڑی ہوا کے اُلٹ چلتی ہے۔ دن کے وقت سورج کی گرمی سے وادی کی ڈھلوانیں گرم ہو جاتی ہیں اور ان گرم ڈھلوانوں کے اوپر کی ہوا گرم ہو کر اُوپر چلی جاتی ہے اور وادی میں چلنے لگتی ہے۔ رات کے وقت اس کی جگہ پہاڑی ہوا لے لیتی ہے۔ یہ ہوائیں ایک دوسری کی جگہ صرف اُسی صورت میں لے سکتی ہیں جب موسم ٹھیک ہو۔ موسم خراب ہو جائے تو ہواؤں کے معمول میں فرق اور بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔

ابراہیم ایک گھنٹے تک شکار تلاش کرتا رہا۔ اسے کچھ نہ ملا۔ وہ چاہتا تھا اسے مارخور، اڑیال یا خرگوش نظر آ جائے تو ان میں سے کسی ایک کو شکار کر کے اپنے صاحبوں سے شاباش لے لیکن اس کی قسمت کہ اسے شکار نہ ملا۔

وہ ایک چٹان سے نکل کر موڑ کاٹ رہا تھا کہ اس نے دو جگمگاتی آنکھیں دیکھیں جو ایک بڑے پتھر کے سائبان نما چھجہ سے اسے جھانک رہی تھی۔ وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ دونوں آنکھیں اب اسے گھور رہی تھیں۔ اسے بس وہ دو آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں جیسے اوور کوٹ کے دو بڑے بٹن ہوں اور وہ پیتل کے بنے ہوئے ہوں۔ آنکھوں کے پیچھے جو چیز تھی وہ مٹیالے پتھر میں پردہ کیے بیٹھی تھی۔ اس نے سلطان کا نیزہ آہستہ آہستہ آنکھوں کی جانب بڑھایا۔ اس خیال سے کہ شاید آنکھیں بند ہو جائیں لیکن مجال ہے کہ جو آنکھوں میں کوئی تبدیلی آئی ہو۔

ابراہیم نے نیزہ ایک طرف رکھ دیا اور گھٹنوں کے بل جھک کر دیکھا اسے کتے کا پلا نظر آیا۔ ابراہیم نے کمبل اتار کر اس پر پھینکا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اس کو کمبل میں قید کر لیا۔

پلا اٹھا کر وہ سر پر بھاگا۔ اسے نیزہ اٹھانے کا بھی خیال نہ آیا اور سیدھا میجر کے خیمہ میں داخل ہوا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ دونوں لیٹے ہوئے تھے۔ ایک دم اٹھ کھڑے ہوئے۔

''خیر ہے نا؟'' میجر بولا۔

''جی جی، خیر ہے'' بمشکل ابراہیم بولا اور پھر نیچے بیٹھ کر کمبل کی تہہ کھولنے لگا''۔ پلا باہر آ گیا اور بڑھ کر کیپٹن تنویر کے ایک پیر کی جراب چبانے لگا۔ کیپٹن نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا۔

''یہ بھوکا ہے اسے ہنٹر بیف دو۔'' میجر بولا۔

''یہ ہے کیا سر؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''یہ اس مادہ چیتے کا بچہ ہے جس نے کل رات مائیکل کا بازو چبایا تھا۔'' میجر بولا۔

''اس کا مطلب ہے کہ وہ مادہ چیتا ہمارے اردگرد گھوم رہا ہے یا گھوم رہی ہے۔'' کیپٹن نے یوں کہا جیسے خود سے گفتگو کر رہا ہو۔

''یقیناً۔ شاید آج رات وہ اپنا بچہ لینے واپس آئے۔'' میجر خوش ہو کر بولا۔

''ہم اس کا انتظار کریں گے۔'' کیپٹن نے کہا اور بچے کو نیچے فرش پر رکھ دیا۔ ابراہیم ہنٹر بیف کا ٹکڑا لے آیا اور چیتے کے بچہ کو کھلانے لگا۔

رات کا مہمان

ان کے خیموں کے پیچھے دراڑ تھی۔ دراڑ کو پاٹنا یا عبور کرنا نہ انسان کے بس میں تھا اور نہ کسی درندہ کے بس میں۔ ہاں پرندے عبور کر سکتے تھے۔ انسان یا درندے کی چھلانگ بیکار تھی جو چھلانگ لگاتا دراڑ میں گر کر مر جاتا۔

طے یہ ہوا کہ ابراہیم اکیلا خیمہ میں نہیں سوئے گا۔ وہ بھی میجر کے خیمہ میں رہے گا کیونکہ خطرہ تھا مادہ چیتا یا نر چیتا اس پر حملہ نہ کر دے۔ میجر نے خیمے کے اندر کیل ٹھونکی اور رسی کا ایک سرا کیل سے باندھا اور دوسرا سرا چیتے کے بچے کے گلے میں ڈال کر اسے باہر چھوڑ دیا۔ رسی ریشمی تھی اور سخت تھی۔ یہ خطرہ نہ تھا کہ بچہ چبا لے گا۔ ویسے بھی بچہ بھوکا نہ تھا۔ رسی کی لمبائی پندرہ فٹ تھی اس لیے بچہ کھل کر باہر گھوم سکتا تھا۔

میجر نے ابراہیم سے کہا کہ وہ سو جائے لیکن ابراہیم کو نیند کہاں؟ وہ کمبلوں کے اندر بھی جاگ رہا تھا۔ آخر آدھی رات کے بعد اسے نیند آئی۔

''آپ بھی سو جائیں۔ میں پہرہ دوں گا۔'' کیپٹن تنویر بولا۔

''مجھے نیند نہیں آئی۔ جب آئے گی سو جاؤں گا۔'' میجر یہ کہہ کر دوبارہ کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہو گیا۔

دو بجے کے قریب میجر نے کتاب بند کی اور کمبلوں میں گھس کر سو گیا۔ ان کے پاس صرف ایک سلیپنگ بیگ تھا جو مائیکل کا تھا لیکن وہ بھی خالی پڑا تھا۔ کسی نے اس میں گھس کر سونا پسند نہ کیا۔

چیتے کا بچہ باہر گھوم پھر کر خیمہ کے اندر آ گیا تھا اور ابراہیم کے پیروں میں کمبل کے اندر

لیٹ گیا تھا۔

صبح کے پانچ بجے ابراہیم کی آنکھ کھلی تو بچہ اس کے پیروں میں لیٹا تھا۔ اس نے اسے وہیں رہنے دیا اور خود کیپٹن تنویر کے پاس جا کر بولا۔

''سر! صبح ہونے والی ہے۔''

''ابھی کافی رات باقی ہے'' کیپٹن بولا۔ اس نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے پانچ بج رہے تھے۔

''سر! میں اس وقت نماز کے لیے اٹھا کرتا ہوں۔ میرا خیال ہے صبح ہونے والی ہے۔ آپ اب آرام کریں، میں پہرہ دوں گا'' ابراہیم ضد کرنے لگا۔

''پہاڑوں میں سویرا جلدی نہیں آتی۔ تم سو جاؤ۔'' کیپٹن نے زور دے کر کہا۔

''سر! میں نماز پڑھتا ہوں اس کے بعد آپ کی اجازت سے پہرہ دوں گا۔''

ابراہیم نے ہیٹر جلایا، برف کو گرم کیا اور پھر وضو کر کے نماز پڑھنے لگا۔ نماز سے فارغ ہو کر وہ کیپٹن کے پاس آیا اور بولا۔

''سر! اب میں پہرہ دوں گا۔''

کیپٹن خیمہ کے دروازہ سے اٹھ کر اپنے بستر میں آیا، کمبل اوڑھا اور جلد سو گیا۔

چھ بجے کے قریب جب مٹیالی اور ملگجی روشنی پھیل رہی تھی، اس نے مادہ چیتے کو دیکھا۔ وہ سیدھی خیمے کی طرف آ رہی تھی۔ آہستہ آہستہ ایک شان سے۔ اس کی آنکھیں چراغوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ لمبا جسم، لمبی دم، اس کا منہ کھلا تھا۔ زبان اور دانت نظر آ رہے تھے۔ وہ قریب آ گئی تھی۔ ابراہیم کا دل چاہا کہ وہ چلاّ کر میجر اور کیپٹن کو جگا دے لیکن اس نے سوچا وہ پہریدار ہے۔ چوکیدار کا بیٹا پاسبانی کا فرض سرانجام دے رہا ہے۔ اس نے ریوالور دونوں ہاتھوں سے پکڑا اور لوڈ کیا۔

مادہ چیتے کی غراہٹ اب سُنائی دے رہی تھی۔ لگتا تھا وہ سخت غصہ میں ہے لیکن ساتھ ساتھ محتاط بھی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان خیموں کے اندر کیا ہے۔ خیمہ کے پردہ کی اوٹ میں سے ابراہیم اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ البتہ ابراہیم اسے دیکھ رہا تھا۔

اب مادہ چیتے کی غراہٹ اور قریب آ گئی تھی۔ ابراہیم نے محسوس کیا کہ وہ چھلانگ لگا رہی ہے۔ اس نے تاک کر ریوالور چلایا۔

ایک دم خیمہ کے اندر اور خیمہ کے باہر شور اُٹھا۔ پہلے کیپٹن اور پھر میجر خیمہ کے باہر تھے اور ان کے ریوالور مادہ چیتے پر تن چکے تھے لیکن چیتا ٹھنڈی برف میں تڑپ رہا تھا۔

''ابراہیم باہر آؤ!'' میجر نے ابراہیم کو بلایا۔

وہ باہر آیا۔ ریوالور اس کے دائیں ہاتھ میں تھا اور چیتے کا جسم تھرتھرا رہا تھا۔

''اس کے پیٹ میں ایک گولی اور داغ دو'' میجر نے کہا اور ابراہیم نے دوسری گولی چیتے کے پیٹ میں اُتار دی۔ گولی کی آواز گونجی اور اس کی بازگشت گولڈن ٹاور کے اُوپر تیرنے لگی۔

چیتے کا بچہ بھی باہر آ گیا تھا اور اپنی ماں کا منہ سونگھ رہا تھا۔ روشنی آہستہ آہستہ اندھیرے کی جگہ لے رہی تھی۔ دن چڑھ رہا تھا۔ میجر اور کیپٹن نے خنجر اور چاقو کی مدد سے کھال اُتاری اور مادہ چیتے کا پیٹ صاف کر کے اسے برف میں دبا دیا۔

میڈیکل رپورٹ

ابراہیم اپنے گاؤں میں دیکھ چکا تھا کہ کھال کو نمک لگا کر دھوپ میں ڈال دیا جاتا ہے تاکہ اس کی نمی خشک ہو جائے۔ چنانچہ اس نے اسی وقت دو مٹھی نمک لیا اور کھال کی اندرونی سطح پر چھڑکا اور پھر کھال کے اندر سے مالش کرنے لگا تاکہ نمک کھال میں اچھی طرح سے جذب ہو جائے۔ نمک لگانے سے کھال کی بساند بھی کم ہو جاتی ہے۔

جب اچھی طرح سے نمک کھال کی اندرونی سطح میں جذب ہو گیا تو اس نے کھال کو خیمہ کے اوپر ڈال دیا تاکہ دھوپ میں خشک ہو جائے۔ مادہ چیتے کا دل جگر وغیرہ اس روز اس کے بچہ نے جی بھر کر کھائے اور مزہ سے خیمہ کے اندر سویا رہا۔

معلومات حاصل کرنے کے لیے میجر نوری اور کیپٹن تنویر سکی انگ کرتے ہوئے دُور دُور تک چکر لگاتے رہے اور جب دن کا ایک بجا تو واپس آئے۔ ان تینوں نے پہلے نماز ادا کی اور پھر کھانا کھایا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ تینوں کمبل اوڑھ کر سو گئے۔ جب ان کی آنکھ کھلی تو سورج ڈوب چکا تھا اور تاریکی چھا رہی تھی۔ آسمان صاف تھا اور تارے چمک رہے تھے، مدھم مدھم۔

''ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔'' کیپٹن نے کہا۔

''کیوں بھلا؟'' میجر نے پوچھا۔

''سر! انسان چند دن تو برف میں رہ سکتا ہے لیکن سالوں بھر تو ایسے برف زاروں میں نہیں رہ سکتا۔'' کیپٹن بولا۔

''ٹھیک بات ہے لیکن کیا کیا جائے ہم یہاں سے دائیں بائیں رُخ سفر نہیں کر سکتے۔ سلطان سے کہا گیا تھا کہ وہ بروق پا کو لے کر یہاں آئے اگر وہ اسے لے کر یہاں آیا تو

پریشان ہو گا کیونکہ ہم تو یہاں سے جا چکے ہوں گے۔'' میجر بولا۔

''آپ نے درست کہا سر لیکن سلطان تو چار چھ دن تک نہ آ سکے گا۔ آخر اسے سُرمو سے چلو جانا ہو گا اور پھر بروق پا کو لے کر واپس آنا ہو گا۔''

''ہم انتظار کر سکتے ہیں۔ اگر برفانی انسان کو زندہ پکڑنا ہے تو پھر بروق پا کا ہماری ٹیم میں شامل ہونا بہت ضروری ہے کیونکہ دنیا میں وہ اکیلا شخص ہے جو برفانی انسانوں کی زبان بولتا اور سمجھتا ہے۔''

''دگوش، دگوش، دوڑو۔ بھاگو۔ ہاں وہ بہت قیمتی انسان ہے۔'' کیپٹن بولا۔

''اس کے علاوہ میں چاہتا ہوں وہ دُنیا کی نظروں سے اوجھل رہے کیونکہ ابھی تک برفانی انسان کے متعلق ہماری معلومات ناقص ہیں۔ یعنی ان کی بیان کی ہوئی باتوں پر ہے۔''

''سر! آپ کی یہ بات بھی سو فیصد درست ہے۔ اخبار نویسوں کو پتہ چلا کہ بروق پا کچھ دنوں برفانی انسانوں کے ساتھ رہا ہے تو وہ تو اس کی ایک ایک بات کا بتنگڑ بنا ڈالیں گے۔ رائی کا پہاڑ کھڑا کر دیں گے۔ خوب مرچ مسالہ لگائیں گے۔''

''مزہ تو کیپٹن تب آئے گا جب ہم برفانی انسان کو زندہ پکڑیں گے۔''

''سر مجھے تو بہت مشکل لگتا ہے۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا حالانکہ سینکڑوں مہمیں یتی کو پکڑنے کے لیے منظم کی گئی ہیں۔ میں نے پچھلے دنوں پڑھا تھا کہ روس کی حکومت بھی یتی کو پکڑنے کے لیے ٹیمیں تیار کر رہی ہے۔''

''کیپٹن! روس ہو یا امریکہ، یتی کو وہی لوگ پکڑ سکتے ہیں جو یتی کا پیچھا کرتے ہیں۔ یتی کی زبان جانتے ہیں۔ اس کی نفسیات اور ذہن کو سمجھتے ہوں۔ یتی کو پکڑنے کے لیے برف زاروں میں زندگی گزارنا ہو گی۔''

''سر! انسان چند دن تو برف میں رہ سکتا ہے لیکن سالوں برف میں رہنا محال ہے۔'' کیپٹن نے کہا۔

''برف میں رہنا محال کیونکر ہوا؟ گرین لینڈ اور آئس لینڈ کے لوگ بھی تو برف ہی میں رہتے ہیں۔'' میجر نے دلیل دی۔

''رہنے کو تو بہت سے لوگ برف کے سمندر یعنی آرکٹک اوشین (Arctic ocion) میں

بھی رہتے ہیں۔ لفظ ذرا مشکل ہیں لیکن خوب ہیں ایک منطقہ بارد شمالی اور ایک منطقہ بارد جنوبی ہے یعنی وہ دنیا کے شمال میں برف کا علاقہ ہے اور دنیا کے جنوب میں بھی برف کا علاقہ ہے۔ ان علاقوں میں برف ہی برف ہے یعنی یہ برف کے سمندر ہیں۔''

''کیپٹن رکو۔ یہ تم مجھے بچوں کی طرح کیا سمجھا رہے ہو۔ خطہ بارد شمالی اور منطقہ بارد جنوبی.'' میجر غصہ میں آ کر بولا۔

''سر! یہ آپ کو نہیں سمجھا رہا یہ تو میں ابراہیم کو سمجھا رہا ہوں جو آپ کی پشت پر چپ چاپ بیٹھا باتیں سُن رہا ہے۔'' کیپٹن ادب سے بولا۔

''بھئی ننھے تم برابر یا سامنے آ کر بیٹھو، پیچھے کیوں بیٹھے ہو؟'' میجر بولا۔

''جی میں ٹھیک بیٹھا ہوں۔'' ابراہیم نے کسمساتے ہوئے کہا۔

''نہیں آؤ میرے برابر بیٹھو!'' میجر نے بازو بڑھا کر اس کا کندھا پکڑا اور ہلایا۔ ابراہیم اپنی جگہ سے اُٹھ کر میجر کے برابر آ کر بیٹھ گیا۔

''بیان جاری رہے۔'' میجر اب خوش دلی سے بولا۔

''ان علاقوں میں جن کا میں نے نام لیا، شدید سردی پڑتی ہے۔ سارا سال شدید سردی پڑتی ہے اور چھ مہینوں کا دن اور چھ مہینوں کی رات ہوتی ہے۔ ان علاقوں کو موسم کی تجربہ گاہ بھی کہا جاتا ہے کیونکہ موسم اچانک بدل جاتا ہے۔ سمندر کے ساحل پر آباد قصبوں اور آبادیوں میں منٹوں کے اندر اندر موسم یوں بدل جاتا ہے۔ سمندر کے ساحل پر آبادیاں برف کے اندر دب جاتی ہیں۔ برف تیزی سے گرتی ہے اور اس کی تہہ موٹی ہوتی ہے۔ بعض اوقات چیختے چلاتے، شور مچاتے برف باد اٹھتے ہیں اور جو چیز ان کے راستہ میں آئے اس کو چیر پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ بعض اوقات اچانک سخت قسم کا پالا پڑتا ہے یعنی ایسا پالا جو بے حد سخت ہوتا ہے۔ کئی بار شدید مقناطیسی طوفان اُٹھتے ہیں کئی بار تابکاری کے شدید جھکڑ اُٹھتے ہیں جن میں آکسیجن کی کمی ہوتی ہے۔ کبھی ہوا بے حد خشک ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ہوا کا دباؤ بھی شدت اختیار کر لیتا ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھ کر سوچئے کہ ان علاقوں یا منطقوں میں راتیں اور دن بے حد لمبے ہوتے ہیں۔''

''آپ جو بات کر رہے ہیں وہ سچی ہے بھلا ان سے کسی کو کیسے اور کیونکر اختلاف ہوسکتا

ہے کیپٹن۔ یہ سائنس کی باتیں ہیں اور حقیقت کا درجہ رکھتی ہیں۔ بعض اوقات حقیقت افسانہ سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔ آپ رک کیوں گئے ہیں۔ میں اور ابراہیم دلچسپی سے آپ کی باتیں سن رہے ہیں۔'' میجر پیار سے ابراہیم کو دیکھ کر بولا۔ اُسے اس وقت اپنا عمران یاد آ رہا تھا جس کی عمر بھی بارہ برس تھی اور شکل بھی ابراہیم سے قدرے ملتی جلتی تھی۔

''سر! ان سرد علاقوں میں رہنے والے لوگ بظاہر صحت مند دکھائی دیتے ہیں لیکن اصل میں وہ بیمار ہوتے ہیں۔ ان کی بیماری ذہنی بھی ہوتی ہے اور جسمانی بھی۔ ذہنی طور پر وہ کمزور دل اور ڈرپوک ہو جاتے ہیں یعنی ان کے حواس زیادہ مضبوط نہیں رہتے۔ جسمانی طور پر وہ سست اور کاہل ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے ماحول سے بے تعلق اور بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ کچھ چڑچڑے ہو جاتے ہیں اور کچھ اعصابی مریض بن جاتے ہیں۔ کچھ دوسرے لوگوں کو ماحول جارحیت پسند بنا دیتا ہے یعنی وہ معمولی معمولی بات پر مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ ہاں ایک بات اور بھی ہے جو لوگ کارخانوں میں کام کرتے ہیں یا گھروں سے باہر کوئی دوسرا کام کرتے ہیں وہ زیادہ سے زیادہ حادثات سے دوچار ہوتے ہیں گویا ان کی توجہ اپنے کام سے ہٹی رہتی ہے اور وہ حفاظتی تدابیر کی طرف پورا پورا دھیان نہیں دے پاتے۔'' کیپٹن سانس لینے کے لیے رکا۔

''یہ تو بے حد معلوماتی باتیں ہیں کیپٹن۔ یہ بتاؤ کہ شدید سرد علاقوں میں رہنے والے لوگوں کو کون کون سی بیماریاں تنگ کرتی ہیں۔ مثلاً'' ''نمونیہ'' میجر کیپٹن کی طرف دیکھنے لگا۔

''نمونیہ تو عام بیماری ہے سر! گرم علاقوں میں جب سردی کا موسم آتا ہے تو لاپرواہی برتنے والوں کو بھی نمونیہ ہو جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ انسان کا جسم مسلسل اور شدید سردی والے علاقوں میں تبھی تندرست رہ سکتا ہے جب وہ زیادہ سے زیادہ توانائی یعنی انرجی خرچ کرے۔ سرد ماحول سے مطابقت کے لیے انرجی کی ضرورت ہے جسم کو۔ بوڑھے لوگوں کے جسم میں انرجی کم ہوتی ہے اس لیے ان کا برا حال ہوتا ہے۔ وہ نوجوان جو جسمانی کام نہیں کرتے ان کو بھی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان سرد علاقوں میں نئے آنے والوں کا حال بھی اچھا نہیں رہتا۔ ان کو بھی موسمی حالات سے مطابقت کے لیے مشکلیں پیش آتی ہیں۔ وہ مزدور یا کارکن جن کی عمر ۳۵ سال سے زیادہ ہو ان کو ان علاقوں میں کام نہیں ملتا۔ ہاں اگر

کوئی خاص ہی صحت مند شخص ہو تو کام مل جاتا ہے ورنہ انکار کر دیا جاتا ہے۔ مختصر بات یہ کہ شدید اور طویل برف باری والے علاقے میں پھیپھڑوں کی بیماریاں اور دل کی بیماری کے بعد شوگر کی بیماری کا نام آتا ہے۔ جسم میں خون کی کمی کی شکایت بھی عام ہوتی ہے کیونکہ ہوا میں آکسیجن کم ہوتی ہے۔''

''آکسیجن پھیپھڑوں میں چھوٹی چھوٹی تھیلیوں میں آتی ہے وہاں کے خون میں شامل ہوتی ہے۔ خون آکسیجن کو سارے جسم میں بھجواتا ہے یا لے کر جاتا ہے اور یوں سارا جسم توانائی یا انرجی حاصل کرتا ہے۔ ہے نا کیپٹن'' میجر ہنس کر بولا۔

''سر! آپ کو تو سب معلوم ہے۔'' کیپٹن انکساری سے بولا۔

''مجھے آپ کی معلومات جان کر خوشی ہوئی خوب'' میجر خوش ہو کر بولا۔

سونے سے پہلے انہوں نے تھوڑا تھوڑا ہنٹر بیف کھایا اور پھر لیٹ گئے۔

''سر! پہرہ میں دوں گا۔ آپ اور ابراہیم آرام سے سو جائیں۔'' کیپٹن بولا۔ ''آل رائیٹ کیپٹن'' میجر نے کہا اور پھر سو گیا۔ اس نے خواب میں دیکھا برفانی انسان ڈگ بھرتے ہوئے اس پر حملہ کر رہے ہیں اور وہ اکیلا ان کا مقابلہ کر رہا ہے۔

رقص

پہرہ دینا آسان کام نہیں، مشکل کام ہے۔ کیپٹن تنویر بارہ بجے رات تک خیمہ کے اندر بیٹھ کر کتاب پڑھتا رہا۔ اس کی آنکھیں الفاظ پر تھیں لیکن کان خیمے سے باہر کی آوازوں کی تلاش میں مصروف تھے۔ کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ اگر کوئی آواز آتی تو وہ برف کے گالوں کی ہوتی۔ برف اپنے بوجھ سے گرتی تو ذرا دیر کے لیے آواز پیدا ہوتی۔ اس کے بعد پھر سناٹا چھا جاتا۔ پہاڑی ہوا رات کو چلتی تھی۔ وہ شام سے ہی گولڈن ٹاور کی طرف سے آ رہی تھی اور دور دراز کی وادیوں کا سفر اختیار کر رہی تھی۔ اس کی ہوا ایک خاص سرسراہٹ تھی جسے آواز کا نام دینا کچھ ٹھیک نہیں تھا۔

جب رات کے بارہ بجے تو کیپٹن نے لمبے مفلر میں منہ سر لپیٹا اور سکی انگ کے لیے باہر نکل آیا۔ وہ چاند کی روشنی میں ایک گھنٹہ تک خیموں کے اردگرد سکی انگ کرتا رہا۔ یہ اس کے جسم کے لیے ورزش تھی۔ جب اس کا جسم گرم ہو گیا تو اس نے سوچا اب خیمے میں جا کر پہرہ دینا چاہیے۔

وہ پہرہ دینے کے لیے جب خیمہ میں آیا تو ابراہیم خیمہ کے دروازہ سے باہر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''ارے اندر چلو سردی لگ جائے گی۔'' کیپٹن نے آہستہ سے کہا۔ اسے میجر کا بھی خیال تھا جو اندر سویا ہوا تھا۔

''میں سکی انگ سیکھنا چاہتا ہوں۔'' ابراہیم نے آہستہ سے کہا۔

''آؤ!'' کیپٹن نے کہا اور ابراہیم کو لے کر خیموں سے دور چلا گیا۔ اس نے ابراہیم کو چاند کی روشنی میں سکی انگ کی لکڑیاں استعمال کرنے کی تربیت بتائی۔ وہ ذہین لڑکا تھا بہت جلد

جان گیا۔ ویسے وہ پہلے بھی میجر اور کیپٹن کو سکی انگ کی لکڑیاں پیروں میں باندھتے ہوئے دیکھتا رہا تھا۔ اس لیے اسے وقت محسوس نہ ہوئی۔ سہارے کے لیے چھڑیوں کا استعمال بھی اسے جلد معلوم ہو گیا۔

چھڑیوں کو کس طرح استعمال میں لایا جائے اور پیروں میں بندھی لکڑیوں یا سٹکس کو کیسے استعمال کیا جائے؟ یہ دو باتیں ایسی تھیں جو مشق سے تعلق رکھتی تھیں۔ چنانچہ وہ کیپٹن تنویر کی ہدایت کے مطابق سکی انگ کرنے لگا۔ اس دوران میں وہ تین چار بار گرا لیکن خود ہی اٹھ کھڑا ہوا:

گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان جنگ میں

اس نے سوچا اور سکی انگ کی مشق کرتا رہا۔

ابراہیم اور کیپٹن تنویر سکی انگ کا سبق لے دے رہے تھے کہ خیمہ کی طرف سے میجر صاحب آ گئے۔

''آپ کیا کر رہے ہیں اس وقت؟'' میجر نے پوچھا۔

''سر! ابراہیم نے کہا تھا کہ وہ سکی انگ سیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا اس چاندنی میں سکی انگ ٹھیک رہے گی۔'' کیپٹن چاند کی طرف دیکھ کر بولا:

''ہاں کیا خوبصورت چاندنی ہے۔ میری آنکھ کھلی تو آپ دونوں غائب تھے۔ میرا خیال تھا آپ دونوں برفانی چیتے کی تلاش میں نکل گئے ہیں۔'' میجر نے ورزش کرتے ہوئے کہا ''آپ دونوں وارم اپ ہیں۔ میں بھی وارم اپ ہونا چاہتا ہوں۔''

''ضرور سر، ضرور۔'' کیپٹن بھی ورزش کرنے لگا۔

ابراہیم ان کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے دونوں لکڑیوں پر پاؤں رکھے اور چھڑیوں کی ٹیک سے دونوں فوجی افسروں کے اردگرد دائرہ بنا کر سکی انگ کرنے لگا۔

اچانک ابراہیم میجر کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور کان لگا کر آوازیں سننے لگا۔ اس کے کانوں میں انسانی آوازیں آ رہی تھیں۔

''صاحب جی! آپ آوازیں سن رہے ہیں؟'' اس نے میجر سے پوچھا۔

''ابراہیم! کون سی آوازیں؟ میں تو ورزش کر رہا ہوں۔'' میجر بولا!

''صاحب جی! ذرا سنو اب بھی آ رہی ہیں'' ابراہیم چاندنی میں ایک بڑی چٹان کی

طرف دیکھنے لگا۔ آوازیں اسی چٹان کی طرف سے آ رہی تھیں۔ کیپٹن بھی خاموش کھڑا ہو گیا۔ اب وہ تینوں خاموش کھڑے آوازیں سن رہے تھے۔

''آوازیں تو آ رہی ہیں۔ مدھم، دھیمی، دھیمی۔ یہ انسانی آوازیں نہیں ہیں۔'' کیپٹن بولا۔

''یہ آوازیں اتنی غیر انسانی بھی نہیں ہیں۔'' میجر نے کہا۔

''صاحب جی یہ برفانی انسانوں کی آوازیں ہیں۔'' ابراہیم بولا۔

''کیپٹن یہ آوازیں اس بڑی چٹان کی طرف سے آ رہی ہیں۔ ممکن ہے اس چٹان کے کسی حصہ میں برفانی انسان بیٹھے ہوں۔'' میجر بولا۔

''سر! کیا یہ طے ہو گیا ہے کہ یہ برفانی انسان کی آوازیں ہیں؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''یہ انسانی آوازیں نہیں ہیں۔ انسان اس طرح سے شور وغل نہیں کرتے۔ درندے اور چرندے بھی اس طرح کی آوازیں اپنے حلق سے نہیں نکالتے۔ پرندے رات کو سفر نہیں کرتے اور اگر کرتے ہیں اور بولتے ہیں تو ان کی آوازیں ہم پہچان لیتے ہیں۔ ابراہیم کا خیال درست ہے کہ یہ برفانی انسان ہیں۔'' میجر نے کہا اور ریوالور لے کر چٹان کی طرف چل دیا۔ کیپٹن نے بھی ریوالور نکالا اور پھر میجر کے پیچھے چل پڑا۔ ابراہیم ان دونوں کے پیچھے تھا۔

وہ دونوں نصف گھنٹہ چلتے رہے۔ وہ دونوں جھکے ہوئے تھے۔ ابراہیم ان کے پیچھے تھا۔ چٹان کے قریب پہنچے تو آوازیں ذرا صاف سنائی دینے لگیں۔ لیکن یہ آوازیں چٹان سے نہیں آ رہی تھیں۔ چٹان سے پرے نصف میل کے فاصلہ پر گلیشیر تھا۔ گلیشیر پر چھ سات برفانی انسان ناچ رہے تھے اور شور مچا رہے تھے۔ میجر، کیپٹن اور ابراہیم ان کو دیکھ سکتے تھے لیکن وہ ان تینوں کو دیکھنے سے قاصر تھے۔ چاندنی میں وہ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ مرد لمبے تھے، عورتیں موٹی تھیں اور بچے چھوٹے تھے۔ وہ تینوں چپ چاپ کھڑے برفانی انسانوں کا رقص دیکھ رہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے ان پر جادو کر دیا گیا ہو۔ دودھیا چاندنی میں یہ حیران کن ہی نہیں، ہوش ربا نظارہ تھا۔

وہ تینوں آدھ گھنٹہ تک برفانی انسانوں کا ناچ دیکھتے رہے پھر یہ ناچ ایک دم ختم ہو گیا اور وہ سب آہستہ آہستہ گلیشیر کے اُوپر چڑھنے لگے۔ یہ گلیشیر گولڈن ٹاور کی چوٹی سے پھوٹتا تھا۔ کیا وہ گولڈن ٹاور کی چوٹی پر جائیں گے؟ خیموں کی طرف آتے ہوئے میجر یہی سوچ رہا تھا۔

صبح تک وہ تینوں نہ سو سکے۔

خنجر آزمائی

صبح ہوئی تو ابراہیم نے چائے تیار کی۔ چائے کی پیالی سامنے رکھ کر کیپٹن بولا۔

''بھئی کیسا رہا رات کا رقص۔ میرا تو جی چاہتا تھا میں بھی ان میں شامل ہو جاؤں۔''

''صاحب جی! جس قسم کا ناچ وہ ناچ رہے تھے ویسا ناچ تو میں بھی ناچ سکتا ہوں۔''

ابراہیم چہک اُٹھا۔

''چلو اٹھو، ناچ دکھاؤ۔ چائے بعد میں پی لینا۔'' میجر خوش دلی سے بولا۔

ابراہیم نے کھڑے ہو کر اوٹ پٹانگ پیر چلائے تو میجر اور کیپٹن ہنس ہنس کر بے حال ہو گئے۔ ابراہیم بھی ہنسنے لگا اور پھر اس نے ناچ بند کر دیا اور فرش پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

واہ بھئی واہ۔ کمال کر دیا تم نے۔ برفانی انسان دیکھ لیتے تو داد دیتے۔'' کیپٹن بولا۔

''ہمیں اب سو جانا چاہیے۔ جسم کے لیے آرام ضروری ہے اور پھر پچھلی ساری رات ہم سردی میں کھڑے رہے ہیں۔'' میجر نے کہا اور کمبل اوڑھ کر لیٹ گیا۔

ابراہیم دوسرے خیمہ میں برتن رکھ کر واپس آ گیا اور کمبل اوڑھ کر کیپٹن کے قریب لیٹ گیا۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ باتیں کرنے لگا۔

''صاحب جی! آپ جسم اور آرام کی بات کر رہے ہیں۔'' اس نے کپتان سے پوچھا۔

''ہاں! میں نے کہا تھا کہ جسم کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہم روبوٹ نہیں کہ تھکنے نہ پائیں۔''

''یہ روبوٹ کیا ہوتا ہے؟''

''روبوٹ مشینی انسان ہوتا ہے جو انسانی ہدایت کے مطابق کام کرتا ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔ ہم مشینی تو نہیں ہیں۔''

''مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے جسم بھی مختلف ہوتے ہیں۔ جو لوگ سمندروں کے کنارے رہتے ہیں ان کے جسم ان لوگوں سے ذرا مختلف ہوتے ہیں جو ریگستان کے اندر رہتے ہیں۔ اسی طرح پہاڑی لوگوں کے جسم میدانی لوگوں کے جسم سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ سارا پانی اور ہوا کا اثر ہے۔ اگر میدانوں میں رہنے والے اس جگہ آ کر رہیں گے جس جگہ ہم اس وقت لیٹے ہیں تو ان کو بہت مشکل پیش آئے۔ ممکن ہے بہت سے لوگ، میرا مطلب ہے میدانی لوگ بیمار ہو جائیں گے اور کچھ مر جائیں گے لیکن پہاڑی لوگ اس جگہ آزاد رہیں گے تو ان کو میدانی لوگوں کی طرح زیادہ تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ جلدی اور آسانی سے مطابقت پیدا کر لیں گے۔ ماحول سے بیمار بھی نہیں ہوں گے۔ یہ ساری بات جسموں کی ہے۔'' کیپٹن تنویر کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح ابراہیم کو سمجھا رہا تھا جس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔

''آپ نے ٹھیک کہا سر۔ ہمارے گاؤں میں پہاڑی لوگ آتے ہیں تو خوش رہتے ہیں لیکن میدانی لوگ آتے ہیں تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ جلدی واپس چلے جاتے ہیں۔''

ابراہیم اپنے مشاہدے کی بات کرنے لگا۔

''سرد علاقوں میں جہاں سردی شدید ہوتی ہے اور لمبے عرصہ تک پڑتی ہے جسم اپنے آپ کو سردی سے بچاتا ہے۔ سردی سے بچاؤ تبھی ہو سکتا ہے جب انسان کے جسم کے اندر شوگر یعنی کھانڈ ہو۔ کھانڈ سے جسم کے اندر توانائی بنتی ہے اور توانائی سردی سے بچاتی ہے تو انسان کو ایسے کھانے کی ضرورت پڑتی ہے جس میں شوگر ہو، کھانڈ ہو تاکہ وہ انرجی میں تبدیل ہو کر جسم کی حفاظت کرے لیکن پہاڑی لوگ شوگر پسند نہیں کرتے۔ تم نے خود دیکھا ہے کہ یلتستان میں چائے میں شوگر نہیں ڈالتے نمک ڈالتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ شوگر مہنگی ہے اور لوگ غریب ہیں لیکن پھر بھی چینی کا استعمال کم ہے۔ جو لوگ یہاں غریب نہیں ہیں وہ بھی شوگر استعمال نہیں کرتے۔ ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے کہ پہاڑی لوگ شوگر کو زیادہ پسند نہیں کرتے۔ اس کے مقابلہ میں ان کو گوشت، مچھلی اور انڈے زیادہ پسند ہیں۔ وہ چربی بھی زیادہ خوشی سے استعمال کرتے ہیں۔ بلتی لوگ اور پٹھان لوگ چربی بہت پسند کرتے ہیں۔ پنجاب اور سندھ میں رہنے والے چربی پسند نہیں کرتے۔ بلوچستان بھی پہاڑی علاقہ ہے وہاں کے لوگ بھی چربی پسند کرتے ہیں۔

''سر! کیا آپ فوج میں آنے سے پہلے ڈاکٹری کرتے تھے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''کیا کہا آپ نے؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''سر! میں نے کہا کیا آپ ڈاکٹر تھے؟ کمانڈو بننے سے پہلے۔''

''نہیں میں ڈاکٹر تو نہیں تھا لیکن ہمیں ڈاکٹری پڑھائی جاتی ہے تاکہ ہمیں جسم کی اصلیت سے واقفیت ہو جائے۔ یوں سمجھ لو ہم کمانڈو لوگ چھوٹے موٹے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔''

''یہی تو میں کہتا ہوں سر، کہ آپ ڈاکٹر بھی ہیں۔ میں خود ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں لیکن قریب کوئی سکول ہی نہیں تھا۔ ابا نے کہا تم چوکیدار کے بیٹے ہو، بڑے ہو کر چوکیداری کرو گے۔ پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ ترمپا یعنی نمبردار کا بیٹا ڈاکٹر بن سکتا ہے لیکن سلطان بھی زیادہ نہیں پڑھا۔ دسویں جماعت میں فیل ہو گیا اور گھر آ گیا۔ اب وہ سارا دن شکار کھیلتا ہے۔ موسم خراب ہو تو گھر بیٹھ کر مرغ لڑاتا ہے۔ وہ شکاری ہے۔''

ابراہیم کی بات کا کیپٹن نے کوئی جواب نہ دیا۔

یہ کمانڈو لوگ بھی عجیب وغریب ہوتے ہیں جب جی چاہتا ہے سو جاتے ہیں جب جی چاہتا ہے جاگ اٹھتے ہیں۔ لڑائی مار کٹائی بھی جانتے ہیں اور ڈاکٹری بھی۔

ابراہیم کمانڈوز کے بارے میں سوچتا سوچتا سو گیا۔ جب تین گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ وہ خیمے میں تنہا لیٹا ہوا ہے۔ میجر اور کیپٹن خیموں سے باہر ورزش کر رہے ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے۔ اس نے دیکھا وہ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ میجر نے زور سے کیپٹن کی پسلیوں میں مُکا مارا تو کیپٹن نے بھی میجر کے منہ پر مُکا مارا لیکن میجر نے منہ دوسری طرف کر لیا اور مُکا کان کے نیچے گردن پر لگا۔ ابراہیم ان کو چھڑانے کے لیے بھاگ کر ان کے پاس گیا تو ان دونوں نے لڑنا بند کر دیا اور ہنسنے لگے۔

''کیا سمجھے مُنّے میاں؟'' میجر نے پوچھا۔ اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''میں سمجھا آپ لڑ رہے ہیں جی۔'' وہ بولا۔

''ہم ورزش کر رہے تھے۔ دیکھتے ہو نا ہمیں پسینہ آیا ہے۔'' میجر بولا۔ میجر کے ماتھے پر پسینہ چمک رہا تھا۔

وہ تینوں واپس خیمے کے پاس آ گئے۔

''تمہارا چیتا کیسا ہے'' کیپٹن نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ہے جی۔ گوشت بہت کھاتا ہے جی۔''

''کھلاؤ، خوب کھلاؤ۔ وہ اپنی ماں کا گوشت کھاتا ہے کسی غیر کا نہیں۔'' میجر بولا۔

''جب بھی ضرورت پڑے میں برف ہٹا کر چھری سے گوشت کاٹ لیتا ہوں۔'' ابراہیم نے بتایا۔

''بس یہی طریقہ ہے اس سے دوستی کا۔'' کیپٹن نے کہا۔

''چیتے کا بچہ میری سیٹی سمجھ لیتا ہے۔ جب سیٹی بجاؤں وہ لیٹا ہو تو اٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ کھڑا ہو تو کان کھڑے کر لیتا ہے پھر مجھے گھورتا ہے اور زبان نکالتا ہے۔''

''اسے کتے کے بچے کی طرح سدھاؤ۔'' میجر نے کہا۔

''میں اسے سدھا رہا ہوں۔ اُسے کنکری پھینک کر لانے کو کہتا ہوں تو وہ مجھے گھورتا ہے کنکری نہیں لاتا۔''

''گھبراؤ نہیں۔ ایک دن آئے گا کہ وہ کنکری بھی لائے گا اور پتھر بھی۔'' میجر بولا۔

''بڑی بات یہ ہے کہ تم بھی بچے ہو اور وہ بھی بچہ ہے۔ ہم تم کو ٹریننگ دے رہے ہیں اور تم اس کو ٹریننگ دے رہے ہو۔'' کیپٹن نے کہا۔

''ریوالور چلانا تو مجھے آ گیا ہے۔ میں اب اسے لوڈ بھی کر لیتا ہوں اور نشانہ بھی ٹھیک ہے۔ اس رات میں نے مادہ برفانی چیتے کو چت کر دیا تھا۔ سکی انگ کی مشق بھی کر رہا ہوں۔''

ابراہیم بے حد خوش تھا۔

''شاباش!'' کیپٹن نے ابراہیم کا کندھا تھپتھپایا ''چلو تمہیں خنجر کی تعلیم دیتے ہیں۔ آج کھانا میجر صاحب تیار کریں گے۔ کیوں میجر صاحب؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''مجھے منظور ہے۔'' میجر نے کہا اور کیپٹن خیمے کے اندر جا کر خنجر تلاش کرنے لگا۔

خنجر ملا تو وہ باہر آیا اور ابراہیم کو ساتھ لے کر اسی چٹان کی طرف چل دیا جس کی طرف وہ رات گئے تھے اور جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے برفانی انسانوں کا رقص دیکھا تھا۔

کیپٹن ابراہیم کو پینترے بدل بدل کر دشمن پر خنجر کا وار کرنے کی ترکیبیں بتاتا اور سمجھاتا رہا۔ جب ایک بجا تو وہ دونوں واپس خیموں کی طرف آئے۔ نہ صرف میجر بلکہ کھانا بھی ان کا انتظار کر رہا تھا۔

''کیسا ہے؟'' میجر نے پوچھا۔

''ذہین ہے۔ بات سمجھتا ہے۔'' کیپٹن نے کہا۔

اور پھر وہ تینوں چپ کر کے کھانا کھانے میں مشغول ہو گئے!

برفوق پا کی واپسی

میجر، کیپٹن اور ابراہیم اگلے دن شام سے پہلے سلطان اور برفوق پا آ گئے۔ گزشتہ رات بھی میجر کیپٹن اور ابراہیم اسی چٹان کے پاس گئے تھے اور انتظار کرتے رہے تھے لیکن برفانی انسانوں نے نہ آنا تھا اور نہ آئے چنانچہ دو گھنٹے انتظار کرنے کے بعد وہ تینوں واپس آ گئے۔ خیمے میں بیٹھ کر چائے پی اور پھر وہ تینوں سکی انگ کرتے رہے۔ ابراہیم کے پاس مائیکل کی سکی اِنگ کی لکڑیاں اور چھڑیاں تھیں جو میجر نے کاٹ چھانٹ کر اس کی ضرورت کے مطابق ڈھال لی تھیں۔

وہ رات تین گھنٹے تک سکی انگ کرتے رہے تھے اور پسینہ سے نچڑ گئے تھے۔ جب صبح کی سفیدی نمودار ہوئی تو وہ تینوں ایک ہی خیمے کے اندر لیٹ گئے اور ان کی دن کے بارہ بجے آنکھ کھلی۔

''ہم سکھ تو نہیں ہیں لیکن آنکھ بارہ بجے کُھلی ہے۔'' کیپٹن ہنس کر بولا۔

''سکھ کون ہوتے ہیں جی؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''تم نے آج تک سکھ نہیں دیکھا؟ کمال ہے!'' کیپٹن بولا۔

''نہیں جی۔'' ابراہیم نے یوں کہا جیسے کسی بہت بڑی نعمت سے محروم ہو۔

''سکھ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے سر پہ لمبے لمبے بال ہوتے ہیں، عورتوں کی طرح اور داڑھیاں ہوتی ہیں یہ بڑی بڑی۔'' کیپٹن نے بتایا۔

''برفانی انسانوں کے بھائی ہوئے نا جی۔'' وہ بولا۔

''بس تم یہی سمجھ لو کہ برفانی انسان کے بھائیوں کو سکھ کہتے ہیں لیکن سکھوں کا جسم ہماری

طرح ہوتا ہے۔ یہی پانچ چھ فٹ کا قد کاٹھ، ہماری طرح آنکھیں، بازو، ہاتھ پیر۔'' کیپٹن نے اسے سمجھایا۔

ابراہیم کوئی اور سوال داغنے والا تھا کہ میجر نے کہا۔

''سکھوں کے متعلق آج اتنا ہی کافی ہے۔ اب جا کر کھانا گرم کرو۔ ورزش خوب ہوئی اس لیے بھوک چمک اُٹھی ہے۔''

کھانا کھانے کے بعد وہ تینوں ایک بار پھر سکی انگ کرنے کے لیے چلے گئے اور گولڈن ٹاور کے مشرق اور مغرب میں چار پانچ گھنٹے گھومتے رہے۔ جب شام ہونے کو آئی تو واپس ڈیرے کی طرف آئے۔ برفوق پا، میجر اور کیپٹن کے خیمہ میں لیٹا ہوا تھا اور سلطان مائیکل کے خیمہ میں بیٹھا برفانی چیتے کے بچے سے کھیل رہا تھا۔

''ہینڈز اپ!'' ابراہیم نے سلطان کے پیچھے کھڑے ہو کر زور سے تعرہ کے انداز میں کہا۔ سلطان ہڑبڑا کر اٹھا تو ابراہیم ہنسنے لگا۔

''یہ کہاں سے لیا تو نے ابراہیم؟'' سلطان نے پوچھا۔

''سلطان بھائی۔ آپ تو شکاری ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کہاں سے ملا ہو گا۔'' ابراہیم نے خوش ہو کر کہا۔

''کسی پتھر کی اوٹ سے یا چٹان کی غار سے یا پہاڑ کی گُپھا سے۔'' سلطان بولا۔

''میں بتاتا ہوں'' کیپٹن قریب آ کر بولا ''یہ بچہ ابراہیم نے شکار کیا ہے۔ یہ اسے ایک بڑے پتھر کی اوٹ سے ملا تھا۔''

''مادہ چیتا ایک چھول میں تین چار بچے دیتی ہے۔ باقی بچے بھی وہیں کہیں ہوں گے۔'' سلطان نے اپنے تجربہ کی بناء پہ بتایا۔

''ہم نے بہت تلاش کیا لیکن باقی بچے نہیں ملے۔'' کیپٹن بولا۔

''اس بچے کی ماں ایک رات خیمے کی طرف آئی جسے میں نے ریوالور کی گولی سے چت کر دیا۔ کیسا؟''

''کمال ہے بھئی'' سلطان حیران ہو کر بولا ''تم تو چھپے رستم نکلے۔ کس چیز سے شکار کیا اس کا؟'' سلطان نے پوچھا۔

''بتایا نا، ریوالور کی گولی سے۔'' ابراہیم جلدی سے بولا۔

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تُو اب ریوالور بھی چلا سکتا ہے۔'' سلطان حیرت زدہ تھا۔

''یہ نہ صرف ریوالور چلا لیتا ہے بلکہ اس کا نشانہ بھی ٹھیک ہے۔'' کیپٹن خوشی سے بولا۔

''ریوالور مضبوط پکڑو۔ دونوں ہاتھوں سے پکڑو۔ ہاتھ مت ہلاؤ۔ نشانہ پر نگاہ رکھو۔ آنکھیں مت جھپکو.....'' کیپٹن صیب نے مجھے یہ بتایا، پڑھایا اور سکھایا ہے''

''واہ میرے لال۔ کمال ہو گیا۔'' سلطان نے ابراہیم کو شاباش دی۔ وہ تینوں ''باورچی خانہ'' سے میجر صاحب کے کمرہ میں آ گئے جہاں میجر اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ اخبار ''صدائے وطن'' تھا۔ اس اخبار کی شہ سرخی بروق پا کے بارے میں تھی۔ بروق پا کی تصویر بھی چھپی تھی۔ دوسری شہ سرخی وزیراعظم پاکستان کا بیان تھا۔ تصویر میں بروق پا وہ بلتی ٹوپی اور ڈفل پہنے ہوئے تھا۔ بلتی ٹوپی تو اس کی اپنی تھی البتہ ڈفل پروفیسر الیگزنڈر کا تھا۔ خبر کی پہلی سرخی جو جلی حکم سے لکھی گئی تھی:

''کمانڈوز نے لکڑہارے کو برفانی انسانوں کے چنگل سے چھڑا لیا۔''

دوسری سرخی جو ذرا کم جلی قلم سے لکھی گئی تھی یوں تھی:

''برفانی انسان لکڑہارے کو کھلونا سمجھتے تھے۔''

تیسری سرخی کا کیپشن (عنوان) تھا:

''دونوں کمانڈوز برفانی انسانوں کا پیچھا کر رہے ہیں۔''

خبر کا انٹرویو (آغاز) یہ تھا:

''سکردو (صدائے وطن کے نمائندہ خصوصی دلاور علی سے) بلتستان کے برف پوش پہاڑوں میں دو کمانڈوز میجر نوری اور کیپٹن تنویر نے جان کی بازی لگا کر خپلو کے ایک لکڑہارا بروق پا کو برفانی انسانوں کے ایک گروہ کے چنگل سے آزاد کروایا ہے۔ اس مشن کی کامیابی کے لیے کمانڈوز اپنی جان پر کھیل گئے اور انہوں نے برفانی انسانوں سے مردانہ وار مقابلہ کرتے ہوئے بروق پا کو خپلو سب ڈویژن کے گاؤں سُرمو سے بیس میل دُور آزاد کروایا۔ بروق پا کو وحشی انسانوں سے چھڑانے کے لیے دیہاتیوں نے کوشش کی جو ناکام ہو گی۔ ضلع بلتستان کی پولیس پارٹی نے بھی اس غرض کے لیے کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

لندن سے پروفیسر کی بھی ایک جماعت اس وقت بلتستان کے پہاڑوں میں برفانی انسان پر ریسرچ کر رہی ہے۔ یہ پارٹی بھی بروق پا کو موت کے منہ سے نجات دلانے میں ناکام رہی۔ آخر شیر دل کمانڈوز نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر برفانی انسان کا مقابلہ کیا اور انہیں مات دے کر بروق پا کو چھڑا لائے۔ اس مہم کی تفصیلات حسب ذیل ہیں۔''

اس کے بعد دلاور علی نے افسانوی انداز میں سب کچھ لکھا تھا جو اس کے جی میں آیا۔

ساری خبر پڑھنے کے بعد میجر زور زور سے ہنسنے لگا اور اخبار کیپٹن تنویر کی طرف بڑھا دیا۔

کیپٹن ساری اخبار پڑھنے کے بعد بولا۔

''اس خبر سے ایک بات ثابت ہوتی ہے کہ بروق پا نے ہم سے کیا ہوا وعدہ پورا کیا ہے۔ اس نے دلاور علی کو ایک لفظ بھی نہیں بتایا تھا۔''

''دلاور علی نے مجھے روپوں کا لالچ بھی دیا لیکن میں نے اُسے بار بار یہی کہا کہ میں وعدہ کر چکا ہوں کہ کچھ نہیں بتاؤں گا۔ اس لیے کچھ نہیں بتاؤں گا اور میں نے اسے کچھ نہیں بتایا۔'' بروق پا نے میجر کو بتایا۔

''شاباش۔ تم واقعی مرد ہو اور مرد جو وعدہ کرتے ہیں اسے پورا کرتے ہیں۔'' میجر نے بروق پا کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''میجر صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔ فارسی کا مقولہ ہے (قولِ مرداں جان دار) یعنی مردوں کے وعدہ میں جان ہونی چاہیے۔ سو ثابت ہوا کہ بروق پا کے وعدہ میں جان ہے اور وہ مرد ہے۔'' کیپٹن خوش ہو کر میجر کی تائید کر رہا تھا۔

''میں نے تو اپنی بیوی کو بھی کچھ نہیں بتایا حالانکہ وہ دلچسپی سے پوچھ رہی تھی کہ مجھ پر کیا گزری؟ میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ مجھے برفانی انسان اٹھا کر لے گئے تھے اور یہ بات سچی تھی۔ ساری دنیا جانتی تھی کہ مجھے برفانی انسان پہاڑی جنگل سے اٹھا کر لے گئے تھے حتیٰ کہ ولائیت سے موٹے موٹے شیشوں والے جو بوڑھے پروفیسر آئے ہوئے تھے وہ بھی جانتے تھے، اس لیے میں نے کہا کہ مجھے برفانی انسان اٹھا کر لے گئے اور دو کمانڈو آئے اور انہوں نے مجھے چھڑایا۔ یہ دوسری بات جو ہے چھڑانے والی یہ بھی سبھی لوگ جانتے ہیں کیونکہ سرمو گاؤں نے دیکھا تھا کہ آپ دونوں مجھے برفانی علاقہ سے لے کر سُرمو آئے تھے۔''

اب سلطان کی باری ہے۔ وہ چہک اٹھا:

''اب تو چچا بروق پا خوب باتیں کر رہا ہے جب میں اسے لینے کے لیے جیپ پر چلو گیا تو اس نے آنے سے انکار کر دیا تھا۔''

''میں نے انکار نہیں کیا تھا میری بیوی جوہی نے انکار کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں دوبارہ برفانی انسانوں کے چنگل میں پھنس جاؤں۔''

''ٹھیک بات ہے۔ ہر وفا شعار بیوی ادھر پاکستان میں اپنے وفا شعار خاوند کی خدمت کرنا چاہتی ہے۔'' میجر بولا۔

''میں نے ایک سو روپیہ چچی جوہان کو دیا تو اس نے کہا کہ اب تم لے جاؤ اسے'' سلطان بتانے لگا ''لیکن اس نے یہ بھی کہا کہ اسے اس کے برفانی رشتہ داروں سے دُور رکھنا۔ ایک بار تو یہ آ گیا۔ ہوسکتا ہے کہ دوبارہ اس کے رشتہ دار اسے نہ آنے دیں۔ نمک، مرچ کے بغیر کچا چبا ڈالیں۔''

''نہیں یہ نہیں ہوگا۔ اس بار ہم بروق پا کے رشتہ داروں یعنی برفانی انسانوں کو کچا چبا ڈالیں گے کیونکہ ابراہیم؟'' کیپٹن نے ابراہیم سے پوچھا۔

''ضرور ضرور سر۔ اس بار ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔'' ابراہیم مُکا تان کر بولا۔

''ضرور کامیاب ہوں گے اور ہاں سلطان اور ابراہیم کے آنے کی بہت خوشی ہوئی ہمیں۔ اب یہ سوچنا چاہیے کہ ہم گولڈن ٹاور کی طرف کوچ کریں۔ کل تڑکے سورج نکلنے سے پہلے۔ سامنے سے نہیں کیونکہ سامنے تو پانچ چھ گز چوڑی دراڑ ہے جسے پار نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس سیڑھی بھی نہیں ہے اور اتنے لمبے لمبے تختے بھی نہیں ہیں اس لیے ہوگا یہ کہ جس طرف گلیشیر ہے اور جہاں گزشتہ سے پیوستہ رات برفانی انسان بھنگڑا ڈال رہے تھے؟ ادھر سے ہو کر ہم گولڈن ٹاور کی چوٹی کی طرف جائیں گے کل سویرے۔ کوئی سوال؟'' میجر خاموش ہو گیا تا کہ کوئی سوال کیا جائے تو جواب دے۔

''سر! آپ بہتر جانتے ہیں ہم سب سے۔ آپ نے جو آرڈر دیا اس کے مطابق کل تڑکے روانہ ہوں گے۔'' کیپٹن بولا۔

''صاحب! پروفیسر الیگزنڈر نے آپ کا اور کپتان صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے

مائیکل کا ہر طرح خیال رکھا اور اسے بحفاظت سُرمو بھجوا دیا۔ پروفیسر نے پانچ سلیپنگ بیگ، کچھ ڈبل روٹی، بند مکھن اور ہنٹر بیف بھجوایا ہے۔ وہ آپ نے دیکھ لیا ہوگا۔'' سلطان نے پوچھا۔

''نہ صرف دیکھا ہے بلکہ چکھا بھی ہے۔ ہم بھی پروفیسر الیگزنڈر کے شکر گزار ہیں ہمارے پاس سلیپنگ بیگ نہ تھے۔ ان کی بہت خوشی ہوئی اور ہاں میرا خیال ہے اب ہمیں کھانا کھا کر سو جانا چاہیے۔ صبح تڑکے اٹھنا ہے۔'' میجر نے حکم دیا۔

''کھانا بروق پا تیار کرے گا کیونکہ یہ بہتر باورچی ہے۔ ابراہیم اب مجھ سے نشانہ پکا کرنے اور سکی انگ بہتر کرنے کی مشق کرے گا میری نگرانی..... میں کیوں سر؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''او کے!'' میجر نے کہا اور کتاب پڑھنے لگا۔

کیپٹن اور ابراہیم ریوالور اور سکی انگ لے کر خیمے سے باہر چلے گئے۔ بروق پا اور سلطان باورچی خانہ کی طرف آ گئے۔

سفید ریچھ

شام کو پہاڑی ہوا چلنے لگی۔ پھر اس کی رفتار میں تیزی آئی۔ جب سب نے عشا کی نماز ادا کی اس وقت برف باری شروع ہوگئی۔ موسم ایک دم خراب ہوگیا تھا۔ گولڈن ٹاور کا امیریا موسموں کی تجربہ گاہ مشہور تھا۔ کبھی آسمان صاف، کبھی آسمان پہ بادل، کبھی ہوا آہستہ کبھی جھکڑ کی صورت، کبھی اوس، کبھی برف باری۔

جب وہ سونے لگے تو برف باری اور تیز ہوگئی۔ میجر، کیپٹن اور ابراہیم نے ایک خیمے کے اندر اور سلطان اور بروق پا نے دوسرے خیمے کے اندر بسیرا کیا۔

رات بھر برف باری ہوتی رہی۔ جب صبح سویرے میجر اور کیپٹن نے اٹھ کر دیکھا برف باری تھم چکی تھی لیکن ان کے خیموں کے اردگرد برف ہی برف تھی۔ قدِ آدم ڈھیر لگے تھے۔ کیپٹن نے سلطان اور بروق پا کو جگایا اور چائے تیار کرنے کے لیے کہا۔ ابراہیم بھی جاگ اٹھا تھا اور سامان سنبھال رہا تھا۔ میجر نے گولڈن ٹاور کو دیکھا وہ سفید برقع پہنے کھڑا تھا۔ صبح کی سفیدی میں وہ پرشکوہ نظر آ رہا تھا۔ جب سورج نکلنے لگا تو کرنیں سفید چوٹی پہ سونا انڈیل دیں گی۔

''نہ دراڑ نظر آتی۔'' مجھے کیپٹن اچانک بول اٹھا۔

ان دونوں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ برف سے دراڑ پُر ہو چکی تھی۔ میجر اور آگے بڑھا اور دراڑ کو پُر کرنے والی برف پہ چڑھ گیا۔ برف سخت تھی وہ دراڑ کی دوسری طرف گیا اور پھر پلٹ آیا۔

''ہم اس راستہ سے جائیں گے۔ برف سخت ہے ہمارا بوجھ اٹھا سکتی ہے۔'' میجر نے کہا اور اپنے خیمے کی طرف چل دیا۔

ابراہیم، سلطان اور بروق پا انتظار کر رہے تھے۔ سب نے مل کر ناشتہ کیا اور پھر سارا سامان آپس میں بانٹ کر چل پڑے۔ میجر سب سے آگے تھا اس کے بعد ابراہیم، پھر سلطان اور بروق پا اور آخر میں کیپٹن تنویر۔ وہ سبھی مزے سے دراڑ عبور کر گئے۔ اب ان کا رُخ شمال کی طرف تھا۔ گولڈن ٹاور کی طرف۔

یہ نرالی قسم کی کوہ پیما پارٹی پانچ گھنٹے سفر کرنے کے بعد ایک جگہ ٹھہری جہاں بیٹھ کر دوپہر کا کھانا تیار کیا اور کھایا۔ دو گھنٹے کے آرام کے بعد پھر یہ پارٹی روانہ ہوئی اور تین گھنٹے سفر کر کے ایک ایسی جگہ قیام کیا جہاں چاروں طرف برف کے پہاڑ تھے۔ آٹھ گھنٹے سفر کے دوران میں صرف تیرہ میل فاصلہ طے ہوا۔ غالباً کوئی دوسری پارٹی ان حالات میں اس سے زیادہ فاصلہ طے نہ کر سکتی تھی۔ انہوں نے ایک برف پوش چٹان کی اوٹ میں خیمے گاڑھے تھے۔

سب سے پہلے ابراہیم نے چیتے کے بچے کو گوشت ڈالا (وہ مادہ چیتے کا گوشت ساتھ اٹھا لایا تھا) بروق پا نے چائے تیار کی اس کے بعد وہ کھانا تیار کرنے میں مشغول ہوگیا۔ میجر، کیپٹن اور سلطان امیریا کا جائزہ لینے کے لیے پیدل چل پڑے۔ ایک گھنٹے کے بعد جب وہ واپس آئے، کھانا تیار تھا اور ابراہیم چیتے کے بچے کو سدھا رہا تھا۔

اگرچہ بھوک تیز تھی لیکن ان سب نے پہلے نماز ادا کی اس کے بعد کھانا کھایا اور پھر سو گئے۔ پہرے کے لیے جو ڈیوٹی چارٹ طے ہوا تھا وہ تھا رات ۹ بجے سے ۱۱ بجے تک سلطان۔ ۱۱ بجے سے لے کر ایک بجے صبح تک کیپٹن۔ ایک بجے صبح سے تین بجے صبح تک میجر، تین بجے صبح سے پانچ بجے صبح تک بروق پا۔ پانچ بجے صبح سے سات بجے صبح تک ابراہیم اور چیتے کا بچہ۔ چیتے کے بچے کی صبح ڈیوٹی اس لیے لگائی گئی کہ اسے صبح سویرے بھوک بہت ستاتی ہے اور وہ ازخود اٹھ کر چلانے لگتا تھا۔ ظاہر ہے اس کی خاطر خدمت کے لیے اس کے مالک ابراہیم کو اٹھنا پڑتا تھا۔

اونچائی کی پیمائش کرنے والے آلے، آلٹی میٹر کے مطابق وہ اب سترہ ہزار فٹ کی بلندی پہ سوئے ہوئے تھے۔ وہ پہلی بار نیند کے تھیلوں، سلیپنگ بیگ میں سوئے تھے۔ اگر یہ تھیلے نہ ہوتے تو یقیناً سردی سے برا حال ہوتا ان کا۔ اتنی بلندی پہ ہوا بھی پتلی اور ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دائیں بائیں برف کے دریا بھی تھے جن کو انگریزی میں گلیشیر کہا

جاتا ہے۔ یہ دریا رواں دواں نہ تھے جمے ہوئے تھے۔ ان کو گلیشیر کے سرکنے کا بھی خطرہ تھا۔ سب سے زیادہ خطرہ آوالانچ (بعض لوگ اس لفظ کو آوالانش پکارتے ہیں) سے تھا۔ جب آوالانچ آتا ہے تو پہاڑ کی چوٹیوں سے لاکھوں من برف ڈھلان کی طرف تیز رفتاری سے آتی ہے اور جو درخت، مکان یا بستی راستہ میں آئے اسے تباہ کرتی آگے نکل جاتی ہے۔ گلیشیر بڑے بھی ہوتے ہیں اور چھوٹے بھی۔ چھوٹے گلیشیر بڑے گلیشیر میں مل جاتے ہیں اور اسے اور بڑا اور وسیع بنا دیتے ہیں۔

رات پانچ بجے یا یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ صبح پانچ بجے بروق پا کی ڈیوٹی ختم ہوئی تو اس نے ابراہیم کو جگایا۔ ابراہیم نے اُٹھ کر سب سے پہلے باورچی خانہ سے اپنا پالتو چیتے کا بچہ لیا اور اس کی ڈور پکڑ کر باہر آ گیا۔ پہاڑوں میں دن ذرا دیر سے چڑھتا ہے کیونکہ سورج پہاڑوں کی اوٹ میں ہوتا ہے اور اس کی شعاعیں ہر کہیں آسانی سے نہیں پہنچ پاتیں۔ ان کا کیمپ جس جگہ تھا وہ برف پوش پہاڑوں کی اوٹ میں تھی۔ اس لیے وہاں کافی اندھیرا تھا۔

مادہ چیتے کا بچا ہوا گوشت ابراہیم نے خیموں سے چند گز کے فاصلہ پر برف کے نیچے دبا رکھا تھا۔ چیتے کے بچے کی ڈوری پکڑ کر وہ اسے وہاں لے گیا جہاں گوشت تھا اور برف ہٹا کر اسے وہاں چھوڑ کر واپس خیمہ میں آ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ جب تک چیتے کے بچے کی بھوک نہیں مٹے گی اور وہ پیٹ بھر کر گوشت نہ کھائے گا واپس نہیں آئے گا اور اسی طرح ہوا۔ بچہ چلایا اور اس کے ساتھ ہی کسے کے غرّانے کی آواز ابراہیم کے کان میں آئی۔

ابراہیم نے جلدی سے سلطان کا نیزہ پکڑا اور بھاگ کر چیتے کے بچے کے پاس آیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آ رہا تھا۔ موٹا تازہ سفید ریچھ غرا رہا تھا اور پنجہ اٹھا کر چیتے کے بچے کو پکڑنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ چیتے کا بچہ اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ غرا کر سفید ریچھ پنجہ مارتا تو بچہ سر بچا کر دائیں یا بائیں ہو جاتا۔ چیتے کا بچہ خوفزدہ نہیں تھا لیکن قوی ہیکل ریچھ کے مقابلہ میں خود کو بے بس پاتا تھا۔ ریچھ گوشت کھانے کے لیے اپنا منہ نیچے لاتا تو بچہ ننھی سی چھلانگ لگا کر اس پر جھپٹتا تھا اور پیچھے گر جاتا اور پھرتی سے کھڑا ہو جاتا۔

ابراہیم کے لیے یہ دل خوش کن نظارا تھا اور وہ کچھ دیر نیزہ تھامے اس نظارہ سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ جب چیتے کے بچے کو احساس ہوا کہ ابراہیم اس کے پاس کھڑا ہے تو وہ اپنی

بساط کے مطابق ہمت جمع کر کے سفید ریچھ پر حملہ آور ہوا۔ ریچھ اب غصہ میں آ گیا اور اس نے زور سے پنجہ مارا۔ چیتے کا بچہ پھرتی سے بائیں طرف ہو گیا اور وار خالی گیا لیکن اسی وقت ریچھ نے دیکھا کہ اس کے سامنے ابراہیم کھڑا ہے۔ ریچھ نے جھلا کر اور آگے بڑھ کر ابراہیم پر حملہ کیا۔

ابراہیم نے کہیں پڑھا یا سنا تھا کہ ریچھ حملہ کرے تو دائیں یا بائیں ہو جانا چاہیے کیونکہ ریچھ سیدھا حملہ کرتا ہے اور سیدھا دوڑتا ہے۔ اسے دائیں یا بائیں مڑنے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ چنانچہ جب سفید ریچھ نے حملہ کیا تو ابراہیم پینترہ بدل کر بائیں جانب ہو گیا اور پھر اس نے پلٹ کر نیزہ سے سفید ریچھ پر حملہ کیا۔ نیزہ ریچھ کے پہلو میں دھنس گیا۔ جب ابراہیم نے نیزہ ریچھ کی پسلی سے کھینچا تو خون کی پھوار باہر کی طرف امڈ پڑی۔ ریچھ تکلیف کے مارے بلبلا اٹھا اور چکر کاٹ کر پھر ابراہیم پر حملہ آور ہوا۔ ابراہیم اپنے حواس جمع کر کے حملہ کے لیے تیار تھا۔ اس نے اللہ کا نام لے کر زور سے نیزہ مارا جو ریچھ کی آنکھ پر آیا اور اسے چھید ڈالا۔ ریچھ کی جھلاّہٹ بلبلاہٹ اور غراہٹ شدید ہو گئی اور وہ پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر اس زور سے ابراہیم پر جھپٹا کہ اس کے جسم کے ٹکراؤ سے ابراہیم زمین پر گر پڑا اور نیزہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا لیکن نیزہ ریچھ کے جسم میں پیوست ہو چکا تھا۔ تاہم ریچھ ابراہیم پر لپکا، قریب تھا کہ ریچھ اپنے دانتوں اور پنجوں سے ابراہیم کو ہلاک کر دیتا، ریوالور کی تابڑ توڑ دو گولیاں چلیں اور ریچھ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

کیپٹن تنویر نے ابراہیم کا بازو پکڑ کر اُسے اوپر اٹھایا اور اس کے کپڑوں سے برف جھاڑنے لگا۔

''تجھے چاہیے تھا کہ ہمیں پکارتے۔ اکیلا آدمی ریچھ کا مقابلہ نہ کرے تو بہتر ہے۔'' کیپٹن نے اسے سمجھایا۔ میجر بھی آ گیا تھا اور سلطان اور بروق پا بھی خیمے سے اُٹھ کر آ رہے تھے۔

''زخم تو نہیں آیا اسے؟'' میجر نے کیپٹن سے پوچھا۔

''کیوں بھئی کوئی زخم تو نہیں آیا تجھے۔'' کیپٹن نے ابراہیم سے پوچھا۔

''نہیں جی۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''شاباش، چلو اب اپنا نیزہ ریچھ کے جسم سے نکالو۔'' کیپٹن نے کہا اور ابراہیم نے آگے

بڑھ کر سفید ریچھ کے پیٹ سے نیزہ نکالا۔ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا اور سفید برف گلنار ہو گئی۔

''کیا ہوا ابراہیم کو؟'' سلطان نے پوچھا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے۔ اس نے ایک سفید ریچھ کو ہلاک کیا ہے۔'' میجر نے بتایا۔

''شاباش ابراہیم، شاباش!'' سلطان نے آگے بڑھ کر اسے جپھی ڈالی یعنی اسے اپنے کُلاوہ میں لے کر بھینچا۔

چیتے کا بچہ بھی آ گیا تھا اور ریچھ کا منہ سونگھ رہا تھا۔ جب مادہ برفانی چیتا ہلاک ہوا تھا تو اس وقت بھی چیتے کا بچہ منہ سونگھنے لگا تھا۔

ابراہیم نے سلطان کے بازوؤں سے نکل کر چیتے کے بچے کی ڈوری پکڑی اور خیمہ کی طرف چل دیا۔

''بروق پا۔ کافی تیار کرو سب کے لیے'' میجر نے کہا اور وہ سب خیموں کی طرف چل پڑے۔

ابراہیم نے نماز ادا کی اور خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی جان بچ گئی ہے۔ میجر اور کیپٹن نے بوٹ پہنے اور ورزش کرنے کے لیے خیموں سے باہر آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ابراہیم بھی ان کے ساتھ آ ملا اور ورزش کرنے لگے۔

کافی تیار کر کے بروق پا ان تینوں کے پاس آیا اور بولا۔

''صاحب جی کافی تیار ہے۔ آ جاؤ!'' بروق پا پیغام دے کر پلٹ گیا۔ وہ تینوں دوڑ کر خیمے کے اندر آئے اور اپنے اپنے مگ اُٹھا کر کافی پینے لگے۔

وہ نشان؟

''ہمیں سفید ریچھ کی کھال اتارنا چاہیے یا نہیں؟'' سلطان نے میجر سے پوچھا۔

''آپ کی خوشی ہے اگر آپ اتارنا چاہتے ہیں تو اتار لیجیے۔ کھال خشک ہو جائے گی تو پہن لیں۔ مجھے خوشی ہو گی۔'' میجر نے کہا۔

''دراصل کھال تو ابراہیم کی ہے کیونکہ اس نے ریچھ کو ہلاک کیا ہے۔'' سلطان بولا۔

میں نے کھال کو بطور تحفہ آپ کے حوالے کیا۔'' ابراہیم بولا۔

''بڑی مہربانی۔'' سلطان نے کہا۔

''لیکن ایک بات ہے میں کھال اُتاروں گا نہیں، آپ خود اتاریں گے۔'' ابراہیم نے بتایا۔

''پکی بات۔ میں خود اُتاروں گا۔ خود اسے نمک لگاؤں گا اور خود خشک کروں گا۔'' سلطان نے وعدہ کیا۔ وہ شکار تھا اس لیے کھال اُتارنے کا ماہر تھا۔

''ریچھ کی کتنی قسمیں ہیں سلطان؟'' کیپٹن نے سلطان سے علم کو جاننے کے لیے سوال کیا۔

''دو۔ ایک کالا ریچھ اور دوسرا سفید ریچھ۔'' اس نے یقین سے کہا۔

''غلط...... ریچھ کی تین قسمیں ہیں۔'' کیپٹن بولا۔

''آپ کا مطلب ہے بھورا ریچھ......؟'' سلطان بولا۔

''میں تو بھورے ریچھ کو سفید ریچھ ہی کہوں گا لیکن اگر تم سمجھتے ہو کہ تیسری قسم کا ریچھ ہوتا ہے رنگ کے اعتبار سے تو پھر ریچھ کی قسمیں چار ہیں۔ چوتھی قسم کا ریچھ نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ دیہات میں نیلے رنگ کو آسمانی رنگ بھی کہتے ہیں۔ دراصل دنیا میں ریچھ کی قسمیں ہیں تین۔ رنگ کے اعتبار سے کالا ریچھ، بھورا ریچھ یا سفید ریچھ اور نیلے رنگ کا نادر تبّتی ریچھ۔'' کیپٹن

نے بتایا۔

''سچی بات ہے میں نے جنگلی جانوروں کے متعلق کتابیں پڑھیں لیکن مجھے بھی نیلے رنگ کے ریچھ کے متعلق معلوم نہ تھا۔'' میجر بولا۔

''میں نے کالا، سفید اور بھورا ریچھ دیکھا ہے لیکن نیلا ریچھ دیکھا تو کیا اس کے متعلق سنا تک نہیں۔'' سلطان حیران ہو کر بولا۔

''سر! آپ نے دیکھا نیلا ریچھ؟'' ابراہیم نے کیپٹن سے پوچھا۔

''نہیں میں نے نیلے رنگ کا ریچھ دیکھا نہیں ہے لیکن اس کے بارے میں پڑھا ضرور ہے۔ یہ ریچھ تبت اور لداخ کے پہاڑوں میں پایا جاتا ہے اور ریچھ کی یہ قسم نادر ہے۔'' کیپٹن نے بتایا۔

''سر! نادر کیا ہے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''نادر یہ کہ بہت کم یعنی یہ ریچھ زیادہ تعداد میں نہیں ملتا۔ باقی قسم کے ریچھ عام ملتے ہیں۔'' کیپٹن نے سب کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''اگر نیلے رنگ کا ریچھ تبت اور لداخ میں ہوتا ہے تو وہ لازماً بلتستان میں بھی ہو گا کیونکہ تبت اور لداخ کی طرح بلتستان میں پہاڑوں کا علاقہ ہے اور یہاں بھی خوب برف پڑتی ہے۔ ویسے بھی تبت اور لداخ بلتستان سے جڑے ہوئے ہیں۔ ریچھ تبت اور لداخ اور لداخ سے بلتستان آ سکتا ہے۔'' سلطان خیال آرائی کر رہا تھا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ ریچھ خوراک کی تلاش میں گھومتا رہتا ہے۔ نیپال میں انیس، بیس ہزار فٹ کی بلندی پر اسے دیکھا گیا ہے بلکہ نیپال کے لوگوں نے اس کا شکار بھی کیا ہے۔'' کیپٹن نے انہیں بتایا۔

''اب جب کہ ریچھوں کی باتیں ہو رہی ہیں تو بتائیے جو ریچھ ابراہیم اور آپ نے مارا ہے۔ یہ کون سا ریچھ ہے؟'' میجر نے پوچھا۔

''سر! یہ ریچھ بھورا ہے۔ دراصل اس کا رنگ پیلا اور بھورا ہوتا ہے جب اس کے جسم پر چربی چڑھ جاتی ہے تو یہ کالا ہو جاتا ہے پوری طرح کالا نہیں، سیاہی مائل، پوری طرح کالا ریچھ اور ہوتا ہے۔ اس کی قسم الگ ہے۔ وہ قد میں سفید یا بھورے ریچھ سے چھوٹا ہوتا ہے۔

بھورا یا سفید ریچھ ٹھنڈے پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتا ہے۔ یہ ہمیشہ دس ہزار فٹ کی بلندی سے اوپر گھومتا ہے۔ یہ سبزی کھاتا ہے۔ سبزی نہ ملے تو دیمک اور چیونٹیوں کو کھاتا ہے۔ شہد کی مکھیوں کے چھتے اس کی من پسند غذا ہے۔ پودوں کی جڑیں، جڑی بوٹیاں، بیج اور پھل بھی کھاتا ہے۔ بھوک لگے تو شکار بھی کرتا ہے۔ زخمی ہو جائے تو شدید اور سخت خطرناک اور وحشی بن جاتا ہے۔ ابراہیم کے نیزے سے زخمی ہونے کے بعد وہ سخت غصے کے عالم میں تھا'' کیپٹن نے بتایا۔

''آپ کو تو بہت پتہ ہے بھورے ریچھ کا۔ آپ نے جو کچھ بتایا درست ہے۔'' سلطان بولا۔

''اور کوئی خاص بات بھورے ریچھ کے بارے میں؟'' میجر نے دلچسپی سے پوچھا۔

''بھورا ریچھ ہمیشہ ٹھنڈے علاقے میں رہتا ہے۔ سردی اور برف باری کا موسم سو کر گزارتا ہے۔ سونے سے پہلے غار تلاش کرتا ہے۔ مارچ میں نیند سے جاگتا ہے۔ نیند کے دوران اس کی چربی غذا کا کام دیتی ہے۔ گرمیوں میں گھاس کے میدانوں میں رخ کرتا ہے اور جسمانی کمزوری دور کرتا ہے۔ ریچھ کے بچے آسانی سے پکڑے جا سکتے ہیں اور ان کو آسانی سے سدھایا جا سکتا ہے۔ برفانی چیتے کے بچے آسانی سے نہیں سدھائے جا سکتے۔''

''آخری سوال۔ ریچھ کی چربی کی شہرت سنی ہے۔ اس کے متعلق کچھ بتائیے۔'' میجر نے پوچھا۔

''ریچھ کی چربی سے مالش کی جائے تو جوڑوں کا درد دور ہو جاتا ہے یعنی ریچھ کی چربی آرتھرائی ٹس کا علاج ہے۔''

یہ بات بھی ٹھیک ہے۔'' سلطان نے تصدیق کی اور اٹھ کر ریچھ کی کھال اتارنے کے لیے چل پڑا۔

سورج نکل آیا تھا اور ہر طرف روشنی پھیل گئی تھی۔ ابراہیم نے باہر آ کر مادہ چیتے کی کھال کو اُلٹ پلٹ کیا۔ وہ ابھی خشک نہ ہوئی تھی۔ اس کا خیال تھا اگر دن بھر دھوپ میں رہی تو شام تک خشک ہو جائے۔ وہ چیتے کے بچے کو ڈوری سے پکڑ کر چٹان کی دوسری طرف چل دیا تا کہ سدھا سکے۔ بروق پا چپاتیوں کے لیے آٹا گوندھنے لگا۔ کل شام وہ اور سلطان بیل کا گوشت لائے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ گوشت پکایا جائے۔ قورمہ ٹھیک رہے گا۔ اس نے سوچا۔ وہ شوربہ میں روٹی کے ٹکڑے بھگو کر کھانا چاہتا تھا۔ اس کا تالو خشک ہو رہا۔ وہ سمجھ گیا کہ سترہ

اٹھارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہوا خشک ہوتی ہے اور منہ سوکھنے لگتا ہے۔

میجر اور کیپٹن نے سکی اِنگ کی تیاری کی اور آدھ گھنٹے کے بعد وہ اردگرد کے ایریا کی ریکی کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

ان کی دائیں جانب نالہ تھا۔ وہ نالہ میں اُتر گئے۔ کماؤنز کی ٹریننگ میں کوہ پیمائی بھی شامل ہوتی ہے۔ اس لیے وہ پہاڑوں پر چڑھنے اور اترنے میں ماہر تھے۔ نالہ عبور کرنے کے بعد وہ دوسری طرف گلیشیر پر آ گئے۔ گلیشیر نصف میل چوڑا تھا اور اس کا ایک سرا گولڈن ٹاور کو چھو رہا تھا۔ گلیشیر کے ایک طرف اونچا پہاڑ تھا اور دوسری طرف اونچا پہاڑ جسے وہ عبور کر کے آئے تھے۔ گلیشیر کا رخ پہاڑ کے ساتھ ساتھ تھا کیونکہ نالہ کی طرف قدرتی طور پر پتھر کی دیوار کھڑی تھی۔ یہ وہی گلیشیر تھا جس پر اس رات برفانی انسان ناچ رہے تھے۔

دونوں سکی اِنگ کرنے لگے اور برفانی انسانوں کے پیروں کے نشان دیکھنے لگے۔ ایک جگہ میجر کو پیروں کے بڑے بڑے نشان یعنی بڑے بڑے پیروں کے نشان دکھائی دیئے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔

''کیپٹن! یہ دیکھو، پیروں کے نشان۔ یہ عام انسانوں کے پیروں کے نشان نہیں ہیں، برفانی انسان کے پیروں کے نشان ہیں۔'' میجر بولا۔

''آپ کا مطلب ہے برفانی انسان ہمارے دائیں بائیں کسی غار میں پوشیدہ ہیں۔'' کیپٹن نے پوچھا۔

''میرے خیال میں وہ کہیں آس پاس ہیں۔ ممکن ہے وہ ہمیں دیکھ رہے ہوں۔'' میجر نے کہا۔

''اگر یہ برفانی انسانوں کے پیر ہیں تو وہ یقیناً ہمارے دائیں یا بائیں اوپر یا نیچے ہوں گے لیکن میرے خیال میں یہ بھورے ریچھ یا برفانی چیتے کے پنجوں کے نشان ہیں جو سورج کی گرمی سے پگھل کر بڑے ہو گئے ہیں۔'' کیپٹن نے کہا۔

''نہیں یہ انسانی پاؤں کے نشان ہیں۔ ریچھ یا چیتے کے پنجہ کے نشان ہوتے تو ان کے ناخنوں کے نشان تیز نکیلے یعنی شارپ ہوتے۔ یہ تو اَن شارپ نہیں بلنٹ ہیں یعنی کُند ہیں۔'' میجر کسی کھوجی کی طرح بات کر رہا تھا۔ وہ لمحہ بھر خاموش رہا اور پھر بولا۔

''اگر فرض کر لیا جائے کہ یہ انسانی پیروں کے نشان ہیں تو.....؟''

''سر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ہم فرض کرتے ہیں کہ یہ انسانی پیروں کے نشان ہیں لیکن یہ برفانی انسانوں کے پیروں کے نشان نہیں ہیں، عام انسانوں کے پیروں کے نشان ہو سکتے ہیں۔''

''یعنی آپ کا مطلب ہے یہاں ہم آپ جیسے انسان آئے ہوں گے اور ننگے پاؤں آئے ہوں گے اور وہ یہاں کچی برف میں اپنے پیروں کے نشان چھوڑ چلے گئے۔'' میجر نے پوچھا۔

''قصہ یہ ہے کہ یہ نشانات برفانی انسان کے پیروں کے برابر ہیں۔ اس وقت یعنی سورج کی کرنوں سے برف پگھل کر پھیلتی ہے۔ جب برف پگھلتی ہے تو اس پر پڑا ہوا نشان بھی برف کے ساتھ ساتھ پھیلتا ہے کیونکہ وہ برف پر ہوتا ہے۔ اس وقت یہ نشان یتی کے پیروں کے نشانات کے برابر ہیں۔ اس وقت یعنی جب برف سورج کی کرنوں سے پگھل رہی ہے اور پگھل چکی ہے، ممکن ہے یہ نشان برسوں کے ہوں اور کل سارا دن سورج کی گرمی میں پگھلے ہوں کیونکہ رات ہم نے برفانی انسانوں کا اس جگہ بھنگڑا نہیں دیکھا۔''

کیپٹن خاموش ہو گیا اور میجر کا منہ تکنے لگا۔

''میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں'' میجر گھمبیر آواز میں بولا۔ ''آپ یہ کہہ رہے ہیں کیپٹن کہ اس روز برفانی انسان بھنگڑہ نہیں ڈال رہے تھے۔ ہم آپ جیسے انسان بھنگڑا ناچ کر رہے تھے۔''

''فرض کرنے میں کیا حرج ہے سر۔'' کیپٹن ہنس کر بولا۔

''ہمارا مسئلہ فرض کرنے سے حل نہیں ہو سکتا۔ چلو واپس چلیں اور بھوک مٹائیں۔''

وہ دونوں واپس چل پڑے۔

مقابلہ

رات آئی تو میجر نے فیصلہ کیا کہ وہ اور کیپٹن باری باری پہرہ دیں گے اور ابراہیم، سلطان اور بروق پا مزے سے سوئے رہیں گے۔ دراصل میجر چاہتا تھا کہ وہ اپنے دوسرے تین ساتھیوں کو یہ نہ بتائے کہ وہ دونوں رات کو برفانی انسانوں کا اتہ پتہ معلوم کرنے کے لیے اردگرد کے ایریا کی ریکی کریں گے۔

رات کے نو بجے وہ تینوں ''باورچی خانہ'' میں سو گئے۔ میجر اور کیپٹن نے تیاری شروع کی۔ ایک گھنٹہ کے اندر اندر وہ بالکل تیار تھے۔ وہ ریوالور، گرینیڈ اور خنجر سے مسلح تھے۔ مرہم اور پٹیاں بھی انہوں نے اپنی جیبوں میں ڈال لی تھیں۔ ایک مضبوط رستہ بھی لے لیا تھا کہ شاید ضرورت پڑ جائے۔

''برفانی انسانوں کے متعلق یہ طے ہے کہ وہ رات کو باہر نکلتے ہیں اور دن کو گہری غاروں میں چھپ کر رہتے ہیں۔'' کیپٹن بولا۔

''میرا دل کہتا ہے کہ آج ہم ان کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوں گے۔'' میجر نے یقین سے کہا۔

وہ ساری رات چاند کی روشنی میں سکی انگ کرتے رہے اور برفانی انسانوں کو تلاش کرتے رہے لیکن صبح چار بجے تک ان کو کوئی برفانی انسان نظر نہ آیا۔ چار بجے واپس آ کر وہ دونوں سو گئے۔

دوسرے دن وہ سب آٹھ بجے اُٹھے۔ سبھی تازہ دم تھے۔ ناشتہ بھی تیار تھا۔ انہوں نے ناشتہ کیا اور پھر خیمے اکھاڑ کر اوپر جانے کی تیاری شروع کی۔

وہ دوپہر تک چلتے رہے۔ ایک بجے انہوں نے آرام کیا اور کھانا کھایا اور تین بجے پھر چڑھائی شروع کی۔ شام کے چھ بجے وہ ساڑھے انیس ہزار فٹ کی بلندی پر تھے۔ تھکان سے ان کے بدن چُور چُور تھے۔ وہ گولڈن ٹاور کے قدموں میں پہنچ گئے تھے۔ میجر نے ایک غار تلاش کیا اور ان سب کو حکم دیا کہ وہ سارا سامان غار کے اندر لے آئیں۔ سلطان، ابراہیم اور بروق پا نے غار کو صاف کیا اور پھر وہ تینوں کھانا تیار کرنے لگے اور آگ تاپنے لگے۔

غار کے اندر دیوار میں سوراخ کر کے انہوں نے ٹارچ اس میں اڑس دی جس سے غار کے اندر ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی۔

غار اتنا بڑا تھا کہ آدمی کھڑا ہو کر اس کے اندر داخل ہو سکتا تھا اور آزادی سے گھوم پھر سکتا تھا۔

ابراہیم چیتے کا بچہ، چیتے کا گوشت اور چیتے کی کھال ساتھ لایا تھا۔ کھال اب خشک ہو گئی تھی جسے اس نے اپنے بستر پر بچھا دیا تھا۔ سلطان سفید ریچھ کی کھال کیمپ نمبر ۲ میں چھوڑ آیا تھا کہ واپسی پر گزرتے ہوئے وہاں سے اُسے اُٹھا لے گا۔ ابراہیم نے غار کے اندر کچھ دور گوشت رکھا اور وہاں چیتے کے بچے کے گلے میں ڈوری ڈال کر ایک پتھر سے باندھ دیا۔

دو دن تو موسم ٹھیک تھا لیکن پہاڑوں پر موسم کو خراب ہوتے دیر نہیں لگتی۔ شمال کی جانب دور افق پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ اس دھند نے دیکھتے دیکھتے بادل کا روپ دھار لیا۔ بادل پہلے سفیدی مائل تھا آہستہ آہستہ مٹیالا ہوتا گیا پھر تاریک ہو گیا۔ ہوا پہلے آہستہ آہستہ چل رہی تھی پھر تیز ہونے لگی اور جھکڑ کی صورت اختیار کر گئی۔ ہوا کی سرسراہٹ، غراہٹ میں بدل گئی۔ بجلی کی چمک اور گڑک میں بھی تیزی اور شدت آ گئی۔ آدھ گھنٹہ پہلے موسم کی معمولی تبدیلی اب ہوا اور برف کے طوفان میں تبدیل ہو گئی تھی۔ شام رات میں ڈھل گئی تھی اور رات کا طوفان رات میں تبدیل ہو گئی تھی۔ جھکڑ کی تیزی تندی، ہوا کا شور، بجلی کی چمک اور گڑک، بادل کی گرج اور اس گرج کی بازگشت۔ لگتا تھا قیامت کی رات ہے جو تباہی ساتھ لائی ہے۔

گرج اور گڑک سے ڈر کر چیتے کے بچے نے ڈوری پر زور دیا۔ ڈوری پتھر سے ڈھیلے ڈھالے انداز میں بندھی تھی جو کھل گئی اور بچہ غار کے اندر بھاگ گیا۔ ابراہیم نے دوسری ٹارچ لی اور اسے تلاش کرنے لگا۔ غار خاصا لمبا تھا غالباً کسی زمانے میں زمیر زمین نالہ ہو گا پھر زمین بردگی سے یعنی پانی اور ہوا کے زور سے زمین گھس گئی اور دوسرے نالے بن گئے اور نالہ غار کی

شکل اختیار کر گیا۔ اس کا ایک سرا پتھروں کے گرنے سے بند ہو گیا اور دوسرا سرا کھلا رہا اور یوں غار کی شکل اختیار کر گیا۔ آخر اسے بچہ مل گیا اور وہ اسے پکڑ لایا۔

''صاحب یہ غار تو بہت لمبا ہے.....'' ابراہیم کچھ دور تک غار کا چکر لگا کر واپس آیا تو اس نے میجر کو بتایا۔

''میجر نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لی اور خود غار کے اندر معائنہ کے لیے چلا گیا۔ چند گز تک دیکھ کر واپس آیا تو اس نے ساتھیوں سے کہا کہ وہ برف ملی ہوا کے تھپیڑوں سے بچنے کے لیے سارا سامان غار کے منہ سے ذرا آگے لے آئیں۔

جب وہ اپنا سامان غار کے اندر کچھ دور تک لے آئے تو برفانی طوفان کی گھن گرج کم ہو گئی۔ انہوں نے اطمینان سے کھانا تیار کیا، گپیں ہانکیں اور پھر سو گئے۔ وہ چڑھائی کی وجہ سے تھک کر چُور ہو گئے تھے اور غار میں کوئی خطرہ بھی نہیں تھا اس لیے وہ اطمینان سے نیند کے مزے لوٹنے لگے۔

بوڑھے آدمی کو رات کے وقت نیند ذرا کم آتی ہے۔ اس کی نیند کچی ہوتی ہے جلد اچاٹ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ بروق پا کی نیند بھی اچاٹ ہو گئی۔ آدھی رات کا وقت ہو گا وہ اُٹھ کر غار کے منہ کی طرف آیا۔ باہر طوفان کا شور پہلے کی طرح اٹھ رہا تھا۔ جب وہ غار کے منہ کی طرف بڑھا تو اس نے دیکھا کہ کچھ لوگ غار کے اندر، غار کے منہ کے قریب لیٹے ہوئے ہیں اسی جگہ جہاں انہوں نے پہلے سامان رکھا تھا۔ وہ ایک دم ٹھٹھک گیا اور ان کو دیکھنے لگا۔

وہ برفانی انسان تھے اور تعداد میں تین تھے۔

''میرے خدایا۔ اب کیا ہو گا؟'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

برفانی انسان سوئے ہوئے تھے اور ان کے خراٹوں کی آواز بروق پا کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی۔ البتہ ہوا کے زور سے ذرا کم سنائی دیتی تھی۔

''فیصلہ کی گھڑی آ گئی۔'' بروق پا نے آہستہ سے کہا ''موت اور زندگی..... ان کی موت ہماری زندگی..... ہماری موت ان کی زندگی.....اور کوئی راستہ نہیں۔''

بجلی چمکی تو اس نے ایک بار پھر ان کو غور سے دیکھا۔ کیا مزے سے سو رہے تھے وہ۔ اُسے ان پر ترس آیا۔ اگر کماغڈوز کو علم ہو گیا تو وہ انہیں بھون ڈالیں گے۔ یہ وحشی تو ہیں لیکن یہ

وہ لوگ ہیں جن کے ساتھ اس نے کچھ وقت گزارا ہے لیکن اب وہ مجبور تھا۔ اس کی اور اس کے ساتھیوں کی زندگی کو ان وحشی انسانوں سے خطرہ تھا۔ اگر یہ جاگ اٹھے تو یقیناً ہم میں سے دو ایک کو جان سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اگر کماغڈوز ان کے قابو آ گئے تو ہم سب مارے جائیں گے۔ بہتری اسی میں ہے کہ برفانی انسان ختم ہوں۔

وہ پلٹا اور میجر صاحب کے پاس جا کر آہستہ سے بولا۔

''صاحب جی! برفانی انسان'' اس کی آواز مارے خوف کے کانپ رہی تھی۔ میجر جاگ اٹھا۔

''کہاں؟'' میجر نے کہا تو بروق پا نے پہلے انگلی اپنے ہونٹوں پر رکھی اور پھر انگلی سے غار کے منہ کی طرف اشارہ کیا۔ میجر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے ریوالور تان لیا۔ کیپٹن بھی جاگ اٹھا تھا۔ میجر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کیپٹن کو خاموشی کا اشارہ کیا تھا۔ بروق پا نے سلطان اور ابراہیم کو بھی جگا دیا تا کہ وہ بھی اپنا بندوبست کر لیں۔

''وہ تین ہیں اور تینوں سوئے ہوئے ہیں جی۔'' بروق پا بولا۔

اب ایک ٹارچ میجر کے پاس تھی اور دوسری کیپٹن کے پاس۔ میجر نے بروق پا، سلطان اور ابراہیم کو غار کے کونے کی طرف پیچھے دھکیلا اور وہ خود اور کیپٹن آگے بڑھے۔ دونوں ٹارچوں کی روشنی میں دس دس گز کے بال دار برفانی انسان غار کے منہ کے اندر سوئے ہوئے خراٹے لے رہے تھے۔ ان کو دیکھنے کے بعد دونوں کماغڈوز نے ٹارچ بروق پا اور سلطان کو دے دیئے۔ دائیں ہاتھوں میں ریوالور اور بائیں ہاتھوں میں خنجر پکڑے اور آہستہ آہستہ آگے بڑھے تا کہ برفانی انسانوں پر تابڑ توڑ حملہ کریں۔

ابراہیم نے چیتے کے بچے کے گلے سے رسی اُتار دی تا کہ وہ بھاگنا چاہے تو وہ بھی بھاگ جائے اور یوں آزاد ہو جائے۔ اس نے اپنا ریوالور دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ لیا اور کماغڈوز کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ سلطان کے ایک ہاتھ میں ٹارچ تھی اور دوسرے میں نیزہ۔

اچانک ان کے دیکھتے دیکھتے چیتے کا بچہ ان پانچوں کی ٹانگوں میں سے نکل کر غار کے منہ کی طرف بھاگا اور ایک برفانی انسان سے جا ٹکرایا۔ برفانی انسان جاگ پڑا۔ اس نے چیتے کے بچے کو دیکھا اور پھر اسے ہاتھ سے پکڑ کر غار کے منہ میں سے دُور باہر پھینک دیا۔ بچے کے چلانے کی آواز برف کے طوفان میں اُبھری اور ڈوب گئی۔

برفانی انسان نے چھت کی طرف بازو کھڑے کر کے انگڑائی لی اور زور سے چیخ ماری۔ باقی دو بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔

میجر صاحب نے سوچا وہ حملہ کرنے والے ہیں چنانچہ انہوں نے انگڑائی لینے والے برفانی انسان کو نشانہ بنایا۔ وہ زور سے چلایا اور پھر تینوں چھلانگیں لگا کر طوفان میں گم ہو گئے۔ میجر، کیپٹن اور ابراہیم نے تابڑ توڑ فائر کیے اور گولیوں کی بوچھاڑ کر دی لیکن وہ جا چکے تھے۔ گولیوں کی آوازیں پتھریلے پہاڑوں پر پتھریلی چٹانوں کی دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ آئیں۔ وہ کچھ دیر تک چپ چاپ گم سم کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر غار کے منہ میں فرش پر بیٹھ کر برفانی انسانوں کے حملہ کا انتظار کرنے لگے لیکن صبح تک کوئی حملہ نہ ہوا البتہ طوفان تھم گیا۔ آسمان صاف ہو گیا اور ہر طرف دھوپ پھیل گئی۔

واپسی

ابراہیم خوش تھا کہ اس نے برفانی انسانوں کو دیکھا لیکن اسے افسوس یہ تھا کہ چیتے کا بچہ چھن گیا۔ سلطان کا خیال تھا کہ اب برفانی انسانوں کی تلاش بے کار ہے کیونکہ ان پر فائر ہوا ہے اور یہ فائر دوسری بار ہوا ہے۔ پہلی بار ان پر فائر پہاڑی جنگل میں ہوا تھا اس لیے اب وہ بلتستان سے بھاگ جائیں گے اور لدّاخ کا رُخ کریں گے کیونکہ گولڈن ٹاور سے لداخ زیادہ دُور نہیں ہے۔ بروق پا بھی واپس جانا چاہتا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس کے بغیر اس کی بیوی پریشان ہو گی۔

دونوں کماغڈوز برفانی انسانوں کا پیچھا کرنا چاہتے تھے لیکن ان کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ ان کی چھٹیاں ختم ہونے میں اب صرف چھ دن باقی تھے اور وہ دو ایک دن اپنے گھر والوں کے ساتھ بھی گزارنا چاہتے تھے۔

آخر طے پایا کہ ٹھیک ایک ماہ بعد وہ پانچوں سُرموگاؤں میں اکٹھے ہوں گے۔ اس فیصلہ کے بعد بروق پا نے خود چائے تیار کی اور پراٹھے پکائے جو سب نے چائے کے ساتھ کھائے۔

ناشتہ کرنے کے بعد انہوں نے سارا سامان پیک کیا اور کیمپ نمبر ۲ کی طرف چل دیئے۔ چونکہ اب بوجھ کم تھا اور اترائی تھی اس لیے وہ دو بجے سہ پہر کو کیمپ نمبر ۲ میں پہنچ گئے۔

سلطان نے دیکھا ریچھ کی کھال برف میں دب گئی ہے۔ اس نے اسے برف سے نکالا۔ برف کو جھاڑا اور کھال کو تہہ کر کے رکھ دیا۔

کھانا کھانے کے بعد وہ تین بجے پھر چل پڑے۔ انہوں نے رات ایک چھوٹے گلیشیر پر بسر کی اور اگلے دن مسلسل سفر کرتے رہے۔ جب شام ہوئی وہ پہاڑی جنگل میں تھے لیکن وہ

وہاں ٹھہرے نہیں۔ انہوں نے اپنا سفر جاری رکھا اور رات تھکان سے چُور سُرموگاؤں پہنچ گئے۔

سلطان، بروق پا اور ابراہیم کو ہلکا ہلکا بخار تھا لیکن کماغڈوز ٹھیک ٹھاک تھے۔ دراصل وہ سفر کے عادی تھے۔ ان کو مسلسل سفر کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ وہ تھکنے کا نام نہ لیتے تھے۔

کماغڈوز نے رات سُرموگاؤں میں بسر کی اور اگلے دن اپنے گھروں کو چل دیئے۔

رپورٹ

سرموگاؤں کے لوگ کماغڈوز، سلطان، ابراہیم اور بروق پا کو مل کر بہت خوش ہوئے۔ پروفیسر الیگزغڈر تو حیران تھا کہ وہ سب برفانی انسانوں سے بچ کر آ گئے ہیں۔ اسے یہ بھی حیرت تھی کہ بیس ہزار فٹ کی بلندی پر یہ لوگ پہاڑ کی چوٹی سے پھسل کر کیوں ختم نہیں ہوئے۔ اس نے کئی بار پوچھا ''اُڈر آ والانش نہیں آیا'' وہ آوالانچ کو آوالانش کہتا تھا۔ خیر یہ تو کوئی خاص بات نہ تھی۔ کچھ لوگ آوالانچ کا تلفظ آوالانش کر دیتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ پروفیسر ان کے بچ جانے پر حیران تھا۔ وہ مسٹر مائیکل کو لندن بھجوا چکا تھا تاکہ اس کا علاج ہو اور وہ واپسی پر لندن سے کچھ سامان بھی لے آئے۔ پروفیسر نے اپنے ہاتھ سے ایک رپورٹ بھی تیار کی تھی جو اس نے عجیب وغریب حیواناتِ عالم پر تحقیق کرنے والے فاؤغڈیشن (مجلس) کو ارسال کی تھی۔ اس رپورٹ کا ایک حصہ:

''اب تک ہم نے جو فیلڈ ریسرچ کی ہے اس کے مطابق یہ ثابت ہو گیا ہے کہ برفانی انسان نہ صرف بلتستان میں پایا جاتا ہے بلکہ اسے دیکھا گیا ہے۔ ایک ہائی لینڈر یعنی ایسا شخص جو بلتستان کا رہنے والا ہے اور اونچے اونچے پہاڑوں پر گھاس اور جھاڑیاں کاٹتا ہے اور جس کا فوٹو اس رپورٹ کے ہمراہ ارسال کیا جا رہا ہے، دس بارہ دن برفانی انسانوں کے ساتھ رہ کر واپس آیا ہے۔ اس شخص سے جس کا نام بروق پا ہے، ایک طویل انٹرویو کیا جا رہا ہے۔ یہ انٹرویو بروق پا سے معلومات حاصل کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔ اب تک اس سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ برفانی انسان:

الف۔ عقل اور شعور کا مالک ہے گو عقل اور شعور کی سطح بلند نہیں۔

ب۔ وہ سبزی خور بھی ہے اور گوشت خور بھی۔
پ۔ وہ کھیل تماشے میں بے حد دلچسپی رکھتا ہے۔
ت۔ دن کے وقت غار میں چُھپا رہتا ہے اور رات کو گھومتا ہے۔
ٹ۔ اگر ضرورت ہو تو دن کو بھی غار سے باہر آ جاتا ہے۔
ث۔ بارش اور طوفان کو پسند نہیں کرتا۔ برف باری پسند کرتا ہے۔
ج۔ اس کی اپنی ایک خاص زبان ہے جس میں صرف سولہ الفاظ ہیں۔ ایک لفظ ''دگوش'' ہے جس کا مطلب ہے دوڑ جاؤ، بھاگ جاؤ۔ بھاگ کر جان بچاؤ۔

پروفیسر الیگزنڈر نے رپورٹ کے آخر میں لکھا تھا کہ اگر فاؤنڈیشن کا بورڈ آف ڈائریکٹرز چاہتا ہے کہ تحقیق جاری رکھی جائے تو پانچ لاکھ روپے کی گرانٹ منظور کی جائے اور رقم بلتستان میں نیشنل بینک آف پاکستان کی خپلو برانچ میں منتقل کی جائے۔ اس رقم میں سے ایک لاکھ روپیہ برفانی انسان کی زبان پر ریسرچ کرنے پر خرچ کیا جائے گا اور باقی چار لاکھ روپے دور پہاڑوں میں مہمیں بھیجنے پر خرچ ہوں گے۔ اگر یہ بات منظور نہیں ہے تو ہمیں بتایا جائے کہ رقم نہیں ملے گی تاکہ ہم واپس آ جائیں۔

یہ رپورٹ دلاور علی نمائندہ خصوصی روزنامہ ''صدائے وطن'' راولپنڈی نے بھی پڑھی تھی۔ وہ اس رپورٹ سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے پروفیسر کا ہاتھ بھی چوما اور وہ بال پوائنٹ بھی جس سے یہ رپورٹ لکھی گئی تھی۔ دلاور علی نے سوچا تھا کہ پانچ لاکھ میں سے پچاس ہزار روپے تو وہ گاٹھی مار کر لے جائے گا کیونکہ وہ پروفیسر کی لیبارٹری کا انچارج بننے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ اگلے دن اس نے اپنے اخبار میں خبر چھپوائی۔

سُرمو (نمائندہ خصوصی دلاور علی سے) کماغڈوز اور محققوں کی جو ٹیم پروفیسر الیگزنڈر کی ہدایت پر گولڈن ٹاور گئی تھی وہ کل شام واپس آ گئی۔ اس ٹیم میں پانچ افراد تھے جو بخیر و خوبی واپس آئے ہیں اور کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ اس ٹیم نے گولڈن ٹاور کے اردگرد پھیلے ہوئے برف سے ڈھکے سارے علاقہ کا سروے کیا اور سروے کے دوران ان کی مڈبھیڑ برفانی انسانوں سے ہوئی تاہم برفانی انسان کماغڈوز کی فائرنگ سے ڈر کر گولڈن ٹاور کی بلندیوں کی طرف چلے گئے۔ چونکہ اس وقت گولڈن ٹاور کی بلندیوں پر موسم شدید طور پر خراب تھا اور برف

کا طوفان آیا ہوا تھا اس لیے کماغڈوز اور ٹیم کے دوسرے ارکان نے ان کا پیچھا کرنا مناسب خیال نہیں کیا البتہ وہ ایک ریچھ اور ایک چیتا مارنے میں کامیاب ہو گئے۔ یاد رہے کہ مہم کے دوران میں ریچھ اور چیتے نے کیمپ پر حملہ کیا تھا۔ توقع ہے پروفیسر الیگزنڈر کی زیر قیادت برفانی انسان کی مہم کامیاب رہے گی۔

ظاہر ہے یہ خبر خاصی سنسنی خیز تھی۔ دلاور علی باقاعدہ اخبار نویس تو تھا نہیں کہ خبر درست طور پر مرتب کرتا۔ اس کے ذہن میں جو خیال آتا تھا وہ لکھ دیتا تھا۔ اخبار 'صدائے وطن' کو ایسی خبر کا انتظار تھا جو عام لوگوں میں مقبول ہو اور اس سے سنسنی پھیل جائے چنانچہ وہ ایسی خبر طمطراق سے صفحہ اول پر لگاتے تھے۔ اس خبر کے ساتھ پروفیسر الیگزنڈر اور بروق پا کی تین کالمی تصویریں بھی تھیں جو دلاور علی نے پروفیسر کے کیمرہ سے کھینچی تھیں۔

پروفیسر الیگزنڈر گھاگ آدمی تھا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ بروق پا سے وہ فائدہ اٹھا سکتا ہے یعنی بروق پا کے ذریعہ وہ برفانی انسانوں کی زبان کے الفاظ قلم بند کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس نے بروق پا کو دو ہزار روپے کی رقم دی تاکہ وہ سودا سلف لے سکے۔

''مطلب یہ ہے کہ تُو بے فکر ہو کر ہمارے ساتھ رہے۔'' پروفیسر الیگزنڈر بولا۔

بروق پا نے دو ہزار روپوں کی رقم اپنی جیب میں ڈالی جو اس کے کُرتہ کے اندر تھی اور سر کھجاتے ہوئے بولا۔

''لیکن میری بیوی تو خپلو میں رہتی ہے۔ میں تو اس کے پاس رہوں گا جی۔''

''اِڈر ہم آپ کو تیا مکان لے کر دے گا۔ اس میں رہنا'' پروفیسر بولا۔

''صاحب ہمارا اپنا گھر بار ہے خپلو میں۔ ہم اسے کیسے چھوڑ دیں۔'' بروق پا نے ادب سے کہا۔

''بابا اُس کو بیچ دو۔ پیسے کماؤ اور اِڈر ہمارے پاس آ جاؤ۔''

''صاحب خپلو والا گھر ہمارے باپ دادا کا گھر ہے۔ موروثی ہے، اُسے ہم کیسے چھوڑ دیں۔ لوگ کیا کہیں گے؟'' بروق پا نے پروفیسر کو بتایا۔

''کیسی بات کرتا ہے مین؟ وہ گھر چھوڑو اور اِڈر آ کر تیا گھر لے لو، کیا حرج ہے؟'' پروفیسر نے زور دے کر کہا۔

''آپ ولایتی آدمی ہے، ہم دیسی آدمی ہے۔ جس طرح سے آپ سوچتا ہے اس طرح سے ہم نہیں سوچتا صاحب'' بروق پا نے تنگ آ کر کہا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ کبھی کبھی ہمارے پاس آ جایا کرو۔''

''ہاں۔ یہ ٹھیک بات ہے۔ اس پر نہ مجھے اعتراض ہے اور نہ میری گھر والی کو۔'' بروق پا نے کہا اور اٹھ کر سڑک پر آ گیا جہاں اسے خپلو جانے والی جیپ مل سکتی تھی۔

گاؤں کا نمبردار اور سلطان کا والد خوش تھا کہ اس کا بیٹا واپس آ گیا ہے۔ سلطان اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس لیے وہ اسے آتے ہوئے اور جاتے ہوئے دیکھ کر خوش ہوتے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ دن رات ان کے پاس رہے لیکن سلطان کی طبیعت ایک سیلانی کی طبیعت تھی اور وہ سیر و شکار کا بھی عادی تھا۔ موسم کوئی بھی ہو وہ دریاؤں کے کناروں پر، چٹانوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ پہاڑوں کی چھاؤں میں اور ندی نالوں کے پایاب پانیوں میں گھومنا پھرنا پسند کرتا تھا۔ وہ برفانی چیتے، بھورے کالے ریچھ، مارخور، جنگلی یاک، اڑیال، مارکوپولو شیپ اور باگڑ بلوں کے شکار میں خاص مزہ لیتا تھا لیکن اس بار وہ خالی ہاتھ آیا تھا۔ اس کے ساتھ صرف بھورے ریچھ کی کھال تھی اور وہ ریچھ بھی اس نے شکار نہ کیا تھا۔

ابراہیم جس تجربہ سے ہو کر نکلا تھا اس سے اس کی خود اعتمادی میں اضافہ ہوا تھا۔ وہ اب دلیری سے بات کرتا تھا۔ اس کے لہجہ میں حوصلہ تھا۔ وہ کماؤنڈوز کے ساتھ رہ کر خود بھی چھوٹا موٹا کماؤنڈو بن رہا تھا۔ اسے خاص طور پر کیپٹن تنویر پسند تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ اس کا اُستاد بھی تھا۔

چوکیدار عبدالخالق اور اس کی بیوی اپنے بیٹے سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔

نئی ٹیم

نمبردار کی حویلی کا خاص کمرہ اب ایک طرح سے پروفیسر الیگزنڈر کا آفس بن گیا تھا۔ یہ طے ہوا تھا کہ پروفیسر ہر ماہ پانچ سو روپے نمبردار کو ادا کرے گا جو ایک طرح سے بیٹھک یا کمرے کا کرایہ تھا۔ پروفیسر اپنا کھانا خود تیار کرتا تھا۔ وہ ہفتہ بھر کے لیے چینی، چائے کی پتی، ڈبل روٹی اور لفافوں والا دودھ خپلو سے منگوا لیا تھا۔ اگرچہ سُرمو گاؤں میں گائیں موجود تھیں اور ان کا دودھ بھی دستیاب تھا لیکن پروفیسر نے ہمیشہ لفافوں یعنی پیکٹوں کا دودھ پسند کیا۔ بلتی میں گائے کو زُوں کہا جاتا ہے اور بیل کو زُو۔ بلتستان کی گائے یاک اور عام گائے کے درمیان ایک تیسری نسل ہوتی ہے۔ پروفیسر کو یہ نسل پسند نہ تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دیہات کی عورتیں صفائی پسند نہیں ہیں اور جب دودھ دوہتی ہیں تو بہت سے جراثیم دودھ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یہ دراصل پروفیسر کا وہم تھا کیونکہ دودھ گرم کرنے کے بعد جراثیم ختم ہو جاتے ہیں۔

پروفیسر الیگزنڈر زیادہ تر ڈبل روٹی کھاتا تھا۔ اس کے پاس کافی کی ایک بڑی بوتل تھی۔ وہ رات کو کافی پیتا تھا اور اگر اسے بھوک ستاتی تو وہ مرغی کی یخنی پیتا جسے وہ سوپ کہتا تھا۔ مہم کی واپسی کے بعد اس نے تین سو روپے ماہوار پر ابراہیم کو خدمت کے لیے بھرتی کر لیا تھا۔ وہ صبح دس بجے آتا اور دو بجے بعد دوپہر اپنے گھر کھانا کھانے چلا جاتا۔ پھر چار بجے سہ پہر کو آتا اور رات آٹھ بجے اپنے گھر کھانا کھانے اور سونے کے لیے چلا جاتا۔

چھ سات دن کے بعد بروق پا خپلو سے وارد ہوا۔ اس کی صحت اب اچھی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بہت اچھی تھی۔ گھر کا کھانا، گھر کا آرام، نہ کام نہ کاج۔ اب تو وہ لکڑیاں کاٹنے بھی نہیں جاتا تھا۔ وہ دوپہر سے پہلے نمبردار کی بیٹھک عرف پروفیسر کے دفتر میں آیا۔ اس

وقت دفتر میں نمبردار، سلطان، ابراہیم، ابراہیم کا والد عبدالخالق، پروفیسر خود اور گاؤں کے تین چار دوسرے لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ نمکین چائے پی رہے تھے۔ بروق پاہر ایک سے گلے ملا البتہ پروفیسر نے صرف مصافحہ کیا۔ سبھی لوگ فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اس لیے بروق پا بھی نیچے فرش پر بچھی چٹائی پر بیٹھ گیا۔

ابراہیم نے اسے چائے کی پیالی دی اور وہ سُر سُر چائے پینے لگا۔ اسی دوران میں وہاں گاؤں کا بوڑھا قادر بابا آ گیا۔ وہ لاٹھی ٹیکتے ہوئے آیا تھا اور اندر آ کر پروفیسر کے پاس بیٹھ گیا۔ اس کی موجودگی میں پروفیسر الیگزنڈر جوان لگ رہا تھا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ بابا قادر صدیوں کسی تہہ خانہ میں رہنے کے بعد باہر آیا تھا۔ اُس کا پرانا لمبا کوٹ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اس کا کرتہ میلا کچیلا تھا۔ اس کی شلوار میل اور دھبوں سے چتکبری ہوگئی تھی۔ اس کے سر پر پگڑی جگہ جگہ سے لیرو لیر تھی۔ بابا قادر کے پیروں میں گھاس کے جوتے تھے۔ بابا کا چہرہ گول تھا جس پر گھنی سفید داڑھی تھی۔ اس کے ابرو بھی سفید ہو گئے تھے۔ بابا قادر کی عمر سو سال سے اوپر ہو گی۔

بابا نے چائے پیتے ہوئے کہا۔

''سُنا ہے گوروں کو انچن کے قلعہ سے کچھ حاصل وصول نہیں ہوا۔'' بابا قادر کسی خاص آدمی سے مخاطب نہ تھا۔

''کیا کہتا ہے اولڈ مین؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

جب کسی نے جواب نہ دیا تو سلطان بولا۔

''اولڈ مین کہتا ہے کہ ہم سب خالی ہاتھ آ گئے اور ہمیں گولڈن ٹاور سے کچھ نہ ملا۔''

''اڈریٹی ٹو ملا تھا۔ اس کے متعلق اخبار میشن ملا ہے۔'' بوڑھا پروفیسر بولا۔

''اولڈ مین کا یہ مطلب نہیں ہے۔'' سلطان نے پروفیسر کو بتایا۔

''کیا پوچھ رہا ہے گورا؟'' بابا قادر نے چائے کی چسکی لے کر پوچھا۔

''کچھ نہیں بابا جی۔ میرے ساتھ گپ لگا رہا ہے۔'' سلطان نے بابا قادر کو تسلی دی۔

''اچھا اچھا'' اور بابا قادر پھر چائے پینے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور وہ پیالے کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد بابا قادر پھر بولا۔

''ہمیں بھی کچھ نہ ملا تھا اور میرے دو ساتھی برف میں دب کر مر گئے تھے۔

''کون مر گئے تھے اولڈ مین؟'' پروفیسر موت کے ذکر پر چونکا۔

''سلطان۔ گورے کو بتاؤ کہ صرف وہی خزانہ لینے کے لیے ولایت سے نہیں آیا ہم لوگ بھی خزانہ لینے دو بار انچن کے پہاڑ پر گئے تھے۔'' چائے پی کر بابا قادر چست ہو گیا تھا۔

''ہاں ہاں بتاؤ۔ ضرور بتاؤ۔'' پروفیسر نے شوق کا اظہار کیا۔

''سلطان۔ تو اس گورے کو بتا دے کہ اسے خزانہ نہیں مل سکتا واپس چلا جائے۔'' لگتا تھا بابا قادر کو گورے پسند نہیں تھے۔ وہ اپنی نفرت چھپانے سے قاصر تھا۔

''بابا۔ تُم ہم کو بتا دو کیا باٹ ہے۔ اِڈر ہم سُننے کے لیے تیار ہے۔'' پروفیسر نے کہا۔

''میری بات سب جانتے ہیں۔ میں نے دوبارہ کوشش کی تھی کہ انچن کے قلعہ سے خزانہ لاؤں لیکن دونوں بار ناکام رہا۔ میرے ساتھ جو لوگ گئے تھے وہ بھی کامیاب نہ ہوئے۔ اُن میں سے دو آدمی برف کے نیچے دب گئے اور آج تک ان کا اتا پتا نہیں ملا۔'' بابا قادر سانس لینے کے لیے رُکا تو پروفیسر الیگزنڈر بولا۔

''یہ انچن کون تھا؟''

''دُنیا جانتی ہے علی شیر خاں انچن ہمارا بادشاہ ہو گزرا ہے۔ وہ بہادر تھا، دلیر تھا، انصاف پسند تھا، خوبصورت تھا، سخی تھا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ بہت بڑا فاتح تھا۔ اس نے بہت سے ملک فتح کیے تھے۔''

''کون کون سے ملک بابا قادر؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''علی شیر خاں انچن نے گلگت، چیلاس، چترال، کافرستان، پورگ اور تبت فتح کیے۔''

بابا قادر نے جوش میں آ کر اپنا بوڑھا ہاتھ ہوا میں لہرایا۔

''ہم سب ملکوں کے بارے میں تھوڑا تھوڑا جانتا ہے لیکن یہ پورا گ کون سا ملک ہے؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''پورگ یا پوراگ لدّاخ کے اس علاقہ کو کہا جاتا ہے جس میں کرگل وغیرہ ہیں۔ اس سے بابا کی مراد لدّاخ ہے۔'' سلطان نے بتایا۔

''علی شیر خاں انچن کا زمانہ مغل بادشاہ اکبر کا زمانہ تھا۔ جب اکبر نے کشمیر کو فتح کیا تھا تو اس وقت اس کی دوستی علی شیر خاں انچن سے ہوئی۔ اس دوستی کی وجہ سے اکبر اور علی شیر خاں

انچن کے خاندانوں میں رشتے ہوئے۔علی شیر نے اکبر کے بیٹے شہزادہ سلیم کو اپنی بیٹی کا رشتہ دیا اور اکبر نے ایک مغل شہزادی کا رشتہ انچن سے کیا۔اس شہزادی کا نام گُل خاتون تھا۔بلتی اسے مندوق گیالمو کے نام سے اب تک یاد کرتے ہیں۔'' بابا ایک بار پھر سانس لینے کے لیے رُکا۔

''انچن کا کیا مطلب ہے سلطان؟'' پروفیسر نے پوچھا۔

''بڑا عظیم، گریٹ، عظیم علی شیر خاں۔'' سلطان نے بتایا۔

''علی شیر خاں دی گریٹ اور اکبر دی گریٹ۔'' پروفیسر نے دو عظیم بادشاہوں کا نام لے کر ایک طرح سے اپنی تاریخ دانی کا ثبوت دیا۔

بابا قادر سانس لے چکا تھا اس لیے اس نے پھر بات شروع کی۔

''علی شیر خاں انچن جب تبت گیا تو اس نے تبت کے لہاسہ شہر پر حملہ کیا۔اس وقت لہاسہ میں تبت کا بادشاہ رہتا تھا۔ یہ بادشاہ تبت کے لوگوں کا بڑا پیر بھی تھا۔ ساری دولت اس کے پاس تھی۔ اس نے شیر علی خاں انچن سے کہا کہ دولت لے لو شہر کو تباہ نہ کرو اور میرے لوگوں کو قیدی نہ بناؤ۔''

''بابا قادر ٹھیک کہتا ہے ہماری اور تبت کی تاریخ میں یہی لکھا ہے۔ میں نے پڑھا ہے۔'' سلطان بولا۔

''پھر کیا ہوا، بابا قادر؟'' پروفیسر بولا۔

''انچن بڑا بادشاہ تھا اس لیے اس کی سلطنت بڑی تھی۔ بادشاہ چھوٹا ہو تو سلطنت بڑی نہیں ہوتی۔ انچن نے کہا ٹھیک ہے۔ اس نے تبت کے بادشاہ کا خزانہ حاصل کیا۔ خچروں پر لاد کر پورنگ کے راستہ بلتستان کی طرف چل پڑا۔ راستہ میں اسے اطلاع ملی کہ چترال میں بغاوت ہوگئی ہے۔ اس نے سارا خزانہ ایک پہاڑ کی غار میں رکھا۔ دس آدمیوں کو چوکیدار بنایا اور خود گھوڑے اور خچروں کو لے کر فوج سمیت چترال چلا گیا۔ چترال فتح ہوا تو وہ کافرستان کی طرف چلا گیا۔ بس پھر وہ ملک فتح کرتا رہا اور خزانہ بھول گیا۔ چوکیداروں کو درندوں نے کھا لیا۔ درندوں میں ایک قسم ایسی تھی جن کا قد دس دس فٹ تھا۔جسم پر لمبے لمبے بال تھے اور ان کے ناخن چاقوؤں کی طرح تیز تھے۔ یہ برفانی لوگ تھے۔''

''ہیڈ مین۔ کیا اولڈ مین ٹھیک بولتا ہے؟'' پروفیسر نے سلطان کے والد سے پوچھا۔

''ہاں صاحب! بابا قادر ٹھیک کہتا ہے۔ ہماری کتابوں میں ایسے ہی لکھا ہے اور ہمارے لوگوں کو ایسے ہی یاد ہے۔ یہ باتیں سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچی ہیں۔ حالانکہ سلطان علی شیر خاں انچن کا زمانہ گزرے چار سو سال بیت گئے ہیں۔'' نمبردار نے بتایا۔

محفل میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ پھر ابراہیم بولا۔

''بابا قادر اگر اب کوئی خزانہ لینے جائے تو کیا تم ساتھ چلو گے؟'' بابا کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی اور وہ ہنس کر بولا۔

''میں ضرور جاؤں گا کیوں نہ جاؤں لیکن میں گلی میں موڑ تک جاؤں گا اور جانے والوں کو دعاؤں کے ساتھ وداع کروں گا۔ مجھے مہم پر جانے والوں سے پیار ہے کیونکہ وہی لوگ مہم پر جاتے ہیں جو بہادر ہوں۔''

''بابا جی آپ دو بار گئے لیکن ناکام کیوں آئے۔'' سلطان نے پوچھا۔

''ہمیں اس غار کا پتہ نہ تھا جہاں خزانہ دفن ہے۔ میرا خیال ہے غار کا منہ پتھروں اور برف سے بند ہو چکا ہے۔ ہواؤں کے چلنے سے اور آوالانچوں کی وجہ سے راستے بنتے بگڑتے رہتے ہیں اور پھر اونچے پہاڑوں پر تو راستہ ایک دن میں لاپتہ ہو جاتا ہے۔ راستہ پر برف جم جاتی ہے اور راستہ گم ہو جاتا ہے۔ہمیں راستہ نہ ملا اور ہم بھوک، پیاس، تھکاوٹ اور درندوں کے خوف سے دونوں بار واپس آ گئے۔''

''آپ کے خیال میں خزانہ ابھی تک وہیں ہے جہاں چار سو سال پہلے رکھا گیا تھا۔'' نمبردار نے پوچھا۔

''تر میپا۔ اگر خزانہ نکالا جاتا تو سب سے پہلے آپ کو اطلاع ہوتی یا آپ کے باپ کو اطلاع ہوتی یا تمہارے دادا جان کو اطلاع ہوتی۔ خزانہ کا ہاتھ آنا چھوٹی بات تو نہیں ہے بڑی بات ہے اور بڑی بات ہو جائے تو سب کو پتہ چل جاتا ہے۔'' بابا قادر اپنے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھا اور دروازہ کا سہارا لے کر آفس سے باہر نکل گیا۔

اسی شام نمبردار اور پروفیسر نے مل کر فیصلہ کیا کہ گولڈن ٹاور کا خزانہ حاصل کرنے کے لیے ایک ٹیم پندرہ دن کے اندر اندر روانہ کی جائے جس میں سلطان، ابراہیم، بروق پا، عبدالخالق اور مائیکل ہوں۔ پروفیسر الیگزنڈر کے اصرار پر اسے بھی ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔ دس دن بعد مائیکل بھی آ گیا۔

گوریلا ٹیم

یہ عجیب اتفاق ہے کہ ایک سال پہلے جب انڈین آرمی کا کرنل دھنی رام لہہ میں تھا تو اس نے تبت اور لداخ کی تاریخ پر سکاٹ لینڈ کے ایک مشنری ڈاکٹر کے سفرنامہ کا مطالعہ کیا۔ یہ سفرنامہ انگریزی میں تھا۔ سفرنامہ کے مطالعہ کے دوران اس نے ایک جگہ پڑھا کہ بلتستان کے سلطان علی شیر خاں انچن نے تبت اور لداخ پر حملہ کیا تھا اور وہیں سے سونا چاندی اور ہیرے جواہرات لوٹ کر بلتستان لے گیا لیکن راستہ میں برف کے طوفان میں گھر گیا اور اسے ایک پہاڑ کے غار میں پناہ لینا پڑی۔ اس دوران میں اسے اطلاع ملی کہ چترال میں بغاوت ہوگئی ہے اور وہ خزانہ غار میں چھوڑ کر چترال کی طرف روانہ ہوا۔ خزانہ جس جگہ پر تھا اس جگہ کو بعد میں گولڈن ٹاور کا نام دیا گیا کیونکہ خزانہ ایک پہاڑ کے غار میں تھا۔

کرنل دھنی رام نے بلتستان اور لدّاخ کے کئی نقشے حاصل کیے لیکن انگریزی، اردو، ہندی اور تبّتی زبانوں کے نقشوں میں کہیں بھی گولڈن ٹاور کا نام درج نہ تھا۔ آخر اسے پیرس سے بلتستان کا نقشہ منگوانا پڑا جس میں گولڈن ٹاور کا نام درج تھا۔

کرنل دھنی رام کی جان میں جان آئی اور اس نے مزید منصوبہ بندی شروع کی لیکن اس کا تبادلہ لہہ سے کرگل ہوگیا۔ کرگل وہی شہر ہے جو بلتستان کے قریب لداخ میں ہے اور یہ شہر ضلع پوریگ کا صدر مقام ہے۔

کرگل میں آ کر کرنل دھنی رام نے بیس سکھ فوجی چنے اور ان کو ایک ماہ تک سانس پکا کرنے کے لیے ٹریننگ دیتا رہا۔ ٹریننگ میں صرف بھاگ دوڑ اور پہاڑوں پر چڑھنا شامل تھا۔ ایک ماہ کے بعد اس نے بیس میں سے دس سخت جان سِکھ چُنے اور ان کو دو ماہ ٹریننگ دیتا

رہا۔ دو ماہ کے بعد اس نے پانچ سِکھ چُنے اور ان کو دو ماہ تک خوب ٹریننگ دی۔ پندرہ دن تک وہ ان کو میپ ریڈنگ یعنی نقشہ پڑھنے کی تربیت دیتا رہا۔ دو دن تک اس نے ان کو بھوکا پیاسا رکھا تاکہ ان کا طرزِ عمل نوٹ کر سکے۔ وہ پانچوں اس پر پُورا اترے۔

جس رات اس نے ان کو لے کر گولڈن ٹاور کی طرف روانہ ہونا تھا اس سے ایک دن پہلے کرنل دھنی رام نے ان پانچ سکھ گوریلوں کو بتایا کہ وہ گولڈن ٹاور جا رہے ہیں اور وہاں جا کر وہ ایک ایسی زیرِتعمیر فیکٹری کو تباہ کریں گے جس میں پاکستان ایٹم بم بنا رہا ہے۔ اگر وہ کامیاب ہوگئے تو ان کو بھارت کا صدر بہادری کا سب سے بڑا اعزاز دے گا جسے کرتی چکر کہا جاتا ہے۔

سکھ گوریلوں کو کسی مرحلہ پر پتہ نہ چل سکا کہ کرنل دھنی رام کا اصل مقصد گولڈن ٹاور کا خزانہ لُوٹنا ہے۔

کرنل دھنی رام ایک خبطی فوجی افسر تھا۔ اس کے ذہن پر گولڈن ٹاور کے خزانہ کا خبط سوار تھا۔ وہ سکھوں کا دوست بھی نہیں تھا۔ ٹھیک ہے اس نے سکھوں پر محنت کی تھی اور ان کو گوریلا بنایا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ اگر سکھ خزانہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو وہ ان سے نبٹ لے گا۔ وہ پانچ گوریلوں سے یہ کہہ کر خزانہ خود حاصل کرسکتا تھا کہ یہ سرکاری مال ہے۔ وہ سکھ فوجیوں کو کامیابی کے بعد گولی بھی مارسکتا تھا اور اگر مہم کے دوران مارے جاتے تو کرنل کا کیا جاتا؟ ایسے کاموں میں ایسا ہوتا ہی ہے۔ وہ سونا مرگ (کشمیر) کے ہائی آلٹی چیوڈ وارفیئر سکول کا انچارج رہ چکا تھا اور جانتا تھا کہ سردی، بھوک، آکسیجن کی کمی، تھکاوٹ، نیند، حادثہ اور بیماری کی وجہ سے اونچے اونچے برف پوش پہاڑ پر موت کا آ جانا بہت آسان ہے۔ پہاڑ پر انسانوں کو عموماً چار بیماریاں گھیر لیتی ہیں۔ دانتوں سے خون کا بہنا یعنی پائیوریا، بواسیر، بلڈ پریشر کا بڑھ جانا اور جوڑوں کا درد، سونا مرگ (کشمیر) میں انڈین آرمی کی طرف سے برف پوش پہاڑوں پر لڑنے کی تربیت دینے کے لیے جو سکول کھولا ہوا ہے اس سکول میں فوجیوں کو بتایا جاتا ہے کہ اونچے سرد پہاڑوں پر کن بیماریوں کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔

کرنل دھنی رام نے بھی اپنے گوریلوں کو یہ سب کچھ بتا دیا تھا۔ اس کے علاوہ برف پوش پہاڑوں پر جان بچانے کے دوسرے طریقے بھی ان کو بتا دیئے تھے البتہ کرنل دھنی رام کو یہ

معلوم نہ تھا کہ جس امریا میں وہ اور اس کے گوریلے مہم جوئی کے لیے جا رہے ہیں وہاں برفانی انسان بھی رہتے ہیں جن پر سردی کا اثر نہیں ہوتا۔ کرنل دھنی رام نے جو گوریلا ٹیم تیار کی تھی اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ عام فوجیوں کا خیال تھا کہ کرنل خبطی آدمی ہے اور سونا مرگ کے ہائی آلٹی چیوڈ آرمی وارفیئر سکول سے ہو کر آیا ہے اس لیے اپنا شوق پورا کرنے کے لیے جوانوں کو دوڑاتا ہے۔ اس کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے پوری راز داری سے کام لیا اور روانہ ہونے سے پہلے کسی کو نہ بتایا۔ کرنل کا خیال تھا کہ وہ خاص مشن دس دن میں مکمل کر لیں گے۔ بہرحال اس نے اور اس کے گوریلوں نے پندرہ دن کی رخصت لی اور ایک رات سورج نکلنے سے پہلے سرحد پار کر کے پاکستانی علاقہ بلتستان میں آ گئے۔

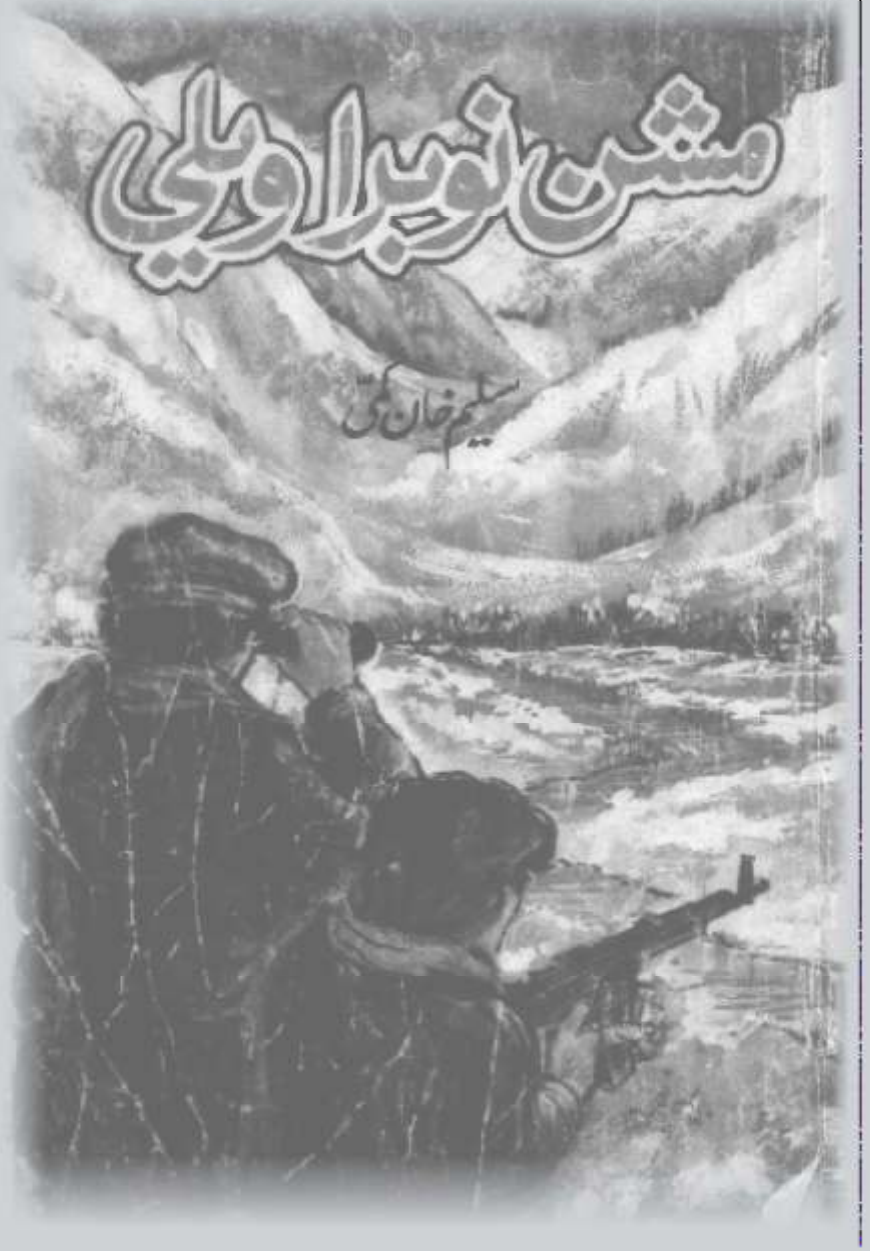

مشن نوبرا ویلی
سلیم خان گمی

کرنل کا فرار

گولڈن ٹاور کا برفانی غار ۲۳۴۰۰ فٹ کی اونچائی پر تھا۔ گولڈن ٹاور کے برابر ٹیڑھی چوٹی ۲۳۰۰۰ ہزار فٹ کی بلندی پر تھی یا یوں کہیے کہ ٹیڑھی چوٹی ۲۳۰۰۰ ہزار فٹ بلند تھی۔ تین نمبر گلیشیر کی بلندی، اونچائی ناپنے والا آلہ، آلٹی میٹر ساڑھے بائیس ہزار فٹ بتاتا تھا۔ یہ وہ بلندیاں ہیں جن پر آکسیجن کی کمی کی وجہ سے عام انسانوں کو سانس لینا دوبھر ہو جاتا تھا۔ میجر نوری اور اس کی پارٹی کے پاس اب تو نہ آکسیجن کے ڈبے تھے اور نہ ہی آکسیجن ماسک تھے۔ اس لیے اِن سب کا بُرا حال تھا۔ ابراہیم بارہ سال کا لڑکا تھا۔ اس لیے اُس کے پھیپھڑے میجر نوری، کیپٹن تنویر، کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت کے مقابلہ میں زیادہ نرم، حساس اور کمزور تھے۔ پھر وہ کمانڈو بھی نیا نیا تھا۔ باقی چار کمانڈوز تو باقاعدہ تربیت کے بعد کمانڈو بنے تھے اور کئی مہموں میں حصہ لے چکے تھے۔ ابراہیم تو ایک طرح سے شوقیہ فن کار یعنی شوقیہ کمانڈو تھا تاہم ایک بات تھی۔ میجر نوری اور اُس کے دوسرے تین ساتھی میدانی علاقوں کے رہنے والے تھے لیکن میجر کا یہ ننھا ساتھی یعنی ابراہیم پہاڑی لڑکا تھا اور پہاڑوں پر کھیلتے بھاگتے دوڑتے اور کدکڑے لگاتے جوان ہو رہا تھا۔ اس لیے پہاڑی لڑکا ہونے کے ناطے اُس میں بلندی پر چلنے کی سکت پیدا ہو گئی تھی۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو وہ کرنل دھنی رام کی طرح کبھی کا چکرا کر گر پڑا ہوتا۔

جب وہ برف کی پتلی دیوار پر سے تیز تیز چلنے لگے تو اُن کے دائیں طرف گولڈن ٹاور کی کچی برف سے ایک چھوٹا گولہ رواں ہوا تھا جس کی حرکت سے ان کے پیروں تلے برف کی دیوار کانپ رہی تھی۔ ان کے بائیں طرف پانچ عدد برفانی انسان لڑھکتے ہوئے نیچے کی طرف بھاگ گئے تھے۔ برفانی انسانوں نے اپنی برفانی زبان کا لفظ 'دگوش' (دوڑ جاؤ۔ بھاگو) سُنا اور

لڑھکتے ہوئے دُور نیچے نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ البتہ اُن کے پیچھے غار کے منہ میں یا یوں کہیے کہ غار کے منہ کے سامنے دس عدد برفانی انسان کھڑے اُن کو گھور رہے تھے۔ ان برفانی انسانوں کے چہروں پر کیا تاثرات تھے یہ کوئی نہ دیکھ سکا کیونکہ اُن کو تو اپنی جان بچانے کی فکر تھی۔ ایک ہی وقت میں آوالانچ اور برفانی انسانوں سے مقابلہ ممکن نہ تھا۔

جب وہ چبوترے پر پہنچے تو وہاں کوئی نہ تھا۔ بے ہوش کرنل دھنی رام کا کوئی نام ونشان نہ تھا۔ کیا وہ برفانی انسانوں کی طرح نیچے لڑھک گیا ہے؟ کیا اُسے کوئی برفانی گدھ اُٹھا کر لے گیا ہے؟ یا اُسے کسی درندے نے ہڑپ کر لیا ہے؟ کیا وہ برف کے اندر سما گیا ہے؟ کیا وہ واپس بھاگ گیا ہے؟ کیا اُس کے ساتھی اُسے ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر کے ذریعہ اُٹھا کر لے گئے ہیں؟ لیکن اتنی بلندی پر ہیلی کاپٹر نہیں اُڑ سکتا کیونکہ وہ کسی پہاڑ سے یا پہاڑ کی کسی چوٹی سے ٹکرا کر گر پڑے گا۔ پھر کرنل دھنی رام کہاں چلا گیا؟

وہ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ وہ سب حیران تھے کہ دھنی رام آخر گیا کہاں؟

''میرے خیال میں وہ بھاگ گیا ہے۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔

''مگر وہ تو بیہوش ہو کر گر پڑا تھا۔'' میجر نوری بولا۔

''وہ ڈرامہ رچا رہا تھا۔ برف کی دیوار پر چلتے ہوئے بھی وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ بھی ڈرامہ تھا۔ اس کے بعد وہ چبوترے پر آیا تو اُس نے یہاں بھی اداکاری شروع کر دی۔ وہ پاکھنڈی تھا۔ اُس نے پاکھنڈ رچایا اور کامیاب رہا۔'' کیپٹن تنویر غصہ سے بولا۔ حالانکہ اتنی بلندی پر غصہ نقصان دہ تھا۔

''اگر وہ بھاگ کر جاتا تو کچی برف پر اُس کے پیروں کے نشان نظر آتے۔'' میجر بولا۔

''سر اس بلندی پر ہوا کی تیزی کی وجہ سے پیروں کے نشان مٹ جاتے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھئے ہمارے پیروں کے نشان بھی مٹ چکے ہیں۔ تیز ہوا تازہ اور کچی برف کو اُتھل پتھل کر دیتی ہے۔ ہم جس راستہ سے آئے تھے وہ اُسی راستہ سے واپس چلا گیا ہے۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔

''اگر یہ بات سچ ہے تو جلدی کیجیے۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔'' میجر نوری نے کہا اور چل پڑا۔ وہ سب میجر کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔

وہ سرینگر سے بیاسی کلومیٹر دُور سونا مرگ ہائی آلٹی چیوڈ آرمی سکول کا کمانڈنٹ رہ چکا

تھا۔ بھلا اُسے کیسے چکر آ سکتا تھا؟ یا وہ کیسے بیہوش ہوسکتا تھا؟ وہ ڈرامہ کر رہا تھا، ڈرامہ۔ کیپٹن تنویر میجر کے پیچھے چل بھی رہا تھا اور بول بھی رہا تھا۔ اُس کی بات چیت میں غصہ تھا۔

جب وہ سارا دن دراڑوں اور برف کے میناروں سے بچتے بچاتے گلیشیر نمبر ۳ پر اپنے کیمپ میں آئے تو کیمپ خالی تھا۔ خیمہ کے اندر دیکھ بھال کے بعد پتہ چلا کہ وہاں ایک سکی گم ہے اور بیف ہنٹر کا بڑا ٹکڑا بھی نہیں ہے۔ بات صاف تھی۔ کرنل دھنی رام اُن کی غار کی طرف روانگی کے بعد چبوترے پر سے کھسک کر برف کی دیوار پر چوپائے (چار پیروں والا جانور) کی چال چلتا ہوا اور نظروں سے اوجھل ہوتا ہوا گلیشیر نمبر ۳ پر آیا اور پھر وہاں سے کیمپ کے خیمہ سے سکی اور بیف ہنٹر کا بڑا ٹکڑا لے کر واپس لداخ کی طرف روانہ ہوگیا۔ وہ رات ان سب نے گلیشیر نمبر ۳ کے کیمپ نمبر ۵ میں گذاری۔

اب پچھتائے کیا ہوت

کرنل دھنی رام اور اُس کے سکھ ساتھی کرگل سے آئے تھے۔

کرگل لداخ کا ایک بڑا شہر بھی ہے اور بڑی چھاؤنی بھی۔ کرگل کا علاقہ پرانے زمانے میں پورگ یا پوریک کہلاتا تھا۔ گلگت سکاؤٹس نے ۱۹۴۸ء میں کئی علاقے فتح کیے۔ ان میں کرگل کا علاقہ بھی شامل تھا لیکن بعد میں کرگل کے علاقے کی فتح قائم نہ رہ سکی اور انڈین آرمی نے یہ علاقہ واپس لے لیا۔ انڈیا نے کرگل شہر میں ایک بڑی چھاؤنی بھی قائم کی۔ کرگل سے لداخ کا صدر مقام لہہ دوسو تیس کلومیٹر اور کرگل سے لداخ کے ایک ضلع زنسکر کا مقام پدم دوسو چالیس کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ لداخ میں کرگل، پدم اور لہہ انڈین آرمی کی قائم کی ہوئی تین بڑی چھاؤنیاں ہیں۔ سیاچن گلیشیر کی لڑائی میں انہی چھاؤنیوں سے بھارتی فوجی جاتے اور آتے ہیں۔ یہ لڑائی پاک آرمی کے خلاف ۱۹۸۱ء سے لڑی جا رہی ہے۔ سیاچن گلیشیر کی بلندی بعض مقامات پر اٹھارہ ہزار فٹ ہے اور بعض مقامات پر ساڑھے بیس ہزار فٹ۔ یہ گلیشیر قطب شمالی اور قطب جنوبی کے بعد دنیا کا سب سے بڑا گلیشیر ہے جو بہتّر ہزار کلومیٹر لمبا اور دو سے چار کلومیٹر تک چوڑا ہے۔ سیاچن گلیشیر بلتستان میں ہے۔ لیکن انڈین آرمی نے اس پر دھوکہ سے قبضہ کر لیا ہے۔ اس پر قبضہ کرنے کے لیے جن فوجیوں کو بھیجا گیا اُن کو قطب جنوبی کے

برف زار اور سری نگر سے چوراسی کلومیٹر دور سونا مرگ کے انتہائی بلندی کے تربیتی سکول سونا مرگ میں تربیت دی گئی تھی۔

کرنل دھنی رام سونا مرگ کے سکول کا انچارج رہ چکا تھا۔ اس لیے انتہائی بلند برف پوش پہاڑوں اور گلیشیر پر زندہ رہنے اور چلنے پھرنے کا فن جانتا ہے۔ اُس نے کھانسنے، چکرانے اور بیہوش ہو کر گرنے کا جو بہانہ بنایا اُس کے پیش نظر میجر نوری نے سمجھا کہ وہ بھاگنے کی سکت نہیں رکھتا۔ چنانچہ وہ اُسے چبوترہ پر چھوڑ کر اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ خزانہ کی تلاش میں غار کے اندر چلا گیا اور جب واپس آیا تو کرنل دھنی رام نو دو گیارہ ہو چکا تھا۔ کرنل کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ چنانچہ اُس نے ایسی شاندار ایکٹنگ کی کہ میجر نوری دھوکہ کھا گیا۔

کرنل دھنی رام کے بھاگ نکلنے کا سب سے زیادہ دکھ ابراہیم اور کیپٹن تنویر کو ہوا تھا۔ اگر ان دونوں کا بس چلتا تو اُسے گولی کا نشانہ بنا ڈالتے۔ لیکن میجر نوری کی انسان دوستی اور نرم دلی کا فائدہ اٹھا کر کرنل دھنی رام بھاگ نکلنے میں کامیاب ہ گیا۔

اگلے دن صبح سویرے وہ چل پڑے اور سارا دن برف کے تودوں، برف کے میناروں، برف کی دراڑوں، ٹھنڈی یخ بجری، آئس فال کے گول اور چکور ٹکڑوں، تیز ہوا اور آکسیجن کی کمی کا مقابلہ کرتے ہوئے سفر کرتے رہے۔ صرف دوپہر کو وہ تھوڑی دیر کے لیے بجری پر ستانے اور گرما گرم چائے کے ساتھ کھانا کھا کر چل پڑے۔ کھانا کیا تھا؟ مکئی کی روٹی اور بڑے گوشت کا قیمہ۔ مکئی کی روٹی ابراہیم نے پکائی تھی اور قیمہ انہوں نے پہلے سے تیار کر کے ایک ڈبہ میں رکھ چھوڑا تھا۔ سویٹ ڈش کے طور پر ڈبل روٹی کے سلائسوں پر مرملیڈ لگا کر کھایا۔ وہ سارا دن مسلسل چل کر صرف بیس میل کا فاصلہ طے کر سکے۔ کوہ پیما ٹیمیں صرف سولہ میل کا فاصلہ طے کرتی ہیں۔ لیکن ان ٹیموں کے پاس وزن زیادہ ہوتا ہے۔ میجر نوری کی ٹیم میں جو مہم جو شامل تھے ان کے پاس زیادہ وزن نہ تھا۔

اُن سب نے رات سترہ ہزار فٹ کی بلندی پر گلیشیر نمبر ایک پر بسر کی۔ اگلے دن سفر کرنے کے بعد وہ شام کو اُس غار میں آ گئے جہاں سے نمبردار کا بیٹا سلطان، انگریز پروفیسر الیگزینڈر اُس کے ساتھی مائیکل اور بروق پا کو لے کر ڈاکٹر کی ٹیم کے ساتھ سرمو گیا تھا۔ اب غار کے بعد جو گاؤں آنے والا تھا اُس کا نام سکسہ تھا جو دریائے سیوق کے کنارے (باقی

کنارے) بلندی پر تھا۔ سکسہ کا مطلب ہے جلا ہوا۔ یہ گاؤں یعنی سکسہ ایک بار برفانی قزاقوں نے لوٹ کر جلا دیا تھا لیکن گاؤں کے لوگوں نے اسے دوبارہ آباد کر لیا اور اُس کو سکسہ (جلا ہوا) کا نام دیا۔ بلتستان میں سکسہ بہادر اور شریف لوگوں کا گاؤں مشہور ہے اور اُس گاؤں میں سُنی، شیعہ اور نوربخشیہ عقیدوں کے لوگ پیار محبت سے رہتے تھے۔

میجر نوری چاہتا تھا کہ سرمو روانہ ہونے سے پہلے دو تین دن سکسہ میں گذارے۔ ابراہیم کا خیال تھا کہ سکسہ کی نسبت سیاری یا فرانو کے گاؤں زیادہ نظر فریب اور پرکشش ہیں۔ دراصل بلتستان کے تمام گاؤں خوبصورت ہیں اور حسین منظر پیش کرتے ہیں۔ وہ دریاؤں کے آس پاس بسے ہوئے ہیں۔ ان دیہات میں ہرے بھرے جھنڈ ہوتے ہیں۔ خوبانی کے درختوں پر جب پھول کھلتے ہیں (اور یہ پھول مئی جون میں کھلتے ہیں) تو ہر طرف خوشبو اور مہک پھیل جاتی ہے۔ برفانی نالوں سے زمین سیراب ہوتی ہے تو اس میں قسم قسم کی فصلیں اُگتی ہیں۔ فرصت کے اوقات میں لوگ پولو کھیلتے ہیں اور چوری چوری برفانی چیتے، جنگلی یاک اور مارخور کا شکار کرتے ہیں۔ چوری اس لیے کہ شکار پر پابندی ہے۔ لوگوں کے رنگ گورے چٹے ہیں۔ اگرچہ جسم زیادہ لمبے نہیں ہیں لیکن سڈول اور طاقتور ہیں۔ دنیا میں سب سے دلیر اور مضبوط پورٹر بلتستان کے ہیں۔ وہ نیپال کے شرپا پورٹروں سے بھی زیادہ مضبوط، صابر اور وفادار ثابت ہوئے ہیں۔ انہوں نے غار کے اندر داخل ہو کر خدا کا شکر ادا کیا کہ سر پر آسمان کی بجائے چھت تھی۔ سب سے پہلا کام جو انہوں نے کیا وہ تھا کہ شام کی نماز ادا کی۔

برفوق پا کی واپسی

میجر نوری کی امامت میں نماز ادا کرنے کے بعد کیپٹن تنویر نے موم بتیاں جلائیں اور غار کو منور کیا۔ ابراہیم نے مٹی کے تیل کا چولہا جلایا اور برف سے پانی تیار کرنے لگا تاکہ پلاؤ پکا سکے۔ کیپٹن شامی غار کے منہ میں پستول لے کر بیٹھ گیا کہ اُس کی ڈیوٹی بطور سکیورٹی گارڈ لگا دی گئی تھی۔ کیپٹن امانت تمام ہتھیاروں کو صاف کرنے لگا تاکہ اُن کو رات زنگ نہ لگ جائے۔ خود میجر نوری لداخ کا نقشہ لے کر بیٹھ گیا اور پوری توجہ سے اُسے دیکھنے لگا۔ کیپٹن تنویر نے میجر نوری کو نقشہ کے مطالعہ میں محو دیکھا تو اُن کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

''مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کے پاس لدّاخ کا نقشہ ہوگا۔'' کیپٹن تنویر نے نقشہ پر دونوں آنکھیں گاڑھ کر کہا۔

''یہ سامنے پڑا ہے نقشہ۔ یہ لداخ کا ہے۔ لداخ اور بلتستان کے جغرافیائی حالات ایک سے ہیں۔ دونوں پہاڑی علاقے ہیں۔ دونوں برف پوش علاقے ہیں۔ دونوں میں وادیاں ہیں۔ دونوں علاقوں میں ایسے لوگ رہتے ہیں جن کا رہن سہن ایک سا ہے۔ زبان بھی ایک ہے۔ فرق ہے تو یہ کہ لداخ کے اکثر لوگ بدھ مت کے ماننے والے ہیں اور بلتستان میں اللہ کے فضل سے سبھی مسلمان ہیں۔ ہاں ایک بات بھول گیا۔ لداخ میں بھی دو بڑے دریا ہیں۔ دریائے سندھ اور دریائے شیوق اور یہی دریا لداخ کے بعد بلتستان میں بہتے ہیں۔ دریائے سندھ تو لداخ بلتستان، یاغستان، سرحد، پنجاب اور صوبہ سندھ کو بھی سیراب کرتا ہے، اسی لیے اسے شیر دریا کہا جاتا ہے۔ یہ دیکھو لداخ کا صدر مقام لہہ اس کے کنارے پر ہے۔'' میجر نوری عالم آدمی تھا اور اُسے جغرافیہ سے خاص دلچسپی تھی۔

اچانک برفانی چیتے کی خوفناک آواز آئی۔ اُس نے کیپٹن شامی پر حملہ کر دیا تھا۔ پھر گولی چلی اور سبھی غار کے منہ میں دوڑے۔ دیکھا چیتا تڑپ رہا تھا پھر دیکھتے دیکھتے ٹھنڈا ہو گیا۔

''کیا ہوا؟'' میجر نوری نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ چیتے نے حملہ کیا تھا میں نے اُسے مار دیا'' کیپٹن شامی بولا۔

''سر میں کھال اُتار لوں؟'' ابراہیم نے میجر نوری سے پوچھا۔

''صبح اتار لینا'' میجر نوری نے بے دھیانی سے کہا۔

''سر۔ صبح تک تو یہ اکڑ جائے گا۔ کھال اُتارنا مشکل ہوگا۔ ابھی تو گرما گرم ہے۔

ابراہیم پہاڑی لڑکا تھا اور اُس نے شکاریوں کی باتیں سنی ہوئی تھیں۔ اُس کا باپ عبدالخالق چوکیدار خود ایک شکاری تھا اور شکاری کا بیٹا شکاری ہوتا ہے۔

''جاؤ اُتار لو۔'' لیکن وہ پلاؤ کون تیار کرے گا؟'' کیپٹن تنویر بولا، میجر نوری تو مسلسل نقشہ پر دونوں آنکھیں گاڑھ کر منہ میں کچھ پڑھ رہا تھا۔

''دو آدمی آ رہے ہیں اس غار کی طرف۔'' کیپٹن شامی نے عامر کو اندر کی طرف منہ کر کے سازش کے انداز میں کہا۔

''آنے دو'' میجر نوری بولا اور پھر اُسے خیال آیا کہ غیر نہ ہوں غیر سے اُن کی مراد یہ تھی کہ دشمن نہ ہوں۔ چنانچہ اُس نے کیپٹن تنویر سے کہا'' جاؤ جا کر کیپٹن شامی کی مدد کرو۔''

کیپٹن غار کے منہ تک آیا اور آنے والوں کو غور سے دیکھنے لگا۔ دونوں کمبل کو اوڑھے ہوئے تھے اور مزے سے چلے آ رہے تھے۔ کندھے پر گٹھڑیاں تھیں جیسے پورٹر ہوں۔

''یہ تو اپنے آدمی ہیں۔ ایک بروق پا ہے اور دوسرا سلطان۔'' تنویر بولا۔

''بروق پا زندہ ہے میرا خیال تھا اللہ کو پیارا ہو گیا ہو گا۔ اسی غار سے نمونیہ کروا کر گیا تھا۔'' میجر نوری نے کہا لیکن نقشہ پر سے آنکھیں نہ اُٹھائیں۔

ابراہیم نے چاقو برفانی چیتے کے پاس رکھا اور بھاگ کر سلطان اور بروق کے پاس گیا اور پھر وہ تینوں غار میں چلے آئے۔ تینوں ہنس رہے تھے اور بہت خوش تھے۔ میجر نوری نے نقشہ طے کر کے کوٹ کی جیب میں رکھا اور اُن سے گلے ملا۔ ''کیا لائے ہو ہمارے لیے تم دونوں؟'' میجر نے سلطان سے پوچھا۔

''صاحب۔ کچھ کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔ کچھ دوسرا سامان ہے فہرست بھی ساتھ ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ اسی غار میں مل گئے۔ اگر نہ ملتے تو یہ چیزیں اسی غار میں رکھ کر اور چچا بروق پا کو یہیں چھوڑ کر میں آپ سب کی تلاش میں نکلتا۔'' سلطان بولا۔

''آپ کیسے ہیں بروق پا جی؟'' میجر نے لکڑ ہارا سے پوچھا۔

''میں اب ٹھیک ہوں۔ ڈاکٹر کی دوائیوں سے فوراً آرام آ گیا اور پھر میں نے گھر جا کر خوب یخنی پی اور سلاجیت کھائی دودھ کے ساتھ اب تو میں اپنے آپ کو جوان محسوس کرتا ہوں۔'' وہ بولا ''ویری گڈ'' میجر نے کہا اور بروق پا کا کندھا تھپتھپایا۔ وہ اپنا کلہاڑا ساتھ لایا تھا۔ ''اگر آپ اپنے آپ کو جوان سمجھتے ہیں تو پھر لداخ کے سفر کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میجر صاحب نے لداخ کا نقشہ ابھی ابھی طے کر کے رکھا ہے۔'' کیپٹن تنویر نے بروق پا کو چھیڑا۔

''جوان۔ میں اب تیری طرح ہوں۔ طاقت والا، ہمت والا، لکڑ ہارا بس کلہاڑا چلا سکتا ہوں۔ لکڑ ہارا جو ٹھہرا۔'' بروق پا چائے کا کپ پکڑ کر بولا۔ ابراہیم نے جو پانی پلاؤ پکانے کے لیے گرم کیا تھا اُس کی اب چائے تیار کر لی تھی اور سب کو ایک ایک کپ دے رہا تھا۔ باہر سردی شدید تھی اور اندر ذرا کم۔

''چچا بروق پا نے لداخ کو ہر طرح دیکھا ہوا ہے بس یہ سمجھ لو کہ گائیڈ ہے۔ سلطان بولا۔

''خیر یہ بات تو نہیں۔ میں ایک بار گیا تھا لہہ۔ یہ پاکستان بننے سے پہلے کی بات ہے۔ پاکستان بننے کے بعد نہ جا سکا۔ ویسے میں پدم پارٹی میں تھا۔ میں صوبیدار محمد علی کا باورچی تھا۔'' بروق پا نے بتایا۔

''صوبیدار محمد علی کون تھے؟'' میجر نے پوچھا۔

''صوبیدار محمد علی اُن کا کمانڈو تھا۔'' سلطان بولا۔

''پارٹی میں کل کتنے جوان تھے؟'' تنویر نے پوچھا۔

''تیس بتیس جوان تھے۔ یہ جوان گلگت سکاؤٹس کے تھے اور کچھ رضا کار بھی تھے۔'' سلطان نے بتایا۔

''بہت بہادر لوگ تھے۔ ہتھیاروں کے بغیر لڑتے رہے۔ ان کو کوئی نہ ہرا سکا۔'' ابراہیم بول رہا تھا ''ہم سب کو ان پر فخر ہے۔ ایسے بہادر مائیں دوبارہ پیدا نہ کر سکیں گی۔''

''ہم نے سن لیا ابراہیم تھینک یو۔ اب جاؤ اور کھانا تیار کرو۔ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں۔ شور مچا رہے ہیں۔ جاؤ میرے چاند۔'' کیپٹن تنویر نے ابراہیم سے کہا۔

''پلاؤ میں پکاؤں گا۔'' بروق پا بولا ''ہاں ابراہیم میری مدد کرے۔ مجھے مرچ مسالہ دے۔ سلطان تم میجر صاحب کے ساتھ گپ لگاؤ۔''

''میں مسالہ آپ کو دے دیتا ہوں۔ لیکن میں آپ کے پاس نہیں بیٹھوں گا۔ میں چیتے کی کھال اتاروں گا۔'' ابراہیم نے کہا۔

''کیا کوئی چیتا مارا ہے؟'' سلطان جلدی سے بولا۔

''ہاں۔ کیپٹن شامی نے برفانی چیتا ہلاک کیا ہے۔ اُس نے اُس پر حملہ کر دیا تھا۔'' ابراہیم نے بتایا۔

''واہ واہ۔ کیپٹن شامی تو پھر بہادر آدمی ہوا نا۔ کیونکہ بہادر آدمی ہی برفانی چیتے کو مار سکتا ہے۔'' سلطان خوش ہو کر بولا۔ بلتستان میں چیتے کے شکاری کو بہادر انسان تسلیم کیا جاتا ہے۔

''یہ کس نے کہا کہ کیپٹن شامی بہادر نہیں ہے۔ ہم سب بہادر ہیں۔'' ابراہیم نے چہک کر کہا۔

''لاؤ چاقو مجھے دو۔ کھال میں اتاروں گا۔ کھال اتارنے کا خاص ڈھنگ ہے جو صرف

شکاریوں کو آتا ہے۔'' سلطان بولا اور چاقو لے کر اُس کی دھار دیکھنے لگا۔

''میں بھی آپ کے ساتھ بیٹھوں گا اور کھال اتارنے کا ڈھنگ سیکھوں گا۔'' ابراہیم بولا۔

''نہیں آپ چچا بروق پا کے پاس بیٹھیں۔'' سلطان بولا ''باہر سردی بہت ہے۔''

''مجھے سردی کچھ نہیں کہتی''۔ ابراہیم سلطان کے ساتھ غار سے باہر آ گیا۔ اندر بروق پا مرچ مسالہ تلاش کر رہا تھا۔

ایک گھنٹے کے اندر اندر سبھی کام ہو گئے اور وہ کھانا کھا کر لیٹ گئے۔ غار کے منہ میں اب کیپٹن امانت بیٹھا تھا۔ رات بارہ بجے تک اُس کی ڈیوٹی تھی بطور سکیورٹی گارڈ پہرہ پر۔

رات بارہ بجے کیپٹن امانت کی جگہ میجر نوری نے پہریدار کی ڈیوٹی سنبھالی۔ وہ چاہتا تو کسی اور کو حکم دے سکتا تھا لیکن اُس نے یہی بہتر جانا کہ خود سکیورٹی گارڈ بنو۔ پارٹی لیڈر کی حیثیت سے وہ خود مثالی کردار کا مالک تھا اور جو کام دوسرے کر سکتے تھے وہ پہلے کرتا۔ اس طرح سے اپنے ساتھیوں کی محبت کا وہ حقدار بن گیا تھا۔ وہ دلیر اور بہادر بھی تھا اور عقلمند بھی۔ اُس کا سیکنڈ اِن کمانڈو کیپٹن تنویر دلیر بہادر اور موت سے بھڑ جانے والا تھا لیکن اُس میں اتنی عقل نہیں تھی جتنی میجر نوری میں تھی۔ میجر نوری تحمل مزاج تھا لیکن کیپٹن تنویر گرم خون کا مالک تھا۔ شاید عمر کا تقاضا تھا کہ کیپٹن تنویر مشکلوں کی پرواہ کیے بغیر ایکشن کے لیے تیار ہو جاتا تھا۔ ہاں ایک بات تھی تکلیف اُٹھانے میں اور دکھ سہنے میں کیپٹن لاجواب اور لاثانی تھا۔ ابراہیم کا مثالی کردار کیپٹن تنویر تھا نہ کہ میجر نوری۔ میجر تو ابراہیم کو ڈانٹ بھی دیتا تھا جس طرح باپ اپنے بیٹے کو ڈانٹتا ہے لیکن کیپٹن تنویر نے کبھی اُسے نہیں ڈانٹا۔ گویا وہ ابراہیم کو اپنا دوست تصور کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ جو خوبیاں اُس کے اپنے کردار میں ہیں وہی خوبیاں ابراہیم میں پیدا ہوں۔ کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت بھی چوکس، دلیر اور بہادر کمانڈو تھے اور اُن میں دکھ برداشت کرنے کی قوت بہت زیادہ تھی۔ اب اُن میں بروق پا اور سلطان بھی شامل ہو گئے تھے۔

سلطان شکاری تھا اور اُسکی عمر یہی تئیس چوبیس برس تھی۔ وہ پہاڑوں کا پالا ہوا تھا اور پہاڑوں میں گھومنا پھرنا اور شکار کرنا اُس کی زندگی تھی۔ اُس کا جسم لمبا نہیں تھا گٹھا ہوا تھا اور چہرہ گول تھا۔ آنکھیں موٹی موٹی اور چمکدار، مونچھیں بھوری تھیں، ہاتھ بڑے بڑے تھے جیسے کہ شکاریوں کے ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سروس کمپنی کے پرانے اور مضبوط بوٹ پہنتا تھا۔ ایک

خنجر اور لمبا چاقو ہمیشہ اُس کے پاس رہتے تھے۔

بروق پا زیادہ بوڑھا نہیں تھا، شکل سے وہ ادھیڑ عمر کا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ وہ ساری عمر محنت مزدوری کرتا رہا تھا اس لیے اُس کے پٹھے مضبوط کیوں نہ ہوں گے؟ اُس کی سب سے بڑی خوبی اُس کی سادگی اور انکساری تھی۔ وہ ہر کسی کے کام آتا تھا اور ہرگز ہرگز بد دماغ نہ تھا۔ اُس کی دوسری خوبی یہ تھی کہ وہ بہت اچھا خانساماں (کُک) تھا اور ہر قسم کا کھانا تیار کر سکتا تھا۔ اُسے گوشتابہ، رہستہ، شب دیگ، کڑم کا ساگ، حلیم اور پلاؤ پکانے کا خاص ڈھنگ آتا تھا۔ بلتی کھانے پکانے کا تو وہ خاص ماہر تھا۔ اُسے یخنی اور سوپ تیار کرنے کا گُر بھی آتا تھا۔ پدم پارٹی کے ساتھ اُس نے سپاہی کی حیثیت سے کم اور باورچی کی حیثیت سے زیادہ کام کیا تھا۔ بعض اوقات تو اُسے چمچہ چھوڑ کر باورچی خانہ سے باہر آنا پڑتا تھا تاکہ حملہ آور بھارتی فوجیوں کا چاقو یا چھری سے مقابلہ کرے لیکن اُس کے ساتھیوں نے اُسے کبھی اس کا موقع نہ دیا۔ کیونکہ وہ لڑنے مرنے میں حملہ آور بھارتی فوجیوں سے کہیں زیادہ آگے تھے۔ اب بروق پا کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ برفانی انسانوں کی زبان جانتا تھا اور اُن سے اُن کی زبان میں گفتگو کر سکتا تھا۔

موم بتی، دیسی تیل کے دیے اور مٹی کے تیل کی لالٹین کی روشنی میں میجر نوری نے اپنے ساتھیوں کو دیکھا تو اُس کا سر فخر سے بلند ہو گیا۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ابراہیم کا منہ چوم لے کیونکہ اُسے پندرہ سولہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک برفانی غار کے منہ میں بیٹھے اپنا بیٹا یاد آ گیا تھا جو دور لاہور کے ایک سکول میں پڑھتا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کے کانوں میں برف گرنے کا شور بلند ہونے لگا۔ اُس نے باہر دیکھا ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا لیکن یہ اندھیرا میدانوں کا اندھیرا نہ تھا۔ یہ برف پوش پہاڑوں میں بسنے والا اندھیرا تھا جس میں برف کی سفیدی رچی ہوئی تھی۔ اسے آپ دودھیا اندھیرا کہہ سکتے ہیں۔ وہ غور سے دیکھنے لگا۔

برف گرنے اور پھیلنے اور چلنے کا شور تیز ہو رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا آوالانچ آ رہا ہے۔

آوالانچ کیسے آتا ہے؟ لاکھوں من برف پہاڑ پر یا پہاڑ کی چوٹی پر یا پہاڑ کی کگر پر یا پہاڑ کے کسی حصے پر جمی ہوتی ہے۔ اس جمی ہوئی برف پر اور برف پڑتی رہتی ہے۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ برف بہت زیادہ ہو جاتی ہے اور لٹکنے لگتی ہے۔ بعض اوقات یہ برف گلیشیر کے کونے پر ایک

دم اکٹھی ہو جاتی ہے۔ ایسے کونے کو گلیشیر کی زبان بھی کہا جاتا ہے۔ کئی بار تو خود گلیشیر لٹک رہے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات برف کے میناروں کی زیادتی ہوتی ہے۔ بعض اوقات آئس فال پر ہزاروں من برف گر پڑتی ہے۔ پھر اتنی زیادہ برف کو سہارا نہیں ملتا۔ اُس کی ٹیک کمزور ہو جاتی ہے اور لاکھوں من برف نیچے ڈھلوان کی طرف چلنے لگتی ہے۔ چلنے سے مراد چال اور یہ چال بہت تیز ہوتی ہے۔ بس قیامت کی چال کہیے۔ آوالانچ کا نام ہی برف کی تیز رفتاری کا نام ہے۔ برف کی رفتار سے ہوا اِدھر اُدھر بھاگتی ہے اور ہوا کا شور اُٹھتا ہے۔ اُس کے ساتھ ساتھ برف کے ریزے اور کرچیاں ہوا میں اُڑنے لگتی ہیں۔ راستہ میں جو چیز آئے یا تباہ ہو جاتی ہے یا ہزاروں من برف میں دب جاتی ہے۔ درخت جڑ سے اُکھڑ جاتے ہیں۔ پتھر برف کے اندر دفن ہو جاتے ہیں۔ گاؤں اور بستی تہس نہس ہو جاتی ہے۔

آوالانچ سے بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی جگہ کیمپ نہ لگایا جائے جہاں آوالانچ آنے کا خطرہ ہو۔ یہ بات آئس فال سے بچنے کے لیے بھی ضروری ہے جو لوگ پہاڑوں میں رہتے ہیں ان کو معلوم ہوتا ہے کہ کس پہاڑ، کس چوٹی یا کس گلیشیر سے آوالانچ شروع ہوسکتا ہے۔ کوہ پیما ٹیموں کے ساتھ جو پیشہ ور گائیڈ کام کرتے ہیں اُن کو بھی معلوم ہوتا ہے کہ آوالانچ سے بچنے کے لیے کون سی جگہ موزوں ہے۔ کئی بار برف کے گرے ہوئے بڑے بڑے تودوں کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جس جگہ کیمپ لگایا جا رہا ہے وہ آوالانچ کی زد میں تو نہیں ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں میں ایسی گائیڈ بکس ملتی ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ فلاں فلاں جگہ خطرناک ہے۔ وہاں آوالانچ آ سکتا ہے یا کون کون سا پہاڑ ایسا ہے جہاں عام طور پر یا موسم کی خرابی کی وجہ سے آوالانچ آ سکتے ہیں اور آتے ہیں۔ پاکستان میں نانگا پربت، کے ٹو اور سیاہ چن گلیشیر کا امیریا، آوالانچوں کے لیے خاصے بدنام ہیں۔

آوالانچ عموماً برف کی کثرت اور وزن میں زیادتی، موسم کی خرابی، سورج کی گرمی اور بم یا گرینیڈ کے دھماکے سے پیدا ہوتے ہیں۔ بچنے کا طریقہ یہ ہے کہ ڈینجر زون سے آپ باہر نکل جائیں۔

آوالانچ کا شور اب بے حد بلند ہوگیا تھا اور برف نالے میں گر رہی تھی۔ وہ جو سوئے ہوئے تھے شور سن کر جاگ اُٹھے۔ اُن کے آنکھیں ملتے ملتے ہزاروں من برف پھسل کر غار

کے منہ کے سامنے ڈھیر کی شکل میں جم گئی اور غار کا منہ بند ہوگیا۔ برف گرنے سے ہوا کا بگولا اُٹھا اور موم بتی، چراغ اور لالٹین بھی بجھ گئے۔ میجر نوری غار کے منہ سے بھاگ کر غار کے درمیان آ گئے۔ غار کے ہر طرف اندھیرا پھیل گیا۔

تحفے

وہ رات ایک بجے سے صبح پانچ بجے تک آوالانچ کا مدہم شور سنتے رہے پھر اُن سب نے مل کر نماز ادا کی اور موم بتی، دیے اور لالٹین کی روشنی میں برف کو ہٹانے لگے۔ برف تازہ گری تھی اس لیے ابھی جمی نہ تھی۔ بروق پا چائے بنا بنا کر دیتا رہا اور میجر نوری، کیپٹن تنویر، شامی، امانت اور سلطان برف پیچھے ہٹاتے رہے۔ ابراہیم بروق پا کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا رہا۔

اصولاً چاہیے تھا وہ گھبرا جاتے لیکن گھبراہٹ کا لفظ اُن کی ڈکشنری میں نہ تھا۔ گھبراہٹ سے کام ختم نہیں ہوتا، بگڑ جاتا ہے۔ پانچ بجے کے قریب وہ برف میں سے غار بنانے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ غار اوپر کی طرف تھا یعنی جہاں برف پہاڑ کے ساتھ ملی تھی اور کھڑی ہوگئی تھی وہاں تک کیپٹن تنویر سب سے پہلے باہر نکلا۔ دودھیا اندھیرا ہر طرف تھا لیکن سورج کی کرنوں کے آثار ابھی ایک گھنٹہ دور تھے۔ نالہ برف سے اٹ چکا تھا اور برف کے تودے اور ڈلے بکھرے پڑے تھے۔

کیپٹن تنویر کے واپس آنے پر دوسرے سب باری باری رسے کی مدد سے اوپر گئے اور چکر لگا کر واپس آئے۔ وہ سب خوش تھے اُن سب کو اللہ تعالیٰ نے موت کے منہ سے بچا لیا ہے۔ سب نے مل کر سجدہ شکر ادا کیا۔

بروق پا اور ابراہیم کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئے اور میجر نوری سلطان کی مدد سے سامان کی لسٹ تیار کرنے لگا۔

۱۔ کھانے میں چائے کی پتی، کافی کے ڈبے (۴) چینی (۵ کلو) ہنٹر بیف (۴ کلو) سلاجیت (ایک کلو) آٹا (دس کلو) چاول (۱۰ کلو) دال ۵ کلو اور دوسرے مسالہ جات شامل تھے۔

۲۔ مٹی کے تیل کی کُپّی

۳۔ دیسی تیل کی کُپّی

۴۔ کپڑے دھونے کا صابن

۵۔ نہانے کا صابن

۶۔ چار چھوٹے تولیے

۷۔ موم بتیاں (ایک درجن)

۸۔ دیا سلائیاں (دو سو ڈبیاں)

۹۔ آکسیجن کی دو بوتلیں اور آکسیجن بیگ (۲ عدد)

۱۰۔ چار بڑے رسے اور چار چھوٹے۔ پہاڑ پر چڑھنے اور اُترنے کے لیے

۱۱۔ ایلومینیم کی ایک سیڑھی جو تہہ ہو جاتی تھی

۱۲۔ پہاڑ میں ٹھونکنے کے لیے جنہیں پٹن کہا جاتا ہے

۱۳۔ بوٹوں کے لیے کریمپ آنز (۸ عدد)

۱۴۔ عام تھیلے چیزیں ڈالنے کے لیے پانچ

۱۵۔ سلیپنگ بیگز (۴ عدد)

۱۶۔ بڑے بوٹ (۲ عدد)

۱۷۔ پیرافین کا سٹوو

۱۸۔ برف پر چلنے کے لیے ریچھ کے پیر یعنی بیرزیا (دس عدد)

۱۹۔ کلہاڑیاں دو عدد (بروق پا کے پاس اپنا کلہاڑا الگ تھا)

۲۰۔ برف کی چکا چوند سے بچنے کے لیے گاگلز (سات عدد)

۲۱۔ نمونیہ کی دوائیاں، طاقت کے کیپسول، مرہم پٹی کا سامان، قینچی، مارفین کے ٹیکے اور سرنجیں وغیرہ۔

۲۲۔ تہہ ہو جانے والی کرسی

۲۳۔ دو ولایتی ریوالور اور اُن کی گولیاں۔ ایک پہاڑی اُڑانے کے لیے

۲۴۔ آوالانچ لانے والے گرینیڈ (۴ عدد)

۲۵۔ برف کی تہہ کے نیچے بہنے والے پانی میں سے مارنے کے لیے دو نیزے

۲۶۔ گلیشیر لالٹین (ایک)

۲۷۔ تھرماس (۲ عدد)

۲۸۔ زخمی کو لپیٹنے یا میت کو رکھنے کے لیے فولڈرل (ایک عدد)

۲۹۔ ۱۹۸۷ء کی دو ڈائریاں (ایک میجر نوری کے لیے اور ایک کیپٹن تنویر کے لیے)

۳۰۔ سکی اِنگ کا سامان چار آدمیوں کے لیے

۳۱۔ پانچ برش۔ دس عدد ٹوتھ پیسٹ کی ٹیوبیں

۳۲۔ شیو کا سامان۔ پانچ افراد کے لیے

۳۳۔ ناخن تراش (۳ عدد)

۳۴۔ کوہ پیمائی کی ایک کتاب، نیشنل جیوگرافک کے پانچ پرانے رسالے جن میں نانگا پربت، کے ٹو، ایورسٹ، کنچن چنگا، راکا پوشی کی مہموں پر مضمون تھے۔ ایک مضمون میں اُس مہم کا بیان تھا جو سر ایڈمنڈ ہلیری فاتح ایورسٹ کی سرکردگی میں برفانی انسان پکڑنے کے لیے روانہ ہوئی اور ناکام رہی۔

۳۵۔ ڈن ہل کے سگریٹوں کی ڈبیاں۔ یہ غیر ضروری تھیں کیونکہ ان میں سے کوئی سگریٹ نوش نہ تھا۔

۳۶۔ سات گرم اِنڈر ویئر اور سات گرم بنیانیں، چار عدد گرم دستانے، سات گرم ٹوپیاں، دس کمر بند، سوئے، سوئیاں اور دھاگے۔

۳۷۔ چوبیس گز لٹھا کفن کے لیے

۳۸۔ زہر کی چھوٹی چھوٹی پانچ عدد شیشیاں (اگر برفانی انسان اذیت دیں اور جس کو اذیت دی جا رہی ہے وہ موت کو ترجیح دے تو شیشی استعمال میں لائے۔

۳۹۔ ایک کمان، دس تیر (درندوں، چرندوں اور پرندوں کے شکار کے لیے)

۴۰۔ نائٹ ویژن گاگلز۔ دس عدد (رات کو دیکھنے کے لیے)

۴۱۔ قرآن کریم

یہ سامان پروفیسر الیگزنڈر نے مائیکل اور گاؤں کے نمبردار (سلطان کے والد) سے مشورہ کے بعد اکٹھا کیا تھا۔ کچھ سامان تو لندن سے آیا تھا اور باقی اسلام آباد، سکردو اور خپلو سے اکٹھا کیا گیا تھا۔ سب سے دلچسپ آئیٹم سلاجیت تھی اور سب سے بابرکت بات قرآن

کریم کے نسخہ کی موجودگی تھی۔

اس سامان کی موجودگی سے میجر نوری اور اُس کے ساتھیوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ کچھ سامان اُن کے پاس پہلے بھی تھا۔ اب اور سامان آ گیا۔ اگر یہ سامان نہ آتا تو اُن کو اپنے اڈے سرمو جانا پڑتا اور پھر کئی دن تک انتظار کا دکھ برداشت کرنا پڑتا۔ واقعی انگریز عقلمند قوم ہے۔ اب میجر نوری کے پاس سب کچھ تھا، ہیرے جواہرات، سونا، کھانے پینے کا سامان، حوصلہ اور سب سے بڑھ کر ایمان کی دولت۔

وہ کُل سات تھے چنانچہ سارا سامان کھانا کھانے کے بعد سات جگہ باندھا گیا۔ ایک کے سوا تمام پٹھو (گٹھڑیاں یا سیک) وزن میں برابر تھے۔ میجر نوری نے اُسے کم بوجھ دیا حالانکہ وہ زیادہ بوجھ اُٹھا سکتا تھا کہ پہاڑی لڑکا تھا اور اُس نے تقاضا بھی کیا تھا۔

رسّے کے ذریعے سارا سامان بڑی غار سے چھوٹی غار میں لایا گیا اور پھر کھڑے آدمیوں نے اوپر کھینچا۔ ایک ایک کر کے سب پٹھو اوپر آ گئے جو ان سات آدمیوں نے آپس میں تقسیم کر لیے۔ یہ آدمی اب ایک نئی مہم کے لیے تیار تھے یہ کون سی مہم تھی اس کا علم صرف میجر نوری کو تھا۔

جب وہ چلے تو کیپٹن تنویر نے میجر نوری سے پوچھا:

''اب کہاں کا ارادہ ہے؟''

''میں تو چاہتا تھا کہ برفانی انسان کی تلاش جاری رکھی جائے۔''

''لیکن؟''

''لیکن یہ ممکن نہیں۔''

''سر، کیوں ممکن نہیں ہے؟''

''وہ اس لیے مائی ڈیر کیپٹن کہ برفانی انسان برف پوش پہاڑوں میں اُس جگہ رہتے ہیں جہاں ہم نہیں رہ سکتے۔

''یہ تو سر سب کو معلوم ہے کہ برفانی انسان برف پوش پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ اگر وہ برف پوش پہاڑوں میں نہ رہتے ہوں تو لوگ ان کو برفانی انسان یا سنو مین کیوں کہیں۔ وہ تو برف کے باسی ہیں اسی لیے برفانی انسان ہیں اگر میدانوں میں رہتے ہوں تو میدانی انسان

کہلائیں گے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں میری جان لیکن ہم وہاں نہیں رہ سکتے جہاں وہ رہتے ہیں کیونکہ ہم برفانی انسان نہیں ہیں میدانی انسان ہیں۔''

''کیوں نہ ہم بھی برفانی انسان بن جائیں۔'' کیپٹن نے سوال کیا۔

''اگر ہم برف میں رہیں گے تو نمونیہ ہو جائے گا اور ہم سردی سے مر جائیں گے۔''

''ہمارے پاس دوائیاں موجود ہیں۔ اگر نمونیہ ہوا تو وہ کھا لیں گے۔''

''اس کے علاوہ ہمارے پھیپھڑوں میں بلندی اور سردی کی وجہ سے پانی بھر جائے گا اور ہم مر جائیں گے۔''

''ہمارے پاس اس مرض کا علاج بھی موجود ہے۔ اس مرض کو اوڈیما کہتے ہیں انگریزی میں۔''

''شکریہ آپ کا۔ ویسے مجھے معلوم ہے اس بیماری کو یعنی پھیپھڑوں میں پانی بھر جانے کی بیماری کو اوڈیما کہتے ہیں۔ اگر اوڈیما نہ ہو تو برف کی وجہ سے ہمارے ہاتھ پیر منہ اور کان جل کر جھڑ جائیں گے یعنی ہم اپاہج اور مفلوج ہو جائیں گے۔''

''میڈیکل سائنس میں اس کا بھی علاج ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن فراسٹ بائیٹ کا یعنی برف کے لڑنے کا علاج برف پوش پہاڑوں میں رہ کر نہیں ہو سکتا۔ میدانی علاقے کے کسی ہسپتال میں رہ کر ہو سکتا ہے۔''

کچھ دیر وہ خاموشی سے چلتے رہے پھر میجر بولا:

''ایک اور بیماری بھی ہے اُس کا ذکر نہیں کیا آپ نے کیپٹن تنویر۔''

''سر، آپ بتا دیں۔ مجھے تو بس برف کے اندھیرے پن کی بیماری یاد ہے۔''

''ہاں، میں تو بھول گیا تھا کہ جب سورج کی کرنیں برف پر پڑتی ہیں تو وہ برف میں جذب نہیں ہو پاتیں یا یوں کہہ لیجیے کہ برف اُن کو جذب نہیں کرتی۔ وہ پلٹ کر انسان کی آنکھوں کو ڈس لیتی ہیں اور یہ مسلسل عمل ایسا موذی ہے کہ انسان اندھا ہو جاتا ہے۔ اس لیے کوہ پیما ان برفانی کرنوں سے بچنے کے لیے خاص قسم کی عینکیں استعمال کرتے ہیں۔''

''پروفیسر الیگزنڈر کا شکریہ کہ اُس نے ہمیں ان برفانی کرنوں سے بچنے کے لیے خاص عینکیں بھجوا دی ہیں۔''

''کیپٹن وہ خاص بیماری جس کا میں ذکر کرنے والا تھا وہ دماغی بیماری ہے۔''

''بتایئے کون سی بیماری ہے وہ؟''

''وہ بیماری یوں شروع ہوتی ہے کہ جوں جوں آپ اوپر جاتے ہیں ہوا میں آکسیجن کی مقدار کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب ہوا میں آکسیجن کم ہوتی ہے تو سانس کے ذریعے دماغ کے کارخانے کو آکسیجن کم ملتی ہے۔ دماغ دراصل کارخانہ ہے جو آکسیجن کی وجہ سے چلتا ہے۔ یہ آکسیجن دماغ میں خون کی وجہ سے پہنچتی ہے یعنی ہمارے خون میں آکسیجن ہوتی ہے جب خون دماغ کی شریانوں میں پہنچاتا ہے تو آکسیجن خود بخود دماغ میں پہنچ جاتی ہے۔ یوں دماغ کے کارخانہ کو ایندھن ملتا ہے۔ اگر یہ ایندھن یعنی آکسیجن نہ ملے تو پھر دماغ کی طاقت کم ہو جاتی ہے۔ وہ ماؤف ہو جاتا ہے۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کم ہو جاتی ہے۔ آدمی اپنے فرائض بھول جاتا ہے۔ کوشش چھوڑ دیتا ہے اور تھکن کی وجہ سے جو غنودگی جسم اور جان پر چھا جاتی ہے وہ نیند میں بدل جاتی ہے۔ پھر یہ نیند ہمیشہ کی نیند ثابت ہوتی ہے یعنی انسان مر جاتا ہے۔''

''کمال کی بات سنائی آپ نے!'' کیپٹن نے حیرانی ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

''ان حالات میں بھلا برفانی انسانوں کا مقابلہ کون کر سکتا ہے۔ آپ ہی بتایئے۔''

''میں کیا بتاؤں سر۔ میں تو حکم کا آدمی ہوں۔ مجھے آپ حکم دیں گے تو برفانی انسان تو کجا میں تو ان پہاڑوں سے ٹکرا جاؤں گا۔ میری جان تو قوم کی امانت ہے۔ میں تو اسلام کا سپاہی ہوں۔''

''شاباش۔ اب یہ میرا کام ہے کہ آپ کو کس سے لڑواتا ہوں۔ ہے نا؟''

''بالکل ٹھیک۔ ویسے اب آپ نے کیا سوچا ہے؟'' کیپٹن تنویر نے میجر سے پوچھا۔

''میں نے سوچا ہے کہ کرنل دھنی رام کا پیچھا کیا جائے اور فی الحال برفانی انسانوں کا پیچھا چھوڑ دیں۔'' میجر نے کہا۔

''ٹھیک ہے سر، کرنل کو بچ کر نہ جانا چاہیے لیکن ہم بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور وہ بہت دُور نکل گیا ہے۔ اُس کے پاس سکی ہے وہ اُس کے ذریعے یہ جا وہ جا۔ کرگل پہنچ گیا ہوگا۔''

کیپٹن۔ میرا نہیں خیال کہ وہ کرگل کی طرف گیا ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ وہ نوبرا ویلی کی طرف گیا ہے۔ کیونکہ کرگل کی نسبت نوبرا ویلی قریب ہے۔''

''وہ کرگل کیوں نہیں گیا ہوگا؟ وہ کرگل سے آیا تھا اور اُسے واپس کرگل جانا تھا وہی اُس

کی چھاؤنی ہے۔''

''اسے کرگل جانے میں کوئی جلدی نہیں۔ یقیناً وہ لمبی چھٹی پر ہے۔ اول تو وہ چھٹی پر نہیں ہے ڈیوٹی پر ہوسکتا ہے۔ ہیرے جواہرات کی تلاش بہانہ بھی ہوسکتی ہے۔ اصل مقصد جاسوسی ہوسکتا ہے۔ وہ ریکی کی غرض سے بھی بلتستان آ سکتا تھا۔ میرا مطلب ہے اُس کے آنے کے کئی امکانات ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ مہم جو آدمی ہے۔''

''سر۔ کیا مہم جو آدمی ہے، اپنے سارے ساتھی مروا چکا ہے'' ہماری قید سے وہ روپ بہروپ بھرنے والے لوگوں کی طرح ڈرامہ رچا کر اور ہمیں دھوکہ دے کر گیا ہے۔''

''ڈرامہ سے اُسکی ذہانت ظاہر ہوتی ہے، احمقانہ پن نہیں۔ ہر وقت بہادری کام نہیں آتی۔ چالاکی اور مکاری بھی کام آتی ہے اور پھر محبت اور جنگ میں سب چلتا ہے۔

''یعنی آپ کا خیال ہے کہ وہ کرگل کے بجائے نوبرا ویلی کی طرف گیا ہے۔''

''میں تو یہی سمجھتا ہوں۔ سیاچن گلیشیر پر ان دنوں جو جنگ جاری ہے۔ اس کا فوجی اور اعصابی مرکز نوبرا ویلی ہے جسے تحصیل نوبرا بھی کہا جاتا ہے۔ انڈیا نوبرا وادی کے ذریعے اپنی فوجی ٹیمیں اوپر بھیجتا ہے سیاچن پر اور دائیں بائیں۔''

''گویا آپ نے طے کیا ہے کہ نوبرا ویلی کی طرف چلیں اور کرنل دھنی رام کو تلاش کریں اور برفانی انسانوں کا خیال چھوڑ دیں۔''

''جی ہاں۔ میں تو اسی لائن پر سوچ رہا ہوں اگر آپ چاہتے ہیں کہ برفانی انسان کو تلاش کرنا ضروری ہے تو میں واپس پلٹنے کے لیے تیار ہوں۔''

''میرا خیال ہے برفانی انسان بھی اب وہاں نہیں ہوں گے جہاں ہم نے اُن کو دیکھا تھا۔ وہ بھی اِدھر اُدھر ہو گئے ہوں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ برفانی انسان کے بجائے انڈین انسان کو تلاش کیا جائے۔''

ٹھیک ہے۔ ویسے ایک بات اور بتا دوں۔ یہ جو آپ کا شوق ہے نا برفانی انسان سے دنگل لڑنے کا، وہ نوبرا ویلی کی طرف جاتے ہوئے بھی پورا ہوسکتا ہے۔ برفانی انسان بلتستان کے علاوہ لداخ، تبت اور چین میں بھی پائے جاتے ہیں بلکہ اُن کا سراغ تو شمالی اور جنوبی امریکہ میں بھی ملا ہے۔''

''ظاہر ہے جہاں پہاڑ ہوں گے وہاں برف بھی ہوگی اور جہاں برف ہوگی وہاں برفانی انسان بھی ہوں گے۔''

اُن کی باتیں ختم ہوگئیں اور وہ خاموشی سے چلتے رہے۔ ایک بجے کے قریب وہ سکیسہ پہنچے۔ وہاں دو گھنٹے آرام کیا۔ کھانا کھایا اور پھر ایک پل کے ٹھیکیدار سے جیپ لے کر شام کو وہ پیون پہنچ گئے جہاں انہوں نے ایک مسجد میں قیام کیا۔

بھیڑیئے حملہ کرتے ہیں

بروق پا اور ابراہیم کھانا پکانے کے لیے تمام چیزیں لے کر ایک گھر میں چلے گئے اور وہاں سے کھانا پکوا کر لے آئے جو سب نے مل کر کھایا۔ عشاء کی نماز گاؤں کے دوسرے لوگوں کے ساتھ ادا کی اور پھر رات کے ایک بجے تک اللہ کی یاد میں مصروف رہے۔

صبح سب سے پہلے میجر اُٹھا۔ اُس نے بروق پا کو جگایا۔ بروق پا نے وضو کے لیے پانی گرم کیا اور پھر سب نے نماز باجماعت ادا کی۔ اس کے بعد ناشتہ کیا اور جو پہاڑی نالہ دریائے شیوق میں گرتا تھا، اس کے کنارے کنارے چل پڑے۔ وہ گاؤں سے دو میل اوپر آ چکے تھے جب سورج کی کرنوں نے اردگرد کے پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں کو گلنار بنا دیا۔

اُن کا رخ اب درہ چھور بٹ کی طرف تھا جو پیون سے پچیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ درہ کی چوکی اور پیون کے درمیان کوئی آبادی نہیں؟ صرف چرواگاہیں پائی جاتی ہیں اور کہیں کہیں چرواہوں کی جھونپڑیاں ہیں جہاں وہ رات کو ٹھہرتے ہیں۔ لیکن یہ موسم بہار اور موسم گرما کی بات ہے۔ سردیوں میں نہ تو چراگاہیں ہوتی ہیں اور نہ ہی چرواہوں کا بسیرا۔ بس کہیں کہیں اُن کی پتھر پل جھونپڑیاں دکھائی دیتی ہیں جن میں سانپ، برفانی چیتے، برفانی بھیڑیئے، برفانی ریچھ یا برفانی انسان قیام کرتے ہیں۔ ہر طرف برف ہی برف، ہر طرف سفیدی، برف کی سفیدی، برف کا جنگل ہر طرف نظر آتا ہے۔ تیز ہوائیں اور تنہائی۔ بدھ مت کے ماننے والوں کا عقیدہ ہے کہ ان خوف ناک پہاڑوں، چٹانوں اور ندی نالوں میں یا دیوی دیوتا رہتے ہیں یا بھوت اور چڑیلیں۔ چنانچہ وہ سال میں ایک بار اُن کو خوش کرنے کے لیے پتھروں کے ٹیلوں پر رنگ برنگی جھنڈیاں چڑھاتے ہیں اور دعائیں مانگتے ہیں۔ البتہ مسلمان ان دیوی دیوتاؤں اور بھوتوں، چڑیلوں کے قائل

نہیں ہیں اور نہ ہی ان کو خوش کرنے کے لیے پتھروں پر چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔

سات میل چلنے کے بعد وہ دو بجے کے قریب نالے کے کنارے بیٹھ گئے اور بروق پا دوپہر کا کھانا تیار کرنے لگا۔ جب کھانا تیار ہوگیا تو سب نے مل کر کھانا شروع کیا۔ وہ کھانا کھا رہے تھے کہ تین عدد برفانی بھیڑیئے چپکے سے نالہ پار کر کے کھانے کی خوشبو پا کر اوپر آ گئے اور انہوں نے اُن پر حملہ کر دیا۔

حملہ آوروں کو سب سے پہلے ابراہیم نے دیکھا اور اُس کے منہ سے نوالہ گر پڑا۔ وہ زور زور سے چلانے لگا۔ دوسروں نے کھانے سے ہاتھ روک لیے۔ کیپٹن تنویر نے دیکھا موسم سرما کے ستائے ہوئے اور بھوک کے مارے ہوئے تین بھیڑیئے منہ کھولے اُن پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ اُس نے ریوالور سے فائر کیا۔ پہلا بھیڑیا تو لڑھک گیا۔ لیکن دوسرا بھیڑیا اور پھر تیسرا بھیڑیا اُس پر چڑھ دوڑے۔ اب ہوا یہ کہ کیپٹن نیچے اور بھیڑیئے اوپر۔ کیپٹن کے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا اور دوسرے میں خنجر۔ وہ ریوالور کے لوہے سے اور خنجر کی دھار سے اُن کا مقابلہ کرنے لگا۔ گولی چلانے کا موقع کہاں تھا۔

اسی دوران میں کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت بھی لڑائی میں کود پڑے اور خالی ہاتھوں اور مکوں سے کام لینے لگے۔ ایک بھیڑیا جو دراصل تیسرا بھیڑیا تھا بھاگ اُٹھا اور ایک کیپٹن تنویر کے خنجر سے میدان میں کام آیا۔

''حد ہوگئی بھئی'' کیپٹن تنویر کپڑے جھاڑتے ہوئے بولا ''اتنے دلیر اور جانباز بھیڑیئے نہ میں نے پہلے دیکھے نہ سُنے۔ بھیڑیئے تو چالاک ہوتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر حملہ کرتے ہیں لیکن یہ تو بہت ڈھیٹ تھے۔ غالباً بہت بھوکے تھے۔''

میجر نوری نے ہنس کر ریوالور پتلون کی پیٹی میں اڑایا اور بولا۔

''معلوم ہوتا ہے تمہارے پرانے یار ہیں جو ملاقات کے لیے تشریف لائے۔''

''جی ہاں۔ پرانے یار۔ وہ تو اب آرام فرما رہے ہیں البتہ ایک بھاگ گیا۔''

کیپٹن تنویر نے کہا اور کپڑے جھاڑ کر پھر کھانا کھانے لگا۔

جب کھانا کھانے کے بعد وہ دوبارہ روانہ ہوئے تو اُن کے سروں پر دس عدد کوے اُڑنے اور چلانے لگے۔

''بلتی میں ان کوؤں کو کیا کہا جاتا ہے؟'' کیپٹن امانت نے بروق پا سے پوچھا۔

''چوگے۔''

''کھاتے کیا ہیں یہ چوگے؟ یہاں تو ہر طرف پتھر ہی پتھر ہیں'' امانت بولا۔

''بس یہ انہی پتھروں میں اپنا رزق تلاش کر لیتے ہیں۔ ویسے یہ زیادہ تر آبادیوں میں رہتے ہیں۔'' بروق پا نے بتایا۔

''سر۔ یہ بتائیے کہ بھیڑیوں نے حملہ کیوں کیا؟'' سلطان نے میجر نوری سے پوچھا: وہ اب تک بھیڑیوں کے حملہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

''سلطان، تم بتاؤ کہ کیوں کیا؟ تم تو شکاری ہو'' میجر نے اُلٹا اُس سے سوال کیا۔

''میرے خیال میں تو صرف یہی بات آتی ہے کہ بھیڑیئے بہت بھوکے تھے اور اُن کو ہنٹر بیف کی خوشبو آ گئی اور ہم چونکہ بیٹھ کر کھا رہے تھے اس لیے وہ ہم سے ذرا نہ ڈرے اور ہم پر حملہ کر دیا۔''

''ہم پر حملہ کیا یا ہنٹر بیف پر؟'' میجر نے پھر سوال کیا۔

''ہاں۔ یہ بات ہے دراصل انہوں نے بیف ہنٹر میرا مطلب ہے ہنٹر بیف پر حملہ کیا تھا۔''

''بالکل درست اور کیپٹن تنویر سمجھا ہم پر حملہ کیا ہے۔''

''سر، آپ کی بات مان لیتا ہوں لیکن اُن کو چاہیے تھا کہ وہ ہنٹر بیف کی دعوت میں شریک ہونے کے لیے دعوتی رقعہ کا انتظار فرماتے۔'' کیپٹن تنویر کی بات پر ابراہیم زور زور سے ہنسنے لگا۔

''میجر صاحب، ابراہیم کو اور بوجھ دیجیے یہ تو بہت ہنس رہا ہے۔'' کیپٹن نے کہا یہ سن کر تو ابراہیم اور زور زور سے ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسنے کی آواز پہاڑوں سے ٹکرا کر گشت کرنے لگی اور گونج دُور دُور تک سنائی دینے لگی۔

سب سے پہلے اُسے سلطان نے دیکھا اور چلایا ''یاک'' وہ نالے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ وہ سب نیچے دیکھنے لگے۔ ایک سیاہ رنگ کا موٹا تازہ یاک کھڑا تھا اور جگالی کر رہا تھا۔

''یہ اکیلا کیوں ہے؟'' سلطان کے منہ سے نکلا۔

''کیوں، اکیلا یاک نہیں ہوسکتا؟'' بروق پا نے سلطان سے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے، کیوں نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ اکیلا کیوں ہے۔ باقی کہاں گئے؟'' سلطان کسی سے نہیں پوچھ رہا تھا۔ خود ہی سوال کر کے حیران ہو رہا تھا۔

''باقی یاک چلے گئے ہوں گے۔ یہ کہیں پیچھے رہ گیا۔ اب سردیوں کا موسم شروع ہو چکا ہے اور لوگ یاک واپس اپنے اپنے دیہات میں لے جا رہے ہیں تاکہ اُن کو اپنے پاس کھلے چھوڑ دیں۔''

''چچا بروق پا، آپ جو بتا رہے ہیں وہ میں جانتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے اس یاک کو پکڑنا چاہیے۔'' کیپٹن شامی بولا۔

''اسے پکڑ کر حلال کرنا چاہیے اور پھر ہنٹر بیف تیار کرنا چاہیے۔'' کیپٹن امانت بولا۔

کیپٹن اپنا پٹھو اُتار کر نیچے رکھ چکا تھا اور اُس میں سے رسہ نکال رہا تھا۔

''کیپٹن تنویر تو اُسے پکڑنے کے لیے تیار ہے۔'' میجر بولا۔

''آؤ سلطان میرے ساتھ۔ ہم دونوں پکڑتے ہیں اسے۔'' کیپٹن تنویر بولا۔

''میں بھی پکڑوں گا۔'' ابراہیم نے اپنا پٹھو نیچے اُتارا۔ اُسے دیکھ کر دوسرے ساتھی بھی پٹھو اُتارنے لگے۔

''یہ یاک گھریلو ہے یا جنگلی؟'' بروق پا نے سلطان سے پوچھا۔

''میرا خیال ہے جنگلی ہے گھریلو یاک نہیں ہے۔'' سلطان بولا۔

''پھر احتیاط سے۔ ایسا نہ ہو سینگ مار کر پیٹ چیر دے۔'' بروق پا نے سلطان سے کہا۔

''جنگلی یا گھریلو، ابھی پتہ چل جائے گا۔'' کیپٹن تنویر نے کہا اور راستہ سے چھلانگ لگا کر نیچے دس فٹ کودا۔ وہ بجری پر پڑا اور بوٹوں اور بجری کے ٹکراؤ سے جو آواز ابھری اُسے سن کر یاک چوکنا ہو گیا۔

سلطان بھی اب نیچے کود گیا۔ اُن دونوں کو دیکھ کر یاک اُن کو گھور گھور کر دیکھنے لگا۔ کیپٹن نے رسے سے پھندا بنایا جس طرح پھانسی کا پھندا ہوتا ہے۔ وہ اُسے دائیں ہاتھ میں پکڑ کر آگے بڑھا اور یاک کے قریب چلا گیا۔ یاک نے اُسے دیکھا اور کھورو مار کر اور سُم زمین پر پٹخ کر کیپٹن کی طرف تیزی سے بڑھا۔ اس کی گردن نیچی تھی اور اس کے دو سینگ سیدھے کیپٹن تنویر کے پیٹ کی طرف تھے۔ ابراہیم نے ڈر کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے اور میجر نے ریوالور

سے فائر کیا لیکن بجلی کی سی تیزی سے کیپٹن نے پھندا یاک کے سینگوں پر پھینکا اور خود رسہ پکڑ کر زور سے زمین پر گرا جیسے چھوٹی چٹان پہاڑ سے گر کر لڑھکتی ہے۔ سلطان نے آگے بڑھ کر یاک کی دُم پکڑ لی۔ لیکن یاک جھٹکا لگا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

''دم چھوڑو۔ رسہ پکڑو۔'' کیپٹن تنویر چلایا اور اُس نے ایک بار پھر جھٹکے سے کھڑے یاک کو زمین پر گرا دیا۔

سلطان نے جلدی سے پتھر اُٹھا کر یاک کے نتھنے پر مارا اور چوٹ کی شدت سے ایک بار جھٹکا مار کر پھر اُٹھا۔

''پتھر چھوڑو۔ رسہ پکڑو'' کیپٹن تنویر پھر چلایا۔ اس بار دونوں نے مل کر رسہ کو جھٹکا دیا اور یاک زمین پر تیسری بار گر پڑا۔ اب کے وہ زمین سے نہ اُٹھا اور لمبے لمبے سانس لینے کے بعد وہ بے بس ہو گیا تھا۔ تنویر نے رسہ سینگوں سے اتار کر اُس کے گلے میں ڈالا اور اُس کی گردن کو تھپتھپانے لگا۔ یاک نے موٹی موٹی آنکھوں سے اُسے دیکھا۔ اب سلطان بھی یاک سے پیار کر رہا تھا۔ یاک تھوڑی دیر لیٹا رہا پھر آہستہ سے اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''کوئی ایسی جگہ دیکھو جہاں سے اسے اوپر چڑھایا جا سکے، راستہ پر کیپٹن نے سلطان سے کہا۔ سلطان نے یاک کا رسہ پکڑا اور نالے کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ یاک اُس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''یہ یاک گھریلو ہے جنگلی نہیں ہے۔ جنگلی یاک تو قابو نہیں آتا۔'' بروق پا نے کہا اور میجر کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت نے اسے پکڑ کر نیچے کیا اور کیپٹن تنویر اس کے ذریعے اوپر آ گیا۔

''یاک آپ کو مار بھی سکتا تھا۔'' ابراہیم نے کہا۔

''میرے چاند زندگی اور موت ساتھ ساتھ چلتی ہے۔''

''اگر اجازت ہو تو میں چائے بناؤں؟ کیپٹن صاحب تھک گئے ہوں گے۔'' بروق پا نے کہا۔

''ضرور چائے بناؤ۔ سلطان معلوم نہیں کب تک یہاں آئے۔ اُسے راستہ ملے یا نہ ملے اوپر چڑھنے کا۔ تم چائے بناؤ۔ انتظار بھی کرتے ہیں اور چائے بھی پیتے ہیں۔'' میجر نے کہا اور ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر سلطان کا انتظار کرنے لگا۔

جب تک چائے تیار ہوئی، سلطان بھی آ گیا۔ یاک اُس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا جیسے

گھریلو یاک ہو۔ سب نے مل کر چائے پی۔ رسے کے ذریعے تمام پٹھو باندھ کر یاک پر رکھے اور چل پڑے۔ یاک کا رسہ کیپٹن تنویر نے پکڑا ہوا تھا اور سلطان اُسے ہانک رہا تھا۔

چراگاہ

اب چلنا آسان تھا۔ بوجھ تو اب یاک کے اوپر لدھا ہوا تھا۔ پہلے تو سردی میں بھی پسینہ آنا شروع ہو گیا تھا۔ چڑھائی ہو اور کندھوں پر بوجھ ہو اور چلنا پڑے تو پسینہ کیوں نہ آئے گا۔

اُن کا راستہ پتھروں کا راستہ تھا۔ اُن کے دائیں اور بائیں پہاڑ تھے اور پہاڑوں کے درمیان وادیاں تھیں جو سنسان اور لق دق تھیں۔ لق دق سے مراد یہ ہے کہ وہ سبز اور شاداب وادیاں نہ تھیں جیسے مری، ایبٹ آباد، مانسہرہ یا بلوچستان کے بعض علاقوں میں دیکھنے میں آتی ہیں۔ وہ بلتستان سے لداخ کی طرف جا رہے تھے۔ بلتستان کو چھوٹا تبت یعنی تبتِ خورد کہا جاتا ہے اور لداخ مغربی تبت مشہور ہے اور تبت کوئی بھی ہو چھوٹا یا بڑا، اصلی یا نقلی، مشرقی یا مغربی، تبت ہی ہوتا ہے اور ہر یاول صرف وہیں نظر آتی ہے جہاں دریا ہو یا کوئی نالہ ہو۔ تبت کی تو جھیلیں بھی نمکین ہوتی ہیں اور اُن کے کنارے درخت نہیں اُگتے۔

شام کے وقت وہ ایک چراگاہ میں پہنچے جس کے ایک کنارے پر ایک ہٹ تھی۔ یہ ہٹ سوئٹزر لینڈ کی نہ تھی کہ سبز لمبے درختوں میں بنائی گئی ہو۔ اس کے چاروں طرف کوئی درخت نہ تھا۔ یہ خالص پتھروں کی بنائی گئی تھی تاکہ چرواہے سارا دن بھیڑیں، بکریاں گائیں اور بیل چرانے کے بعد رات کو تیز ہوا اور برف باری سے بچ سکیں۔ چراگاہ میں گھاس کا ایک بھی ہرا تنکا دکھائی نہ دیتا تھا ہر طرف برف ہی برف تھی۔

سلطان نے اندر داخل ہو کر دیکھا پتھروں کا چولہا بنا ہوا تھا جس میں راکھ سو رہی تھی۔ ایک کونے میں چند سوکھی لکڑیاں تھیں۔

سلطان، بروق پا اور ابراہیم نے ہٹ کو (جسے جھونپڑی یا کوٹھا کہنا چاہیے) صاف کیا اور پھر یاک پر سے سامان اتار کے ہٹ کے اندر رکھا۔ کمبل بچھائے اور میجر نوری، کیپٹن امانت اور کیپٹن شامی کو اندر بلایا۔ کیپٹن تنویر ہٹ کے پیچھے غار نما کھڈ کو دیکھنے کے لیے چلا گیا تھا۔ سب سے پہلے بروق پا نے چائے تیار کی اور وہ سب پینے لگے۔ چراگاہ کے دوسرے سرے کی

طرف نکل گئے۔

رات آٹھ بجے اُن سب نے دال چاول مزے مزے سے کھائے پھر کافی پی اور اس کے بعد اپنے اپنے سلیپنگ بیگ لے کر سو گئے۔ رات بارہ بجے تک کیپٹن امانت پہرے پر تھا۔ ڈیوٹی ہٹ سے باہر نہ تھی ہٹ کے اندر تھی جس کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ڈیوٹی صرف یہ تھی کہ وہ کرنل سیموئل کولٹ کا ایجاد کردہ ریوالور لے کر دروازے کے ساتھ فرش پر بیٹھا جاگ رہا تھا اور اُس کے کان باہر کی آوازوں پر تھے۔ ان آوازوں میں کبھی کبھی یاک کی آواز بھی شامل ہو جاتی تھی شاید وہ تنہائی محسوس کرتا تھا کہ بول اُٹھتا تھا اور اس کی آواز سناٹے میں گونجنے لگتی۔

رات بارہ بجے کے قریب جھونپڑی سے باہر تھپ تھپ کی آوازیں آنے لگیں۔ کیپٹن امانت نے خیال کیا کہ یاک برف میں کھڑا کھڑا تھک گیا ہے اور جگہ بدل رہا ہے اور اُس کے چاروں کُھروں کے نیچے برف ٹوٹ رہی ہے۔ لیکن یہ آوازیں بھدی تھیں جیسے چکی کے پاٹ برف پر چل رہے ہوں۔ اُس نے دروازہ کھول کر باہر دیکھا۔ اُسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

پانچ عدد لمبے موٹے تازہ بال والے انسان یاک کے اردگرد کھڑے تھے اور اُن کے ہاتھوں میں پتھر تھے۔ یقیناً وہ برفانی انسان تھے جو یاک کے ڈکرانے کی آوازیں سن کر اُس طرف آ گئے تھے اور اب پتھروں سے یاک کا شکار کرنے کے لیے اِدھر اُدھر کھڑے تھے۔ اُس کے دیکھتے دیکھتے برفانی انسانوں نے یاک پر پتھر مارے اور پھر اُس پر پل پڑے۔

کیپٹن پہلے تو دم بخود تھا، اب اُس نے ان پر فائر کرنا چاہا تو کسی نے پیچھے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اُس نے پلٹ کر لاشین کی۔

اس کی آواز ہوا کی لہروں پر تیرنے لگی اور پھر پہاڑوں سے ٹکرا کر گونجنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد کیپٹن تنویر برف میں بھاگتا ہوا آیا اور ہٹ کے اندر آ کر کمبل پر بیٹھ گیا۔ وہ بولا۔

''نہایت خوبصورت جگہ ہے۔ برف سے ڈھکا ہوا میدان، چاروں طرف پہاڑ اور نالے، سکون، نہ آدم نہ آدم زاد سوائے ہمارے۔ اگر رات کو بادل نہ آئے تو میں تو سکی اِنگ کروں گا۔

''میں بھی۔'' ابراہیم بول اُٹھا۔

''ہم سب سکی اِنگ کریں گے۔'' میجر نے چائے کا گرما گرم گھونٹ حلق کے نیچے اتارتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو یہ کام نہیں آتا۔'' بروق پا نے اطلاع دی۔

''ایک گھنٹہ میں سیکھ جاؤ گے۔'' سلطان نے کہا۔

''جس طرف جا رہے ہیں اور جس ارادے سے جا رہے ہیں سکی اِنگ جاننا ضروری ہے۔'' میجر نے بتایا۔

''آپ کا حکم ہو گا صاحب تو ضرور سیکھیں گے۔ کیوں نہیں سیکھیں گے۔'' بروق پا بولا اور پھر اُس نے پیالہ الگ رکھ دیا۔

''میں باہر جا کر دیکھتا ہوں یاک کہیں بھاگ نہ جائے۔'' سلطان اُٹھ کر ہٹ سے باہر چلا گیا۔

''کیا پکایا جائے صاحب؟'' بروق پا نے میجر سے پوچھا۔

''دال چاول پکا لو۔'' میجر نے کہا اور کمبل اوڑھ کر کمبل پر لیٹ گیا۔ کیپٹن امانت اور کیپٹن شامی بھی اُس کی دیکھا دیکھی کمبل اوڑھ کر لیٹ گئے۔ کیپٹن تنویر نے اشارہ کیا اور ابراہیم کو لے کر باہر نکل گیا۔ باہر آ کر دیکھا یاک برف کے نیچے سے گھاس چر رہا تھا اور سلطان اُس کے پاس کھڑا اُسے گھاس چرتے دیکھ رہا تھا۔ کیپٹن تنویر اور کیپٹن ابراہیم نے جو گنگ کرتے ہوئے روشنی میں دیکھا۔ میجر نوری کا چہرہ نظر آیا۔ وہ رُک گیا اور حیرت سے میجر نوری کو تکنے لگا۔ اس حیرت میں پریشانی بھی شامل تھی یعنی یہ کہ میجر کیا چاہتا ہے۔

''جاؤ۔ بروق پا کو جگاؤ اور یہاں لاؤ۔''

کیپٹن بروق پا کو جگانے کے لیے چلا گیا۔ میجر نوری نے دیکھا۔ پانچوں برفانی انسانوں نے یاک کو نیچے گرا دیا اور وہ اپنے دانتوں اور ناخنوں سے اُسے چیر پھاڑ رہے ہیں۔ ایک برفانی انسان نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے اُس کے گلے کو دبا رکھا ہے تاکہ آواز باہر نہ آئے۔

بروق پا آ گیا اور بروق پا کے ساتھ سلطان، ابراہیم، کیپٹن تنویر اور کیپٹن شامی بھی اپنے اپنے بستر سے نکل کر جھونپڑی کے دروازہ میں کھڑے ہو گئے۔ وہ سب حیرت زدہ تھے۔ اُن کے سامنے منظر ہی کچھ ایسا تھا۔

یاک اب پرلوک سدھار چکا تھا یعنی مر گیا تھا اور برفانی انسان اُس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا رہے تھے اور ساتھ ساتھ منہ سے عجیب و غریب بھیانک آوازیں بھی نکال رہے تھے۔

یہ آوازیں اُن کے مزید خوشی ظاہر کر رہی تھیں۔ لیکن عام انسانوں کے لیے خوف ناک تھیں۔ ظاہر ہے برفانی انسان عام انسان نہ تھے۔

''ان سے ان کی زبان میں بات کرو۔'' میجر نوری نے بروق پا کے کان میں کہا۔ وہ نہایت گھبرایا ہوا تھا۔ برفانی انسان اتنے قد آور اور پھر یاک کو ہلاک کر کے مزے سے اُس کا کچا گوشت کھا رہے تھے بروق پا کا ڈر جانا قدرتی بات تھی۔

''ڈرو نہیں۔ کوئی بات کرو۔ اگر انہوں نے حملہ کیا تو ہمارے پاس ہتھیار ہیں ہم ان کا مقابلہ کریں گے۔'' میجر نوری نے بروق پا کا حوصلہ بڑھایا لیکن وہ تو کانپ رہا تھا بری طرح۔

''ڈرو نہیں وہ گوشت کھا رہے ہیں۔ تم اپنا حصہ مانگو، مجھے بھی دو، یہ کہو۔''

کیپٹن تنویر نے بروق پا سے کہا۔ لیکن بروق پا فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ فقرہ ادا کرے یا نہ کرے۔ وہ اب بھی ڈر رہا تھا لیکن پہلے سے کم۔

''اچھا یوں کرو مجھے بتا دو کہ مجھے بھی یعنی کوئی چیز مانگنے کو کیا کہتے ہیں۔ برفانی انسانوں کی زبان میں؟'' میجر نوری نے بروق پا سے کہا۔

''چم گن۔'' بروق پا نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''کیپٹن تنویر تم چم گن کہہ کر ان سے اپنا حصہ مانگو'' میجر نوری نے حکم دیا۔ پستول لوڈ تھا کیپٹن تنویر نے اُسے ہاتھ میں پکڑا اور ہٹ سے نکل کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے اور برفانی انسانوں کے درمیان اب چار پانچ گز کا فاصلہ تھا وہ گوشت بھی کھا رہے تھے اور شور بھی مچا رہے تھے۔ کیپٹن تنویر نے پرزور آواز میں نعرہ لگایا، چم گن۔''

برفانی انسان ایک دم چپ ہو گئے جیسے کسی نے اُن کے گلے پر چھری رکھ دی ہو۔ کچا گوشت اُن کے ہاتھوں میں تھا۔ ہاتھ جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ منہ جتنے کھلے تھے اُتنے ہی کھلے رہ گئے۔ چاندنی میں اُن کے لہو رنگ ہاتھ پیر صاف دکھائی دے رہے تھے۔ یہ منظر سب کے لیے وحشت ناک تھا وہ سب دروازہ بند کر کے کھڑے تھے۔ دروازہ کی چھید میں سے وہ صرف کیپٹن تنویر کو دیکھ رہے تھے یا پھر برفانی انسانوں کے خون میں لتھڑے منہ اور ہاتھ کسی حد تک دکھائی دے رہے تھے۔

''چم گن'' کیپٹن تنویر نے برف میں دونوں بوٹ اُچھال کر چھلانگ لگاتے ہوئے پھر

وہی دو لفظ دہرائے۔

برفانی انسان پہلے کی طرح چپ گم تھے۔ اب ان میں حرکت ہوئی اور انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایک سیانے اور بوڑھے برفانی انسان کے منہ سے غراہٹ پیدا ہوئی۔ اُس نے ایک بار پھر اپنے ساتھیوں کو دیکھا اور غرایا۔

اسی اثناء میں ابراہیم میجر کی ٹانگوں میں سے نکل کر اور دروازہ کھول کر کیپٹن تنویر کے برابر کھڑا ہو گیا اور زور سے بولا۔

''چم گن۔''

اب کے برفانی انسانوں نے ایک دوسرے کو جلدی جلدی دیکھا اور پھر وہی سیانا اور بوڑھا برفانی انسان اُٹھا۔ پہلے وہ گھٹنوں کے بل یاک کی لاش پر جھکا ہوا تھا۔ اب کھڑا ہوا، ظاہر ہے وہ دس فٹ لمبا تھا اس لیے قوی ہیکل تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھوں میں گوشت کا لوتھڑا تھا۔ وہ اُسے لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھا اور کیپٹن تنویر کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے گوشت کا لوتھڑا تنویر کی طرف بڑھایا جو تنویر نے دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ کیوں کہ وہ گوشت کا ٹکڑا خاصا وزنی تھا۔ اس دوران میں ابراہیم ایک فٹ پیچھے کھسک گیا ڈر سے۔

برفانی انسان کیپٹن تنویر کو گوشت کا لوتھڑا دے کر پلٹا اور اپنے دوسرے چار ساتھیوں کے پاس جا کر غرایا اور پھر اُس نے ایک لفظ کہا جس کا مطلب تھا ''کھاؤ۔''

کیپٹن تنویر پر وہ پل ایک صدی کی طرح گذرا۔ وہ لوتھڑا لے کر پلٹا۔ اُس نے ابراہیم کو ہٹ کے اندر دھکیلا اور پھر خود داخل ہوا۔ اس کے بعد اُس نے دس کلو گوشت فرش پر رکھا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ میجر آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھا اور اُسے اپنی بانہوں میں بھینچ لیا۔

میجر نے محسوس کیا کہ کیپٹن تنویر پسینہ میں بھیگ چکا تھا۔

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' کیپٹن تنویر کے منہ سے یہ فقرہ نکلا تو اُس کا تنا ہوا جسم ذرا نرم ہو گیا۔ ''تو نے مجھے توفیق دی کہ میں اپنا فرض پورا کر سکوں۔''

''آپ مر بھی سکتے تھے۔'' ابراہیم نے کہا۔

''ہاں۔ ایسے کاموں میں ایسا ہوتا ہے مگر تم کیوں آگے ہوئے تھے میرے پاس میرے چاند۔''

میں بھی آپ کے ساتھ ہی مرنا چاہتا تھا،'' ابراہیم نے کہا۔

''اللہ آپ کو زندگی دے۔'' تنویر نے کہا اور پھر بروق پا سے بولا۔

''باہر جاؤ اپنے رشتہ داروں کے پاس اور اُن سے اُن کی زبان میں باتیں کرو۔''

بھلا بروق پا کیونکر برفانی انسانوں کے پاس جاتا۔ کیپٹن تنویر نے اُسے پکڑ کر کندھے پر ڈالا اور ہٹ سے باہر نکل گیا۔ لیکن وہ اُسے لے کر برفانی انسانوں کے پاس نہ گیا، ہٹ کے باہر کھڑا ہو کر پہرہ دینے لگا۔ اجازت لے کر ابراہیم بھی اُن کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

نیند

برف باری کے آثار تو شام سے ہی تھے اور اب تو شام رات میں ڈھل گئی تھی۔ برفانی انسان معلوم نہیں کب سے بھوکے تھے۔ وہ یاک کا گوشت نوچ نوچ کر مزے مزے سے کھا رہے تھے۔ البتہ اب اُن کے ہاتھ اور منہ اتنی تیزی سے نہیں چلتے تھے جس تیزی سے پہلے چل رہے تھے۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ اگرچہ بروق پا پچاس برس کے پیٹے میں تھا لیکن لکڑ ہارا تھا اور سلاجیت باقاعدگی سے کھا رہا تھا اس لیے کیپٹن تنویر کے ساتھ کھڑا تھا۔ ابراہیم تو بچہ تھا اور بچوں اور لڑکوں کو تکان ذرا کم ستاتی ہے۔ رہا کیپٹن تنویر تو اس کے بارے میں یہی کہنا کافی ہے کہ وہ کماؤ تھا اور کماؤ تو دو تین دن کھائے پیئے بغیر ہر موسم میں کھڑے رہ سکتے ہیں یا ڈیوٹی دے سکتے ہیں۔

''یاک تو گیا اب بوجھ کون اٹھائے گا؟'' بروق پا نے آہستہ سے کہا۔

''برفانی انسان ذمہ دار ہیں یاک کی موت کے۔ اب اُن کو ہی بوجھ اٹھانا چاہیے۔'' ابراہیم بولا۔

''تم نے بات تو ٹھیک کی ہے ابراہیم۔'' بروق پا بولا۔

''ایسا نہ ہو وہ ہمارا بوجھ اٹھانے کے بجائے ہم کو ہی کھا جائیں۔'' ابراہیم نے ڈر کر کہا۔

''یہ بھی ہو سکتا ہے۔'' بروق پا بھی گھبرا کر بولا۔

''کیوں ڈراتے ہو بچے کو بڑے میاں۔ اگر برفانی انسانوں نے کھانا ہوتا ہمیں تو کبھی

کے کھا چکے ہوتے۔ یاک کافی ہے اُن کے لیے'' کیپٹن تنویر نے ابراہیم کا حوصلہ بڑھایا۔

''نہ۔ کوئی پتہ نہیں ان کا، جنگلی انسان ہیں میرا مطلب ہے برفانی انسان ہیں۔'' بروق پا نے درست کہا تھا لیکن کیپٹن نہیں چاہتا تھا کہ ابراہیم اُس کی باتوں کو سن کر ڈر جائے۔

جنگلی انسان ہوں یا برفانی انسان۔ اُن کو یاک کا گوشت وافر مقدار میں مل گیا ہے۔ اب وہ ہم کو کیوں کھائیں گے اور اگر کھانے کے لیے آئیں گے تو ہم اُن کا جسم ریوالور سے چھلنی کر دیں گے۔ کیپٹن نے جوش سے کہا۔

''ہمارے پاس گولیوں کے علاوہ گرینیڈ بھی تو ہیں۔'' ابراہیم دلیری سے چہک کر بولا۔

''ویسے تو ہمارے پاس بارود بھی ہے۔'' بروق پا بولا۔

''اس کے باوجود تم ڈر رہے ہو۔'' کیپٹن نے بروق پا کو ڈانٹ پلائی۔

''میں نے ویسے بات کی تھی۔'' بروق پا کھسیانا ہو کر بولا۔

''تم اب ان سے کہو پیٹ بھر چکا اب سو جاؤ یعنی آرام کرو۔'' کیپٹن نے بروق پا کو ہدایت کی۔ بروق پا کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔

''پیٹ بھر چکا کے لیے ان کے پاس کوئی لفظ نہیں ہے کیونکہ ان کا پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ یہ ہر وقت اپنی خوراک تلاش کرتے رہتے ہیں اگر شکار نہ ملے تو گھاس پات کھا لیتے ہیں۔ وہ نہ ملے تو برف چاٹ کر گذارہ کرتے ہیں۔''

''اگر یہ بات ہے تو ان سے کہو کہ یہ اب سو جائیں۔ سونے کے لیے تو ان کے پاس کوئی لفظ ہو گا نا۔'' کیپٹن نے غصے میں آ کر بروق پا سے کہا۔

''ہاں سونے کے لیے ان کے پاس لفظ ہے 'اکھ مٹ'۔ اس کا مطلب ہے کہ آنکھیں موند لو یا آنکھیں بند کر لو۔'' بروق پا نے بتایا۔

''تو کہو ان سے اکھ مٹ۔'' کیپٹن بولا۔

''لیکن مصیبت یہ ہے کہ کہنے والے کو مثال پیش کرنا ہو گی یعنی خود اُن کے پاس لیٹ کر سونا ہو گا۔'' بروق پا بولا۔ اُس کی آواز میں کپکپی تھی۔

''تو سو جاؤ اُن کے پاس۔ میرا کمبل بھی لے جاؤ۔'' کیپٹن نے اپنا کمبل اُس کی طرف بڑھایا۔

''بہتر یہ رہے گا کہ تایا برفوق یا بوڑھے برفانی انسان کے لمبے لمبے بالوں میں چھپ کر سو جائے۔ ذرا سردی نہیں لگے گی۔'' ابراہیم نے مشورہ دیا۔

''میں احمق نہیں ہوں۔'' برفوق پا بولا اور سوچنے لگا۔

''ہم یوں کرتے ہیں کہ تینوں مل کر 'اکھ مٹ' کہتے ہیں اور پھر فرش پر اسی جگہ لیٹ جاتے ہیں ہمیں دیکھ کر بھی وہ لیٹ جائیں گے۔'' ابراہیم نے مشورہ دیا۔

''اچھا مشورہ ہے۔'' کیپٹن تنویر بولا۔ ہم تینوں تین بار 'اکھ مٹ اکھ مٹ' کہیں گے۔ اس کے بعد یہیں لیٹ جائیں گے۔ ٹھیک ہے۔ تنویر نے کہا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔'' ابراہیم بولا۔ اُس کی آواز میں خوشی تھی جیسے وہ کوئی تجربہ کر رہا ہو۔

''جاؤ اندر سے تین کمبل اور لے آؤ۔'' کیپٹن نے برفوق پا سے کہا وہ اندر ہٹ میں کمبل لانے کے لیے چلا گیا اور تھوڑی دیر بعد تین کمبل اُٹھا لایا۔ کیپٹن تنویر نے دیکھا۔ میجر نوری، کیپٹن شامی، کیپٹن امانت اور سلطان ہٹ کے دروازہ میں کھڑے ہیں۔

کیپٹن تنویر کے اشارہ پر وہ تینوں پکارنے لگے اکھ مٹ، اکھ مٹ، اور پھر تینوں کمبل نیچے پھینک کر لیٹ گئے اور اُوپر کمبل لے لیے۔ میجر نوری نے دیکھا برفانی انسان بھی ان کو دیکھ کر اپنی اپنی جگہ پر لیٹ گئے ہیں۔

فرار

آدھ گھنٹے بعد برفانی انسانوں کے خراٹے صاف سنائی دے رہے تھے۔ بھلا میجر نوری اور دوسرے ساتھی کیوں کر سو سکتے تھے۔ برفوق پا کا تو برا حال تھا اُسے تو اتنی سردی میں پسینے آ رہے تھے کہ برفانی انسان ابھی آئے اور انہوں نے اُس کا گلا دبایا۔ ابراہیم کو بھلا کیسے نیند آ سکتی تھی۔ وہ میجر نوری کا پستول پکڑے ہوئے گولی چلانے کے لیے ہر دم تیار تھا۔ کیپٹن تنویر تو تھا ہی برفانی انسانوں سے مقابلہ کی ڈیوٹی پر۔ بھلا وہ کیسے سو سکتا تھا۔

اب برف باری شروع ہو گئی۔ برف کے نرم نرم گالے گرنے لگے۔ برفانی انسانوں پر بھی۔ کیپٹن برفانی انسانوں کے خراٹوں کی آوازیں لگاتار سن رہا تھا۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

''اٹھو اور جھونپڑی کے اندر چلو۔''

وہ تینوں اُٹھے انہوں نے اپنے کمبل گھسیٹے اور جھونپڑی کے اندر آ گئے۔ جھونپڑی کے

دروازہ کو ٹھیک طرح سے بند کیا اور لالٹین کی روشنی میں بیٹھ گئے۔

''وہ سب مزے سے سوئے ہوئے ہیں اور برف کا ان پر ذرا بھی اثر نہیں۔'' کیپٹن تنویر بولا۔

''وہ برفانی انسان ہیں۔ برف اُن کا کیا بگاڑے گی؟'' میجر بولا۔

''برف میں سونا اُن کو بھلا لگا ہے۔ وہ منوں برف کے نیچے سو سکتے ہیں۔'' برفوق پا بولا۔

اگر اجازت ہو تو میں، کیپٹن امانت، کیپٹن شامی اور ابراہیم ان کو ختم کر دیں۔ گولی چلا کر۔'' کیپٹن تنویر نے میجر سے پوچھا۔

''گولی تو میں بھی چلا سکتا ہوں۔ گولی چلانا ہمارے لیے بہت آسان ہے۔ لیکن ہم گولی کیوں چلائیں۔''

''ہاں۔ کیوں چلائیں اُن پر گولی۔ انہوں نے ہمارا کیا بگاڑا ہے؟'' برفوق پا بولا۔

''ایک بات طے ہے کہ برفوق پا کو اُن کی زبان آتی ہے اور وہ اپنی زبان کے لفظ ہمارے منہ سے سُن کر اُن پر عمل کرتے ہیں۔ یہ دوبار ہوا ہے۔'' میجر بولا۔

''سر! آپ چاہتے کہ ہم برفوق پا کے ذریعہ برفانی انسانوں سے دوستی پیدا کریں۔ ہے نا۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔

''ہاں میرا ذہن کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔'' میجر نوری نے آہستہ سے کہا۔

''سر، ہم برفانی انسانوں سے دوستی کے لیے درہ چھور بٹ میں نہیں آئے۔ ہم تو کرنل دھنی رام کی تلاش میں ادھر آئے ہیں۔ آپ نے حکم دیا تھا کہ اگر دھنی رام مل گیا تو ٹھیک، نہیں تو نو برا وادی میں انڈین آرمی کے ٹھکانوں کو نشانہ بنائیں گے۔'' کیپٹن تنویر بولا۔

''اگر ہم کرنل دھنی رام کی تلاش اور نو برا وادی میں انڈین آرمی کی چھاؤنی کو تباہ کرنے میں برفانی انسانوں سے کام لے سکیں تو کیسا رہے گا۔'' میجر بولا۔

''سبحان اللہ۔ اور کیا چاہیے۔ اگر برفانی انسان ہمارا ساتھ دیں لیکن وہ کیوں کر ساتھ دیں گے ہمارا؟'' کیپٹن تنویر بولا۔

''برفوق پا اُن سے بات چیت کرے۔'' سلطان بولا۔

''یعنی برفانی انسانوں کو برفوق پا ہدایت دے اور وہ اس ہدایت پر عمل کریں اور یوں وہ ہمارے مشن میں شامل ہو جائیں۔ یہی چاہتے ہو نہ سلطان تم؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

''ہاں! میں کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔'' وہ سوچ سوچ کر بولا۔

''بروق پا سے پوچھ لو۔ وہ اُن کو کنٹرول کرے گا؟'' تنویر نے بروق پا کی طرف دیکھا۔

''توبہ کرو جی۔ میری تو جان جاتی ہے اُن کو دیکھ کر۔'' بروق پا گھبرا کر بولا۔

''شاید کبھی وہ وقت آ جائے جب عام انسان اور برفانی انسان دوست بن جائیں فی الحال تو مشکل ہے۔'' میجر نوری افسردہ لہجہ میں بولا۔

''سر، فی الحال تو دو کام ہو سکتے ہیں۔ پہلا یہ کہ ان برفانی انسانوں کو ختم کر دیں اور دوسرا یہ کہ ہم ان کو کچھ نہ کہیں اور ان سے دُور چلے جائیں۔'' کیپٹن تنویر بولا۔

''بہتر یہ ہے کہ ہم ان کو نقصان نہ پہنچائیں اور ان کی دست برد سے دور ہو جائیں۔'' میجر نوری بولا۔

''اگر آپ کا یہی حکم ہے تو ہمیں ابھی روانہ ہو جانا چاہیے۔ برف باری ہو رہی ہے۔ برف باری کے دوران میں سردی نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ برف باری کے دوران میں روشنی ہوتی ہے۔ ہمیں ابھی روانہ ہو جانا چاہیے۔'' کیپٹن تنویر نے مشورہ دیا۔

''مجھے آپ کے مشورے سے اتفاق ہے۔ چلنے کی تیاری کی جائے۔'' میجر نے کہا اور فرش پر سے اپنا کمبل لپیٹنے لگا۔

''یہ فرار کا راستہ ہے۔'' کیپٹن امانت نے کہا۔

''نہیں یہ عقل اور بردباری کا راستہ ہے۔'' کیپٹن شامی بولا۔

''کیپٹن شامی نے ٹھیک کہا ہے کہ یہ فرار عقل کا تقاضا ہے۔ ہمیں آگے بڑھنا چاہیے۔ برفانی انسانوں سے اُلجھنے سے ہمارا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔'' کیپٹن تنویر نے اپنا پیک تیار کرتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ بہتر نہیں کہ تایا جان بروق پا کو اُس کے رشتہ داروں کے پاس چھوڑ جائیں۔'' ابراہیم نے کیپٹن تنویر سے کہا۔

''چپ، بزرگوں کو مذاق نہیں کرتے۔ اگر آج بروق پا نہ ہوتا تو برفانی انسان ہمیں کھا چکے ہوتے۔'' تنویر نے کہا۔

''یا وہ ہمارے ہاتھوں سے مر چکے ہوتے۔'' ابراہیم بولا۔

میجر تیار ہو چکا تھا اور انتظار کر رہا تھا کہ سب تیار ہو جائیں۔

تھوڑی ہی دیر میں وہ سب تیار تھے۔ میجر نے لالٹین کی روشنی میں کمپاس دیکھا اور ہٹ سے نکل کر دبے پاؤں برف پر چلنے لگا۔ بروق پا سلطان، ابراہیم، شامی اور امانت اُس کے پیچھے تھے۔ آخری سرے پر کیپٹن تنویر تھا۔

چاندنی سی چھٹکی ہوئی تھی جو چاند کی وجہ سے نہیں، برف کی وجہ سے تھی اور ہلکی ہلکی برف باری ہو رہی تھی۔

رات کا سفر

برف کی دو قسمیں ہیں، جمی ہوئی برف کو انگریزی میں آئس کہتے ہیں اور تازہ بھربھری برف کو سنو کہا جاتا ہے۔ پتھریلے راستہ پر تازہ برف گر رہی تھی جو پاؤڈر کی طرح تھی۔ اگر زمین پر تازہ بھربھری برف گری ہوئی ہو تو اس پر تیزی سے چلنا محال ہو جاتا ہے۔ ایسی برف خشک ہوتی ہے، چمکیلی ہوتی ہے دانہ دار ہوتی ہے اور یوں ہوتی ہے جیسے سفوف ہو۔ اس میں مضبوطی نہیں ہوتی۔ یہ پتھریلے راستہ پر پڑے تو روڑے کنکریوں کے ساتھ ٹھیک طرح سے چمٹتی نہیں ہے۔ اگر برف زیادہ ہو تو اس پر پیر رکھنے سے پیر برف میں دھنس جاتے ہیں اور رفتار کم ہو جاتی ہے۔

چراگاہ ختم ہوئی اور وہ نالے اور پہاڑ کے درمیان کچے راستے پر چلنے لگے۔ پہاڑ کے سائے کی وجہ سے راستہ ذرا تاریک ہو گیا تھا لیکن میجر کے پاس لالٹین تھی۔ ہوا بند تھی اس لیے لالٹین کی روشنی میں کوئی گڑبڑ نہ تھی۔ راستہ آہستہ آہستہ اُوپر جا رہا تھا۔ ایک بار ابراہیم پتھر سے ٹھوکر کھا کر گرتے گرتے بچا۔ ہر طرف خاموشی تھی البتہ کبھی کبھی نالہ کی طرف سے برفانی اُلو کی آواز آتی تھی جو سناٹے کو چیرتی ہوئی نکل جاتی۔

وہ سب ایک ہی رفتار سے چلے جا رہے تھے اور اب دو گھنٹے چلنے کے بعد اُن کو پسینہ آ رہا تھا۔ انہوں نے پانچ میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ کیپٹن تنویر نے دیکھا کہ پانچ بھیڑیے اُن کے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں۔ وہ کب اُن کے پیچھے لگے اُسے معلوم نہ ہوا۔ غالباً انہوں نے انسانی جسم کی بُو سونگھ لی ہوگی جو پسینہ کی وجہ سے پھیل جاتی ہے۔ وہ کبھی تیزی سے رات کے مسافروں کی طرف بڑھتے اور پھر رُک جاتے۔ جب ذرا فاصلہ بڑھتا تو پھر تیزی سے چل کر

قریب آ جاتے۔

کیپٹن تنویر نے اپنے ساتھیوں کو بتا دیا تھا کہ پانچ بھیڑیئے اُن کا پیچھا کر رہے ہیں اور اگر انہوں نے کسی جگہ قیام کیا تو وہ یقیناً حملہ کریں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ساری رات چلتے رہے اور جب صبح ہوئی تو وہ درہ چھوربٹ کی چوکی پر تھے جو بیون سے پچپن میل کے فاصلہ پر ہے۔

اس چوکی کی اونچائی ۱۸ ہزار فٹ تھی۔ انہوں نے درہ کی چوکی یعنی جھونپڑی میں سامان رکھا اور کمبل بچھا کر اپنے اپنے بیگ میں دھنس کر سو گئے۔ صرف کیپٹن تنویر اور ابراہیم نے تیمّم کیا اور فجر کی نماز پڑھی۔ اس کے بعد سلیپنگ بیگ کھول کر اُن میں گھس گئے۔

بھیڑیئے راستہ میں پلٹ گئے تھے۔ غالباً انہیں یقین ہو گیا تھا کہ وہ شکار میں کامیاب نہ ہوں گے۔

دوپہر بارہ بجے سب سے پہلے بروق پا کی آنکھ کھلی اور اُس نے سب کے لیے کھانا تیار کیا۔ نیند پوری ہو گئی تھی اور سونے سے تھکاوٹ بھی دور ہو چکی تھی۔ اُن سب نے مل کر کھانا کھایا اور پھر لداخ کے نقشہ کے اردگرد ہو کر بیٹھ گئے۔

نقشہ

یہ ایک میلا کچیلا نقشہ تھا جو میجر نوری نے کشمیر، لداخ اور سکردو (بلتستان) کی ٹورسٹ گائیڈ سے پھاڑ کر اپنے بٹوہ میں رکھا ہوا تھا۔ گائیڈ جس سے نقشہ لیا گیا تھا سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور کے پریس میں ۱۹۳۳ء میں چھپی تھی اور اُسے ڈاکٹر میجر آرتھر نیو نے لکھا تھا۔ اُس وقت گائیڈ کی قیمت ساڑھے تین روپے تھی اور یہ گائیڈ کا پندرہواں ایڈیشن تھا یعنی ۱۹۳۳ء سے پہلے ٹورسٹ گائیڈ چودہ بار چھپ چکی تھی۔

''سر نقشہ تو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ کا دکھائی دیتا ہے۔'' کیپٹن شامی نے کہا۔

''ہاں، بہت پرانی ہے۔ لیکن ہے بہت عمدہ۔ ڈاکٹر میجر آرتھر نیو سرجن تھا اور اُس نے ان علاقوں میں گھوم پھر کر سروے کیا تھا۔''

''آپ پرانی چیزوں کو بہت پسند کرتے ہیں۔'' کیپٹن شامی نے بات جاری رکھی۔

''میں تاریخ کا طالب علم ہوں اور تاریخی چیزیں مجھے واقعی پسند ہیں۔'' میجر نوری فخر سے بولا۔

''سر، کہیں یہ نقشہ ہمیں نوبرا ویلی کے بجائے چترال یا ہنزہ کی طرف نہ لے جائے۔'' کیپٹن امانت مسکرا کر بولا۔

''نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ اس نقشہ کو تیار کرنے والا ایک تو انگریز تھا۔ دوسرے وہ میجر تھا اور تیسرے ڈاکٹر تھا۔''

''اور پھر اُس نے خود سروے کیا تھا۔'' کیپٹن شامی نے لقمہ دیا۔

''ہاں یہ بات بھی ہے۔ اٹکل پچو نہیں لکھا تھا یہ نقشہ'' میجر بولا۔

تو دکھایئے کیا لکھا ہے ڈاکٹر میجر آرتھر نیو نے۔'' کیپٹن شامی نے درخواست کی۔ میجر نوری نقشہ پر لکھے ہوئے نوٹ کر پڑھ کر سنانے لگا۔

''جو معلومات آپ پڑھ کر سنا رہے ہیں وہ تو ہم کئی بار آپ سے پہلے بھی سن چکے ہیں۔'' کیپٹن امانت نے آہستہ سے کہا۔

''بھلا بتاؤ تو، کیا معلومات ہیں وہ؟'' میجر صاحب نے عینک میں سے گھور کر دیکھا۔ لیکن غصے سے نہیں خوشی سے۔

''سر، آپ نے بتایا کہ نوبرا ویلی دو تین میل چوڑی ہے اور کافی لمبی ہے اور اُس کے مشرق اور شمال میں اونچی اونچی چوٹیاں ہیں۔''

''شاباش کیپٹن امانت۔ اونچے اونچے پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیاں ہیں جن پر سارا سال برف جمی رہتی ہے۔''

آپ نے یہ بھی بتایا سر کہ نوبرا ویلی دراصل لداخ کی ایک تحصیل ہے اور یہاں ہر چیز ملتی ہے اور ہر قسم کا شکار ملتا ہے۔ خاص طور پر پہاڑی بکرے جو سانپ کھاتے ہیں۔

''اور مارخور کہلاتے ہیں۔ ٹھیک، آگے چلو'

''اور سر آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ نوبرا ویلی اب ایک چھاؤنی بن چکی ہے جہاں سے انڈین آرمی کے سپاہی اور افسر سیاچن گلیشیر کی طرف جاتے اور بھجوائے جاتے ہیں۔''

''شاباش کیپٹن امانت۔ خاصا حافظہ ہے تمہارا۔ سیاچن پر پاکستان اور انڈیا کے درمیان

جو جنگ گزشتہ پانچ چھ سال سے چھڑی ہوئی ہے اُسے جاری رکھنے کے لیے انڈیا نے نوبرا ویلی سے بہت مدد لی ہے۔''

میجر ایک بار پھر نقشہ پر جھک گیا اور پڑھنے والی عینک کے شیشوں میں سے نقشہ کو گھورنے لگا۔

''سر آپ نے یہ بھی ایک بار باتوں باتوں میں بتایا تھا کہ درہ چھور بٹ کے بعد پہاڑوں کا جو سلسلہ شروع ہوتا ہے اُسے لداخ کے پہاڑوں کا سلسلہ کہا جاتا ہے اور اسی سلسلہ میں ایک اور سلسلہ ہے جو ساسر کے پہاڑوں کا سلسلہ کہلاتا ہے اور ساسر کے پہاڑوں کے سلسلہ میں تین چوٹیاں ایسی ہیں جن کی اونچائی یعنی بلندی چوبیس ہزار فٹ سے لے کر پچپن ہزار فٹ تک ہے اور ہمیں سب سے بڑی چوٹی کو سر کرنے کے لیے اُس طرف سے حملہ آور ہونا چاہیے جس طرف یارقند کو رستہ جاتا ہے۔ یعنی یارقند کی طرف سے آنے والے رستہ کی طرف سے کوہ پیما ٹیم کو اس اونچی چوٹی پر حملہ کرنا چاہیے۔''

''واہ واہ واہ واہ کیا حافظہ پایا ہے کیپٹن امانت تم نے، تم تو واقعی خاموش طبع لائق آدمی ہو۔ اور کیا بتایا تھا بھلا میں نے؟'' میجر نے خوش ہو کر پوچھا۔

''آپ سارے نمبر کیپٹن کو نہ دیں سر۔ ہمارا بھی تو کچھ حق ہے، میں بتاتا ہوں۔'' کیپٹن تنویر کھنکار کر بولا ''سر آپ نے بتایا تھا کہ ۱۸۹۷ء میں کسی انگریز نے جس کا نام میلاس تھا اور کسی اور انگریز نے جس کا نام ٹینڈل بسکو تھا اور ایک اور انگریز ڈاکٹر آرتھر نیو نے نالہ پن مک کی طرف سے آگے بڑھ کر ۲۹۰۰۰ فٹ تک بلندی پر قیام کیا تھا اور آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ سلتورو درہ کی طرف آگے بڑھیں تو قطب شمالی اور قطب جنوبی کے گلیشیر کو چھوڑ کر دنیا کا سب سے بڑا گلیشیر ملتا ہے جسے سیاچن گلیشیر کہتے ہیں یعنی جنگلی گلابوں والا گلیشیر اور اُسے ۱۹۰۹ء میں ڈاکٹر یونگ سٹاف، سلنگ بائی اور میجر ڈاکٹر آرتھر نیو نے دریافت کیا تھا۔ یہ سیاچن گلیشیر یعنی جنگلی گلابوں والا گلیشیر وہی ہے جس پر ان دنوں لڑائی جاری ہے اور جس پر لڑنے والی بھارتی سینا کو نوبرا ویلی کی طرف سے سپاہی ہتھیار اور کارتوس وغیرہ ملتے ہیں اور جس کی طرف ہم۔''

''بس بس۔ اتنا ہی کافی ہے آج۔'' میجر نوری نے سر سے اوپر ہاتھ لے جا کر کہا۔

''سر، کون فرسٹ آیا؟'' کیپٹن تنویر نے خوش دلی سے پوچھا۔

''کیپٹن تنویر یعنی آپ۔ اور کون؟ اور ہاں۔ سب سن لو کہ ہم ابھی روانہ ہوں گے آگے کی طرف۔''

میجر نے یہ کہہ کر اپنا سامان باندھنا شروع کیا۔ لیکن سامان باندھنے سے پہلے نقشہ دوہرا تہرا کر کے نہایت احتیاط سے مومی لفافہ میں رکھ لیا۔

پہلا مقابلہ

لگاتار چار گھنٹے چلنے کے بعد وہ پیون سے پچیس میل دور بلتستان اور لداخ کی سرحد پر تھے۔ یہاں پر بھی ایک ہٹ تھی جس میں قیام کے لیے انہوں نے پڑاؤ کیا۔

کسی زمانہ میں درہ چھور بٹ سے دو راستے نکلتے تھے۔ ایک راستہ تو لداخ کے پایہ تخت لہہ کو جاتا تھا۔ یہ راستہ خپلو، ڈاؤ، پیون، چونگا ھنو، سکر بچن، خلاستی اور لہہ کا راسہ تھا اور دوسرا راستہ پیون سے نوبرا ویلی کو جاتا تھا اور راستہ میں صرف تین گاؤں آتے تھے، تیسرا راستہ بھی تھا لیکن یہ سیاچن گلیشیر کو جاتا تھا۔ یہ راستہ پیون، سکسہ، چھوار، سیاری، چلونکھا، تیاقتی اور طور تک کا راستہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد یہ سب راستے بند ہو گئے اور اب ان راستوں پر صرف پہاڑی ڈاکو، مفرور، انڈین اور پاک آرمی کے جوان، برفانی ریچھ، جنگلی یاک، برفانی چیتے، برفانی بھیڑیئے اور سانپ چٹ کر جانے والے جنگلی اور پہاڑی بکرے (مارخور) گھومتے تھے۔ درمیان بنجر اور پُرخطر یہ پہاڑی علاقہ مہذب دنیا سے بالکل الگ تھلگ تھا اور اس میں سفر کرنا جان جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف تھا۔

اس بار بروق پا نے طے کیا کہ وہ سلطان اور ابراہیم رات ایک بجے تک پہرہ دیں گے اور ایک بجے کے بعد امانت اور شامی پہرہ دیں گے۔ وہ چار بجے صبح سو جائیں گے اور چار بجے صبح سے سات بجے صبح تک میجر اور کیپٹن تنویر پہرہ دیں گے کیونکہ اکیلا آدمی پہرہ دے رہا ہو تو اُسے نیند آ جاتی ہے یا آ سکتی ہے اور دو آدمی پہرہ پر ہوں تو ان کو ایک تو تنہائی کا احساس نہیں ہوتا اور دوسرے گپ شپ سے وقت جلد کٹ جاتا ہے۔ یہ اچھی تجویز تھی اس لیے سب نے اس پر اتفاق کیا۔

رات نو بجے تک سب نے کھانا کھایا، چائے پی اور تھوڑی سی گپ شپ لگا کر لیٹ گئے

اور جلد سو گئے کیونکہ وہ سب دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ بروق پا سلطان اور ابراہیم ھٹ کا دروازہ بند کر کے دروازہ کے ساتھ ایک دوسرے میں گھس کر بیٹھ گئے تا کہ برف کے میدانوں اور پہاڑوں پر چلنے والی تیز ہوا سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔ سلطان اور ابراہیم کے پاس ریوالور تھے اور بروق پا کے پاس صرف چھری تھی۔

رات ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ابراہیم نے آوازیں سنیں جو کہ باہر سے آ رہی تھیں۔ بچوں اور لڑکوں کے کان غالباً زیادہ حساس ہوتے ہیں اُس نے آہستہ سے بروق پا اور سلطان سے کہا کہ اُس نے آوازیں سُنی ہیں۔

''اس ویرانے میں کون آ سکتا ہے؟'' بروق پا بولا۔

''اور پھر رات کے وقت۔'' سلطان بولا۔

''میں نے آوازیں سُنی ہیں اور آپ کو بتا دیا ہے۔'' ابراہیم نے کہا اور اُٹھ کر کیپٹن تنویر کے پاس آ گیا اور اُسے جگایا۔ چراغ کی روشنی میں کیپٹن نے ابراہیم کو اپنے سرہانے کھڑا دیکھا تو اُٹھ کر بیٹھ گیا اور سلیپنگ بیگ الگ کر کے ریوالور تلاش کرنے لگا۔

''ریوالور تو میرے پاس ہے۔'' ابراہیم نے کہا اور ریوالور کیپٹن کی طرف بڑھایا۔ کیپٹن ریوالور لے کر دروازہ کی طرف بڑھا۔

سلطان اور بروق پا دروازہ کا پٹ کھول کر باہر جھانک رہے تھے۔ کیپٹن تنویر اور ابراہیم بھی باہر دیکھنے لگے۔ انہیں کچھ دکھائی نہ دیا کیونکہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور برف باری ہونے والی تھی۔ انہیں ہوا کے شور کے سوا کچھ سنائی نہ دیا۔ البتہ وہ کان لگائے سنتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد کسی کی دھیمی آواز سنائی دی۔

''کسی نے کوئی بات کی ہے۔ میں نے سنا ہے۔'' ابراہیم نے کہا۔

''ہاں۔ میں نے بھی بات سنی ہے۔'' کیپٹن تنویر بولا۔ اُس کا جسم ایک دم تن گیا اور جسم کے سارے پٹھے جھنجھنا اُٹھے۔ کمانڈو جب لڑنے کے لیے تیار ہوتا ہے تو اس کی سوچ کا اثر فی الفور اس کے جسم پر ہوتا ہے۔ ذہن اور جسم کے تال میل سے ہی کمانڈو اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ذہن جاگ رہا ہے اور جسم سویا ہوا ہے یا جسم تیار ہے لیکن ذہن شبہ یا وہم کا شکار ہو کر ڈھیلا پڑ گیا ہے۔

''میرے خیال میں راستے صرف دو ہیں ایک وہ جس پر چل کر ہم آئے ہیں اور ایک وہ جس پر چل کر ہم آگے جائیں گے۔'' کیپٹن نے کہا۔

''راستے تین اور چار بھی ہو سکتے ہیں'' سلطان نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''وہ یوں کہ شکاری، چور، ڈاکو، بھگوڑے، گوریلے اور درندے کسی راستہ سے اس طرف آ سکتے ہیں۔'' سلطان بولا۔

''درست بات ہے۔ کوئی بھی راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ آپ میں اس راستہ پر چلنے کی ہمت ہو یا آپ محنت کر سکیں۔ تکلیف سہہ سکیں۔'' بروق پا نے کہا۔

آوازیں اب اونچی سنائی دیں تو انہوں نے اندھیرے میں پھر غور سے دیکھا۔ سامنے سے دو یاک آ رہے تھے اور اُن کے پیچھے چار آدمی تھے۔ ایک یاک کے پیچھے دو آدمی۔ وہ سیدھے اُن کی طرف آ رہے تھے۔

کیپٹن نے دروازہ پوری طرح بند کیا اور کُنڈی چڑھا دی۔

''میجر صاحب کو جگا دوں۔'' سلطان نے پوچھا۔

''نہیں۔ وہ خود جاگ اُٹھیں گے۔'' کیپٹن نے ریوالور کو جانچا پرکھا اور پوزیشن لے کر کھڑا ہو گیا۔

''سر! میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ میں خالی ہاتھ ہوں۔'' ابراہیم بولا۔

''تم خالی ہاتھ لڑو گے میرے چاند۔'' کیپٹن نے اُسے بتایا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میجر نوری اُٹھ کر اُن کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔

''دو یاک اور چار ڈاکو تما لوگ چلے آ رہے ہیں۔ ہم اُن کا خیر مقدم کریں گے اور آپ دیکھیں گے۔'' کیپٹن کی آواز میں خوشی کی لہر تھی۔

یاک ھٹ سے تین گز دُور کھڑے ہو گئے۔ چاروں آدمی دونوں یاکوں کی پیٹھ پر سے کھرجیوں کو اُتارنے لگے اور پھر گھسیٹ کر ھٹ کے پاس لے آئے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر دروازہ کو دھکا دیا۔ جواب اندر سے بند تھا۔ اُس نے دوسرے تین ساتھیوں کو آواز دی اور وہ کھرجیاں چھوڑ کر قریب آ گئے۔

چاروں میں سے ایک سردار تھا۔ وہ بولا:

''کون ہے اندر؟''

''میں ہوں اندر ابراہیم۔'' ابراہیم نے جواب دیا۔

''اندر تو کوئی بچہ ہے۔'' سردار نے کہا اور پوچھا۔

''تم اکیلے ہو یا تمہارے ساتھ بھی کچھ لوگ ہیں؟''

''میرے ساتھ چھ بچے اور ہیں۔''

''دروازہ کھولو ہمیں سردی لگ رہی ہے۔'' سردار بولا:

اور اُس نے اپنے کمبل کے نیچے پستول لوڈ کر لیا۔ یہی کچھ اس کے باقی تینوں ساتھیوں نے کیا۔ ابراہیم نے دروازہ کھول دیا اور سامنے کھڑا ہو گیا۔ سردار نے اُسے دھکا دیا اور گرا کر آگے بڑھا تو کیپٹن تنویر کے ریوالور کی گولی نے اُس کے دماغ کے پرخچے اڑا دیئے۔ سلطان کے فائر سے دوسرا گرا اور باقی دو بھاگ اُٹھے۔

برف میں بھاگنا آسان نہیں ہوتا۔ خاص طور پر اُس وقت جب بھاری اور بوجھل بوٹ پہنے ہوں۔ کیپٹن تنویر نے اُن کا پیچھا کیا۔ کیپٹن تنویر نے بھی فوجی بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے برف میں بھاگنا اُس کے لیے مشکل تھا۔ کیپٹن کا پیچھا اُس کے شاگرد ابراہیم نے کیا اور وہ ننگے پاؤں بھاگ اُٹھا۔ اب بھگوڑے آگے اور کیپٹن تنویر اور ابراہیم اُن کے پیچھے۔ بھگوڑوں کو بھاگتے ہوئے اور اُن کا پیچھا کرتے ہوئے میجر نوری اور اُس کے ساتھی اپنے دونوں ساتھیوں کو کچھ دیر دیکھتے رہے پھر وہ دونوں اور یہ دونوں اندھیرے میں غائب ہو گئے۔

تھوڑی دیر فائر کی تابڑ توڑ آوازیں آئیں اور اردگرد کے پہاڑ، پہاڑیاں، چوٹیاں اور کھائیاں گونج اٹھیں۔ کچھ دیر بعد کیپٹن اور ابراہیم واپس آئے۔ کیپٹن نے ابراہیم کو ایک کندھے پر اٹھایا ہوا تھا اور دوسرے کندھے پر بھگوڑوں کے اوور کوٹ تھے جن کی جیبوں میں چاقو اور خنجر تھے۔

یہ چاروں ڈاکو اور لٹیرے تھے۔'' کیپٹن تنویر نے ابراہیم کو کندھے سے اتارتے ہوئے کہا اور پھر اُسے جھونپڑی کے اندر دھکیل دیا۔

دونوں یک کھڑے جگالی کر رہے تھے جیسے اپنے آپ میں مست ہوں۔ اُن سے ذرا

ہٹ کر دونوں لٹیروں کی لاشیں پڑی تھیں۔

''سلطان، ان لاشوں کو تم اور بروق پاگھسیٹ کر پیچھے پھینک دو اور پھر اندر آ کر دروازہ بند کر کے سو جاؤ۔''

میجر نوری نے کہا اور اندر آ کر لیٹنے کی تیاری کرنے لگا جب وہ سلیپنگ بیگ کے اندر لیٹ گیا تو بولا۔

''مجھے ایک بجے جگا دیجیے گا میں پہرہ دوں گا۔ کیپٹن تنویر اور ابراہیم کو پہرہ معاف ہے۔ البتہ کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت میرے ساتھ پہرہ پر کھڑے ہوں گے۔''

تیاری

اگلے دن میجر نوری نے ایک میلا کچیلا کاغذ کا پرزہ نکالا جس پر لکھا تھا۔

۱۔ خپلو سے نونکھا	۱۱ میل
۲۔ لونکھا سے پیون	۱۳ میل
۳۔ پیون سے فرانو	۱۲ میل
۴۔ فرانو سے طورتنگ	۱۲ میل
۵۔ طورتنگ سے بیانگ دنگڈو	۱۶ میل
۶۔ بیانگ ڈنگڈو سے وارث	۹ میل
۷۔ وارث سے اُغارو	۱۷ میل
۸۔ اغارو سے موغڈاری	۸ میل
۹۔ موغڈاری سے چوراسہ	۱۸ میل
کُل	۱۱۶ میل

نوبرا ویلی تنگ پہنچنے کے لیے یہ نو منزلیں تھیں لیکن انہوں نے تو اس سے کہیں زیادہ کٹھن راستہ چنا تھا اور وہ راستہ پیون سے درہ چھوربٹ تنگ اور چھوربٹ سے ھنو میں سے ہو کر نوبرا ویلی تنگ جاتا تھا۔ ھنو کے قریب ۳ گاؤں آتے تھے باقی سب راستہ اُجاڑ اور خطروں سے بھرا پڑا تھا۔ انہوں نے دوپہر تنگ چھ میل کا فاصلہ طے کیا اور پھر بلتستان اور لداخ کی سرحد پر پہنچ

گئے۔ دونوں یاک وہ ساتھ لائے تھے۔

کھانا کھانے کے بعد میجر نوری نے سب کو بٹھا کر کہا۔

''ہم کرنل دھنی رام کو تلاش کرنے جا رہے ہیں۔ یہ نہایت مشکل کام ہے، ہم آج رات اندھیرے سے فائدہ اُٹھا کر سرحد پار کریں گے کوئی پتہ نہیں زندہ بچ سکیں یا شہید ہو جائیں۔ اب بھی وقت ہے جو ساتھی واپس جانا چاہیں واپس جا سکتے ہیں۔ مجھے کسی سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔''

کوئی بھی واپسی کے لیے رضا مند نہ ہوا۔ وہ سب کرنل دھنی رام کو پکڑنے کے لیے تیار تھے۔

''ہم تعداد میں سات ہیں۔ ایک شخص بوڑھا ہے، ایک بچہ ہے۔ گویا ہم تعداد میں پانچ ہیں۔ ہمارا مقابلہ صرف دھنی رام سے نہیں ہوگا، نوبرا ویلی میں انڈین آرمی سے ہوگا۔ ہمارا فلسفہ ہوگا، ہٹ اینڈ رن، یعنی ضرب لگاؤ اور بھاگ جاؤ۔ ہم جم کر نہیں لڑ سکتے۔ ہم گرفتار نہیں ہوں گے کیونکہ گرفتاری کا مطلب بے عزتی، بے غیرتی اور اذیت ناک موت ہے اگر بھاگنا پڑا تو ہم اس راستہ سے واپس نہیں آئیں گے۔ ہم فرانو، طورتک، بیاتنگ، ڈنگڈو، وارث، اغارو، موفڈاری اور چھاسہ کے راستہ سے واپس آئیں گے۔ ہوسکتا ہے سلتورو گلیشیر اور دُم سم کے راستہ واپس آنا پڑے۔ یہ بھی ممکن ہے ہم یارقند یعنی تبت کی طرف نکل جائیں۔ یہ بھی عین ممکن ہے ہمیں بھیس بدل کر درہ کھردنگ یعنی کھردنگ لا کے راستہ لہہ کی طرف جانا پڑے۔ ان حالات میں یہ بہت ضروری ہے کہ لداخ کو آنے والے راستوں، لداخ سے جانے والے راستوں اور لداخ کے اندر گھومنے پھرنے والے راستوں کا گہرا مطالعہ کیا جائے اور ان راستوں کو اپنے اپنے ذہن پر تصویر کی طرح نقش کر لیا جائے۔ یہ بہت ضروری ہے۔''

یہ کہہ کر میجر نے نقشہ سمجھنے سمجھانے کے لیے سرخ بال پوائنٹ جیب سے نکالا اور باقاعدہ کلاس شروع کر دی۔ جب چھٹی ملی اُس وقت سب کو نقشہ پہاڑے کی طرح یاد ہو چکا تھا۔ حتیٰ کہ ابراہیم آنکھیں بند کر کے نقشہ کاڑھ سکتا تھا۔ میجر نے نقشہ سمجھانے کے بعد چند اصول طے کیے۔

''ہم عورت، بچے اور نہتے شخص کو کچھ نہیں کہیں گے۔

ہم جم کر نہیں لڑیں گے۔

ہم دشمن سے ہتھیار چھین کر اُس کے خلاف استعمال کریں گے۔

ہم گرفتار نہیں ہوں گے۔

ہم ضرب لگاؤ اور جان بچاؤ کے اصول پر چلیں گے۔

ہم دن کو سوئیں گے، رات کو حملہ کریں گے۔

قیادت یوں ہوگی کہ میں مر گیا تو میرے بعد کیپٹن تنویر، اُس کے بعد کیپٹن شامی، اس کے بعد کیپٹن امانت، اس کے بعد سلطان، اس کے بعد بروق پا اور اُس کے بعد ابراہیم۔''

''میں کیپٹن تنویر کے ساتھ شہید ہونا پسند کروں گا۔'' ابراہیم بولا۔

''شاباش میرے بیٹو جیتے رہو۔ پاکستان کو آپ جیسے بیٹوں کی ضرورت ہے اور اسلام کو بھی۔'' کیپٹن تنویر بولا۔

''یقیناً اس بات میں کوئی شک نہیں۔''

تاریکی بڑھ رہی تھی اور وہ ایک چٹان کے چھجے کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ چھجہ پتھر کھرچ کر بنایا گیا تھا۔ میجر نے دو خیمے گاڑھنے کا حکم دیا اور خود پہرہ پر کھڑا ہو گیا۔ کیپٹن تنویر نے اسلحہ کی چیکنگ شروع کی۔ بروق پا اور ابراہیم کھانا تیار کرنے لگے اور کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت سیر کے لیے نکل گئے۔ سلطان یاکوں کے پاس چلا گیا تاکہ وہ رات کو کھسک نہ جائیں۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ سب اکٹھے ہو گئے اور کھانا کھا کر چلنے کی تیاری کرنے لگے۔

سرحدی مورچہ

چار لٹیروں کے اوور کوٹ میجر نوری، کیپٹن تنویر، کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت نے اوڑھ رکھے تھے۔ بروق پا کا اپنا خاص لباس تھا جو لداخ اور بلتستان کے ہائی لینڈرز پہنتے ہیں یعنی کڑتا، پاجامہ، فتوئی (جیکٹ) پرانا کوٹ، لوئی، ٹوپی اور مفلر۔ سلطان نے بھی لداخی چرواہوں کا لباس پہنا ہوا تھا اور وہ قد کاٹھ اور شکل و شباہت سے بالکل چرواہا نظر آتا تھا خاص طور پر اُس وقت جب وہ یاک کے قریب کھڑا ہوتا تھا۔ ابراہیم کا لباس بھی وہی تھا جو لداخی لڑکوں کا ہوتا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ بلتی اور لداخی زبانوں اور بولیوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں زبانوں کی ماں تبّتی زبان ہے اور پھر جس ایریا میں وہ جا رہے تھے وہ صدیوں بلتستان کا حصہ رہا ہے اور اب بھی بلتستان کا حصہ تھا۔ گویا بلتی اور لداخی بولنے والے نہ صرف ایک دوسرے کی زبان سمجھتے تھے بلکہ بولتے بھی تھے اور اُن کا لب و لہجہ بھی وہی تھا جو لداخیوں کا لب و لہجہ ہے۔

جہاں تک انڈین آرمی کے سپاہیوں اور افسروں کا تعلق ہے وہ نہ لداخی سمجھتے ہیں اور نہ بلتی۔ اُن کے لیے دونوں زبانیں اجنبی ہیں۔ سچ بات تو یہ ہے لداخی اور بلتی دو مختلف زبانیں نہیں ہیں، آل انڈیا ریڈیو کا لہہ سٹیشن بلتستانیوں کے لیے پروگرام نشر کرتا ہے اور ریڈیو پاکستان کا سکردو سٹیشن لداخ کے سننے والوں کے لیے پروگرام نشر کرتا ہے۔ گویا دونوں زبانیں بنیادی طور پر ایک ہی زبان کے دو مختلف روپ ہیں۔

رات گیارہ بجے اُن کا قافلہ روانہ ہوا۔ سب سے آگے کیپٹن تنویر تھا اور اُس کے پیچھے ابراہیم، میجر نوری، سلطان، بروق پا، شامی اور امانت تھے۔ ایک یاک کی رسی ابراہیم کے ہاتھ میں تھی اور دوسرے کی رسی سلطان کے ہاتھ میں۔ باقی سب مسلح تھے حتیٰ کہ بروق پا کے پاس بھی چھری تھی۔ میجر نے سب کو سمجھا دیا تھا کہ وہ چرواہے ہیں اور چراگاہ سے ھنو کی طرف واپس جا رہے ہیں۔ لباس سے وہ واقعی چرواہے دکھائی دے رہے تھے۔

رات بارہ بجے وہ انڈین آرمی کے پہلے مورچہ پر پہنچ گئے۔ پہاڑوں کے درمیان تنگ راستہ چار ہتھیار بند فوجیوں نے روکا ہوا تھا۔

''ہالٹ، کون ہو تم؟'' ایک گرجدار آواز گونجی۔ لہجہ سے معلوم ہوا تھا سکھ ہے۔

''چرواہے جناب۔'' ابراہیم نے کہا۔

''یہ تو بچہ ہے۔'' ایک فوجی نے کہا۔

''جی جناب میں بچہ ہوں۔'' ابراہیم بولا۔

''کہاں سے آئے ہو؟'' اُسی فوجی نے پوچھا جس نے شروع میں ہالٹ کا کاشن دیا تھا۔

''اوپر سے جناب۔ چراگاہ سے حضور۔'' بروق پا آگے بڑھ کر بولا۔ اُسے میجر نے آگے بھیجا تھا۔ وہ سب سے زیادہ عمر کا تھا۔

''اوپر سے آئے کیوں ہو؟''

''جناب برف باری کا موسم آ گیا ہے اس لیے واپس آ گئے ہیں۔''

''لیکن کل رات تو تم چار تھے۔'' ایک اور آواز آئی۔

''مائی باپ۔ کل میرے چار بیٹے آئے تھے۔ مجھے اور میرے دو بیٹوں کو لینے کے لیے۔ میرے کل سات بیٹے ہیں حضور'' بروق پا بولا۔

لیکن یہ جو تمہارے چار بیٹے ہیں کل تو اتنے لمبے نہیں تھے آج کیسے ہو گئے؟

اس کے بعد بروق پا نے بلتی میں کہا کہ اگر تلاشی لیں تو حملہ کر دو۔

''یہ تم نے لداخی میں کہا کہا بڈھے؟'' پہلے فوجی نے حقارت سے کہا۔

''حضور میں نے اپنے بیٹے سے کہا کہ صاحب کو بتاؤ کہ ہم لمبے نہیں ہوئے۔''

وہی فوجی بولا جس نے سب سے پہلے ہالٹ کہا تھا۔

''حضور پتہ نہیں کیا فرماتے ہیں آپ۔ ایک رات اور ایک دن میں لمبے کیسے ہو سکتے ہیں۔ حضور، مذاق فرما رہے ہیں۔''

''ہم تلاشی لیں گے۔'' پہلے فوجی نے ابھی یہ فقرہ کہا ہی تھا کہ کیپٹن تنویر اور میجر نوری نے فائر کھول دیا اور وہ چاروں ڈھیر ہو گئے۔ ایک خندق سے چار اور نکلے لیکن وہ سلطان، شامی اور امانت کے فائر سے جہنم سدھار گئے۔ ایکشن اتنا تیز تھا کہ انڈین فوجی بھونچکا رہ گئے تھے۔

صبح تک آٹھ لاشیں نیچے کھڈ میں گر چکی تھیں۔ میجر نوری اور اُس کے ساتھی گرما گرم چائے پی چکے تھے۔ اسلحہ اور گولی سکہ قابو کر لیا گیا تھا اور وہ چرواہوں کے روپ میں ھنو کی طرف بڑھ رہے تھے۔ انہیں راستہ میں انڈین آرمی کی تھوڑی سی نفری ملی لیکن کسی کو شبہ نہ ہوا کہ وہ چرواہے نہیں ہیں۔

پٹری

''یہ وہ راستہ ہے جس پر لداخ کے ایک بوڑھے جونیل بینگ پا نے سفر کیا تھا لیکن اُس نے ہمارے راستہ کے الٹ سفر کیا تھا۔'' میجر نوری بات چیت کے موڈ میں تھا۔ اُس نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔

''یہ بینگ پا کون تھا سر؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

''۱۸۴۱ء میں لداخ پر جموں و کشمیر کے ڈوگروں نے قبضہ کیا۔ ڈوگرے ہندو راجپوت ہوتے ہیں۔ ان ڈوگروں کا کمانڈر انچیف تھا زور آور سنگھ۔ اُس نے اپنے ایک جونیل بینگ پا کو لداخ کے صدر مقام لہہ سے سکردو پر چڑھائی کے لیے بھیجا تھا۔ جونیل بینگ پا اسی راستہ سے بلتستان کے صدر مقام سکردو کی طرف بڑھا تھا۔'' میجر نوری نے بتایا۔

''کیا آپ تاریخ کی بات کر رہے ہیں؟'' کیپٹن تنویر نے سوال کیا۔

''جی ہاں۔ یہ تاریخی بات ہے۔'' میجر نوری نے تصدیق کی۔

''ڈوگرہ سپہ سالار زور آور سنگھ خود سکردو کی طرف کیوں نہ بڑھا؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

''وہ بھی سکردو پر حملہ آور ہوا تھا لیکن اُس کے پاس ڈوگرہ فوج تھی جو دشوار گذار راستہ سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی۔ جونیل بینگ پا کی فوج لداخی تھی اس لیے کٹھن راستوں پر سفر کی عادت تھی اُسے۔''

''تو زور آور سنگھ کس راستہ سے سکردو کی طرف بڑھا؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

وہ دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ کھرمنگ کی وادی میں سے آگے بڑھا تھا۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم جس راستہ پر سے لداخ میں داخل ہوئے تھے یہ بھی دشوار گذار اور کٹھن راستہ ہے اور اس راستہ پر کم ہی لوگ سفر کرتے ہیں۔'' میجر نوری نے کہا اور پھر خاموشی سے سفر کرتا رہا۔ اب اُترائی شروع ہوگئی تھی لیکن یہ اُترائی اسّی (۸۰) ڈگری زاویہ کی تھی اس لیے تیز چلنا محال تھا۔ ویسے بھی راستہ بہت تنگ تھا۔ ایک طرف اُونچا پہاڑ تھا اور دوسری طرف گہری کھڈ تھی۔ دونوں کے درمیان چٹان کھرچ کھرچ کر راستہ بنایا گیا تھا۔ جب وہ دوپہر کو ایک پڑی کے قریب پہنچے تو میجر نے بھانپ لیا کہ یہ انڈین آرمی کے جوان ہیں جو راستہ روکے کھڑے ہیں۔

''ہمیں ان کی پوچھ گچھ سے پہلے حملہ نہیں کرنا ہوگا۔'' میجر بولا۔

''اگر انہوں نے تلاشی لی تو پھر؟'' کیپٹن شامی نے پوچھا۔

''تب تلاشی نہیں دیں گے۔ حملہ کریں گے۔'' میجر نے کہا اور بروق پا، سلطان اور ابراہیم کو سب سے آگے کر دیا اور خود چاروں کماٹڈو پیچھے پیچھے چلنے لگے۔

جب بروق پا جو سب سے آگے تھا، پڑی کے نیچے پہنچا تو ایک فوجی نے چلاّ کر کہا ''رُکو'' بروق پا رُک گیا۔ اُس کے پیچھے سلطان اور سلطان کے پیچھے دونوں یاک رُک گئے۔ یاک پر ابراہیم سوار تھا۔ جب یاک رُکا تو وہ چھلانگ لگا کر نیچے آیا اور سلطان کے ساتھ کھڑا ہوگیا۔

''تم کہاں سے آئے ہو؟'' ایک فوجی نے پوچھا۔

جناب، مائی باپ، ہم اوپر سے آئے ہیں چوگاہ سے۔ چوواہے ہیں یہ میرے بیٹے ہیں

حضور۔'' بروق پا نے گھگھیا کر کہا۔ وہ جھک گیا تھا اور اُس نے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔

''تم سب تلاشی دو۔ چلو جلدی کرو۔'' حکم ملا۔

سب سے پہلے میجر نے فائر کیا۔ اُس کے بعد شامی اور امانت نے۔ اس بار کیپٹن تنویر کی باری نہ آئی۔ وہ تعداد میں پانچ تھے۔ سلطان، بروق پا اور ابراہیم نے اُن کی لاشیں نیچے کھڈ میں لڑھکا دیں اور خود پڑی کے نیچے بیٹھ گئے تاکہ ذرا سستا سکیں۔ یہ سب کچھ آنکھ کے جھلکارے میں ہوا۔ پڑی خاصی کھلی تھی۔ اسے پہاڑ کو کاٹ کر بنایا گیا تھا یوں لگتا تھا جیسے پتھروں سے برآمدہ تیار کیا گیا تھا۔ بارش ہو یا ژالہ باری کا طوفان، اس پڑی کے نیچے دس آدمی آسانی سے ٹھہر سکتے تھے اور وہ تعداد میں سات تھے۔

بروق پا نے جلدی سے چائے تیار کی اور انہوں نے جلدی جلدی ہنٹر بیف کے ٹکرے چائے کے ساتھ نیچے حلق میں اُتارے۔ میجر نوری کا بس چلتا تو وہ پہاڑ کے اُوپر چلا جاتا اور اپنے آدمیوں کو چھپا دیتا۔ لیکن مصیبت یہ تھی کہ یاک پہاڑ پر نہیں چڑھ سکتے تھے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یاک برف پوش پہاڑوں کا جانور ہے اور پہاڑی راستوں پر سفر آسانی سے کر سکتا ہے لیکن یاک کوہ پیما تو نہیں ہے۔ ہاں کوہ نورد ضرور ہے اور کوہ پیما اور کوہ نورد میں یہی فرق ہے جو چیتے اور بیل میں ہوتا ہے۔ میجر اس مرحلہ پر یاکوں کو ہاتھ سے گنوانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے پہاڑ پر چڑھ کر چھپنا ابھی اُس کے پروگرام میں شامل نہ تھا۔

اُس کے لیے دوسرا راستہ صرف یہ تھا کہ وہ پہاڑی پگڈنڈی پر نوبرا وادی کی طرف بڑھے اور یاک اُس کے ساتھ ہوں تاکہ وہ اور اُس کے ساتھی بوجھ سے ہلکان نہ ہوں۔ انہوں نے چرواہوں اور کسانوں کا جو بہروپ بھر رکھا تھا وہ اب تک کامیاب رہا تھا۔

چائے اور ہنٹر بیف سے لطف اندوز ہونے کے بعد وہ ھنو کی طرف چل پڑے۔ چار گھنٹے سفر کرنے کے بعد وہ شام پانچ بجے کے قریب ایک کھلی چراگاہ میں پہنچے جو ھنو کی چراگاہ تھی۔ اور جو پتھروں، روڑوں اور برف کے ڈھیلوں سے اٹی پڑی تھی۔ انہوں نے قد آدم پتھروں کے درمیان دو خیمے گاڑھے۔ ایک خیمہ سونے کے لیے تھا اور دوسرا باورچی خانہ کے لیے۔ یاک بھی دو بڑے بڑے پتھروں کی اوٹ میں کھڑے ہوگئے۔ سب سے پہلے انہوں نے نماز ادا کی۔

آدھی رات کا سفر

وہ جس جگہ سوئے تھے، وہ راستہ سے ہٹ کر تھی۔ بڑے بڑے گول مٹول پتھروں میں یہ جاننا بہت مشکل تھا کہ کوئی سویا ہوا ہے یا نہیں۔ سلطان نائٹ ویژن گاگلز لگا کر پہرہ دے رہا تھا۔ یہ وہ عینکیں ہوتی ہیں جن کے ذریعے رات کو دور دور تک اُسی طرح دیکھا جا سکتا ہے جس طرح دن کو عام طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اگر یاک نہ ڈکراتے تو پہاڑی قزاقوں کو پتہ نہ چلتا کہ ان گول مول پتھروں میں یاک کھڑے ہیں۔ ان کے ڈکرانے سے پہاڑی قزاقوں کو پتہ چلا کہ ان پتھروں میں یاک کھڑے ہیں چنانچہ چھ عدد پہاڑی ڈاکو اس طرف نکل آئے۔ اُن کو آتے دیکھ کر سلطان نے سب کو جگایا۔

پہاڑی ڈاکو جو ھنو کے بدمعاش تھے یہ تو جانتے نہیں تھے کہ یاکوں کے مالک بھی موجود ہیں۔ وہ تو یاکوں کو شکار کرنے کے لیے یاکوں پر حملہ آور ہوئے تھے لیکن اُن کا مقابلہ میجر نوری اور اُس کے گروہ سے ہوا۔

جب سلطان کی طرف سے پہلی گولی چلی تو پہلا قزاق ڈھیر ہوا۔ لٹیروں کو معلوم ہو گیا کہ اُن کا واسطہ یاکوں سے نہیں، اُن کے مالکوں سے ہے۔ چنانچہ پانچ ڈاکو چراگاہ میں پتھروں کی اوٹ میں ہو گئے اور فائر کرنے لگے مگر اُن کے پاس نائٹ ویژن گاگلز نہ تھے۔ رات ان کے لیے واقعی رات تھی۔ میجر نوری اور اس کے آدمیوں کی طرح رات کو دن میں تبدیل کیا گیا نہیں تھا چنانچہ ایک گھنٹہ فائرنگ کے بعد ڈاکو بھاگنے پر مجبور ہوئے لیکن بھاگنا محال تھا۔ میجر نوری، کیپٹن تنویر، کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت نے اُن کو زیادہ دور نہ جانے دیا اور گولیوں سے اُن کے سر اور کندھے چھلنی کر دیئے۔

بھلا ڈاکوؤں کی لاشیں کون سنبھالتا ہے؟ میجر نوری نے فیصلہ کیا کہ وہ اب رات سفر کریں گے اور مقابلہ کی جگہ سے دور نکل جائیں گے چنانچہ وہ آدھی رات کو پھر سفر پر روانہ ہو گئے اور آدھ گھنٹہ کے دوران میں ھنو گاؤں میں سے ہوتے ہوئے آگے نکل گئے۔ ان سب نے نائٹ ویژن گاگلز آنکھوں پر چڑھا رکھی تھیں چنانچہ اُن کو رات کی تاریکی میں سفر کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آ رہی تھی۔ جب صبح ہوئی اور سورج طلوع ہوا تو وہ ایک ایسی چراگاہ میں پہنچے جو بالکل سنسان اور اجاڑ تھی اور جس کے درمیان پانی کا تالاب تھا لیکن پانی جم چکا تھا۔

اس تالاب کے قریب بودھوں کی عبادت گاہ تھی جو چراگاہ کی طرح سنسان تھی۔

جب وہ عبادت گاہ میں داخل ہوئے تو وہاں دیسی تیل اور گھی مکھن کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ ایک کونے میں مہاتما بدھ کا دو فٹ اُونچا مجسمہ تھا جو پتھر کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ اس بت کے اردگرد تیل اور گھی کے دیے تھے جو بجھے ہوئے تھے۔ میجر نوری نے محسوس کیا کہ اس عبادت گاہ میں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ میجر نے یہ بھی محسوس کیا کہ کچھ لوگ یہاں رات بھر قیام بھی کرتے ہیں۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ سارا دن اس عبادت گاہ کے اندر گذاریں گے اور سفر نہیں کریں گے کیونکہ عبادت گاہ اجاڑ جگہ پر تھی۔ اُس نے حکم دیا کہ یاکوں کو کھلا چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ برف کے نیچے سے گھاس تلاش کر کے پیٹ بھر سکیں۔ شام کو اُن کو پھر رسی ڈال دی جائے۔ یہ بھی طے ہوا کہ ابراہیم کو چھوڑ کر سبھی دو دو گھنٹہ پہرہ دیں تاکہ کوئی دشمن ان پر اچانک حملہ نہ کر سکے۔

ان سب نے صبح آٹھ بجے سے رات آٹھ بجے تک جی بھر کر آرام کیا اور پھر رات کا کھانا کھا کر اور نائٹ ویژن گاگلز پہن کر سفر پر چل پڑے۔ ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا۔ انہوں نے جلدی جلدی تین گاؤں دیکھے، ان میں سے گذرے اور آگے بڑھ گئے، سوائے کتوں کے کسی کو ذرا پتہ نہ چلا۔

چھوٹی چھاؤنی

وہ اب جس سفر پر چل رہے تھے وہ بے حد کٹھن تھا۔ رات کو پہاڑی سفر ہمیشہ کٹھن ہوتا ہے۔ نائٹ ویژن گاگلز (رات کے وقت دیکھنے والی عینکیں) پہننے سے اندھیرا دور ہو گیا تھا اور اُن کو بہت سہولت ہو گئی تھی۔ لیکن برودق پا، سلطان اور ابراہیم ابھی ان عینکوں کے عادی نہ تھے وہ ان کو ایک عجوبہ تصور کرتے تھے۔

ہوا بالکل تھمی ہوئی تھی۔ برف باری کا پتہ نشان نہ تھا۔ آسمان پر ستارے چمک رہے تھے یعنی بادلوں کا نام و نشان نہ تھا۔ البتہ برفانی چیتے، برفانی گیدڑ اور برفانی بھیڑیئے کی آوازیں کبھی کبھار سنائی دیتی تھیں جس علاقہ سے وہ گذر رہے تھے وہاں برفانی اُلو، پہاڑی کوا، رام چکور اور خرگوش بھی پائے جاتے تھے۔ پہاڑی اُلو اس علاقہ کی خاص چیز تھا جو تین بار اُن کے سروں سے پھڑ پھڑاتا ہوا اُڑا تھا۔

سردی بڑھ گئی تھی۔ میجر نے گھڑی دیکھی ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ میجر نے کچھ سوچا اور اپنی پارٹی کو ہالٹ کا حکم دیا۔

''چچا مروق بابا تم جلدی سے کافی بناؤ۔ تھوڑا سا ستا لیتے ہیں۔'' میجر نے کہا۔ ابراہیم اور سلطان نے یاکوں کو روک لیا اور سلطان نے دونوں یاکوں کو باری باری تھپکی دی اور اُن پر سے سامان نیچے اُتارا۔ آدھ گھنٹے کے دوران میں کافی تیار ہوگئی اور انہوں نے ایک ایک کپ پی کر چلنے کی تیاری کی۔ آدھ پون گھنٹہ ستانے سے وہ پھر تازہ دم ہو گئے تھے۔ چلنے سے پہلے انہوں نے تہجد کی نماز ادا کی۔

دو گھنٹہ سفر کرنے کے بعد وہ ایک ایسی کھلی جگہ پہنچے جہاں پہاڑی ککروں کا جنگل تھا۔ اس جنگل کے درمیان پتھروں سے بنایا گیا پختہ راستہ تھا۔ اس راستہ کو آپ جیپ روڈ بھی کہہ سکتے ہیں۔ میجر سب سے آگے تھا وہ ایک دم کھڑا ہوگیا۔ اُس کے رکنے سے اُس کے ساتھی انسان اور حیوان بھی رک گئے۔ جنگل اُن سے ایک فرلانگ کے فاصلہ پر تھا وہ جس جگہ کھڑے تھے وہ تنگ گھاٹی تھی۔ صرف تین گز چوڑی اور دو گز چوڑی تنگ گھاٹی میں کھڑے ہو کر وہ تو پہاڑی کیکروں کے جنگل کو دیکھ سکتے تھے البتہ اُن کو کوئی دوسرا نہیں دیکھ سکتا تھا۔

''میرے خیال میں اس جنگل میں انڈین آرمی کی چھاؤنی ہوگی۔'' میجر نے کہا۔

''اگر چھاؤنی نہ بھی ہو پھر بھی یہاں پکٹ ضرور ہوگی۔'' کیپٹن تنویر بولا۔

''اونچے پہاڑوں کے درمیان پہاڑی کیکروں کا جنگل ہو اور دشمن ملک کی بارڈر قریب ہو تو وہاں چھاؤنی بنانا لازمی ہو جاتا ہے۔ یہاں اس جنگل میں چھاؤنی ہونی چاہیے۔ بڑی نہ سہی چھوٹی سہی۔'' میجر نے کہا۔

''ٹوہ لگانے کی بجائے پتہ کر لیتے ہیں۔ مجھے اجازت دیں تو میں کروں۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔

''ٹھیک ہے جاؤ اور جلدی واپس آؤ۔'' میجر نے اجازت دے دی۔

''میں بھی ساتھ جاؤں گا۔'' ابراہیم نے التجا کی۔

''تو نہیں جا سکتا۔ تو بچہ ہے اور ریکی بچوں کا کھیل نہیں۔'' میجر نے کہا۔

''کوئی بات نہیں سر، یہ بہادر لڑکا ہے، جانے دیجیے۔'' تنویر بولا۔

''نہیں۔ یہ نہیں جا سکتا۔ یہ خود بھی مرے گا اور آپ کو بھی مروائے گا۔'' میجر سخت لہجہ میں بولا۔

''میں اور چچا مروق بابا جاتے ہیں چرواہے بن کر۔'' سلطان نے اجازت مانگی۔

''ریکی یعنی جانچ پڑتال اور وہ بھی دشمن کی۔ آسان کام نہیں ہے، یہ کام تم لوگ نہیں کر سکتے۔'' میجر بولا۔

''پتہ یہی کرنا ہے کہ اس جنگل میں فوجی موجود ہیں یا نہیں، اس بات کا پتہ کر کے ہم واپس آ جائیں گے سر۔'' سلطان نے ادب سے کہا۔

''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم پکڑے جاؤ اور کبھی واپس نہ آؤ اور آپ کے ذریعے اُن کو ہمارا پتہ چل جائے۔'' میجر نے خطرے سے آگاہ کیا۔

''سر، کیوں نہ ہم سب آگے بڑھیں اور اگر فوجی موجود ہوئے تو ان سے مقابلہ کریں گے۔'' کیپٹن شامی نے تجویز پیش کی۔

''یہ تجویز ایک بہادر، دلیر اور کسی حد تک ایک بیوقوف آدمی کی ہوسکتی ہے۔ دانا محتاط اور عقلمند آدمی کی تجویز نہیں ہوسکتی۔'' میجر بولا۔

''اگر آپ اجازت دیں تو ہم اس تجویز پر عمل کرنے کے لیے تیار ہیں۔'' کیپٹن امانت نے مشورہ پیش کیا۔

''ٹھیک ہے مروق بابا اور ابراہیم کی ڈیوٹی ہوگی کہ وہ یاکوں کا خیال رکھیں گے یعنی ان کو ہانکتے رہیں گے۔ ہم پانچوں یعنی امانت، شامی، تنویر، سلطان اور میں دشمن کا مقابلہ کریں گے۔ اگر بچھڑ جائیں تو آگے بڑھیں گے، اسی راستہ کی سیدھ میں پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ اگر لڑائی ہوئی تو میں اور سلطان ایک گروپ میں ہوں گے۔ شامی اور امانت دوسرے گروپ میں ہوں گے۔ کیپٹن تنویر اپنی مرضی کے مطابق لڑے گا۔ لیکن بارکوں، بنکروں اور ڈپو وغیرہ کو نشانہ بنائے گا۔''

''میں کیپٹن تنویر کے گروپ میں جانا چاہتا ہوں۔'' ابراہیم بولا۔

''تو جانوروں کے گروپ میں ہے یعنی چرواہا ہے۔'' میجر نے اُسے بتایا۔

''سر کا حکم مانو۔ اگر تم یاکوں کو بچا لے جاؤ تو بڑی بات ہے۔'' کیپٹن تنویر نے ابراہیم کو تھپکی دی اور پیار سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

''اگر دیکھو جان کو خطرہ ہے تو یاکوں کو چھوڑ دو اور جان بچاؤ، تم فوجی نہیں ہو کہ لڑو اور شہید ہو جاؤ'' میجر نے بروق پا سے کہا۔

''جی صاحب'' کہہ کر بروق پا نے ایک یاک کی رسی تھام لی۔

''چلو۔ اللہ ہمارا رکھوالا ہے۔'' میجر بولا اور سب سے آگے ہو کر چل پڑا۔

پندرہ منٹ کے بعد میجر اور اس کے ساتھیوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ انڈین آرمی کی ایک چھوٹی چھاؤنی میں ہیں جو پہاڑی کیکروں میں گھری ہوئی ہے۔ اس چھاؤنی میں زمین زمین مورچے بھی تھے جن کو بنکرز کہا جاتا ہے۔ دو فوجی ٹرک اور دس فوجی گاڑیاں تھیں۔ گولہ بارود کا ڈپو بھی تھا اور سپلائی ڈپو بھی۔ دو بارکیں بھی تھیں اور افسروں کے دو گھر بھی تھے۔

کمانڈو ایکشن

میجر نوری نے کیپٹن تنویر کے کان میں کچھ کہا۔ کیپٹن گروپ سے الگ ہو کر اور راستہ سے ہٹ کر کیکروں کی اوٹ میں آگے بڑھا اور اُس نے پیچھے سے خنجر سے وار کر کے سکیورٹی گارڈ کا گلا کاٹا۔ اس کی جیب سے چابی لی اور فولادی گیٹ کا تالا کھولا اور پھر فولاد کا بنا ہوا گیٹ کھول دیا۔ میجر اور اس کی پارٹی یاکوں سمیت خاموشی سے چلنے لگے۔ میجر نوری سب سے آگے تھا اور اُس کے پیچھے کیپٹن تنویر۔ پھر بروق پا، یاک، ابراہیم، سلطان اور شامی۔

وہ بمشکل دس گز بڑھے ہوں گے کہ سامنے سے دو گشتی فوجیوں نے جنگل سے نکل کر اُن کا راستہ روک لیا اور پستول تان لیے۔ وہ وردی میں تھے اور افسر تھے۔

''رُک جاؤ!'' ایک للکارا۔

میجر نے رکنے کی بجائے فائر کیا، دوسرا فائر کیپٹن تنویر نے کیا۔ دونوں گشتی افسر زمین پر گر پڑے۔ گولیوں کی آوازیں جنگل اور پہاڑوں میں گونجنے لگیں اور سارا جنگل جاگ اُٹھا۔ پہاڑ گونجنے لگے اور افراتفری پھیل گئی۔

میجر اور سلطان راستہ سے دائیں طرف اور شامی اور امانت راستہ کے بائیں طرف کیکروں میں ہو گئے اور کیپٹن تنویر نے ابراہیم کے ہاتھ سے یاک کی رسی چھین کر جلدی سے دوسرے یاک کی دُم سے باندھی اور ایک ریوالور اور جو بھرا ہوا تھا، ابراہیم کے ہاتھ میں تھما دیا

اور پھر وہ دونوں بھاگ کر بروق پا سے آگے نکل گئے۔ اب ہر طرف گولیاں چل رہی تھیں اور جنگل گونج رہا تھا۔ یاک بھی ڈر گئے تھے اور بروق پا بھی۔ بروق پا سیدھے راستہ پر سے تیز تیز چل رہا تھا اور دونوں یاک اُس کے پیچھے۔ کیپٹن تنویر اور ابراہیم اب پختہ پتھریلے راستہ پر نہ تھے۔ وہ کیکروں کے جنگل میں اپنے ٹارگٹ تلاش کر رہے تھے۔

بروق پا کے سامنے دو گاڑیاں آئیں اور پھر پلک جھپکنے میں بھک سے اڑ گئیں۔ اُس نے پختہ رستہ چھوڑا اور بائیں طرف کیکروں میں سے ہو کر آگے چلنے لگا۔ یاک اُس کے پیچھے تھے۔ تیز تیز چلتے ہوئے بروق پا نے سوچا، یہ کارروائی کیپٹن تنویر اور ابراہیم کی ہے۔ اُس نے حوصلہ نہ ہارا اور چلتا رہا۔

ایک منٹ بعد گولے پھٹنے لگے۔ ایمونیشن کا ڈپو دھڑ دھڑ جل رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے سارے جنگل میں آتش بازی چھوٹ رہی ہے۔

بارکیں رستہ کے دائیں طرف تھیں۔ دونوں بارکیں دھڑام دھڑام گرنے لگیں اور جلنے لگیں۔ یہ میجر نوری اور سلطان کی کارروائی تھی انہوں نے گرینیڈ پھینکے تھے۔ فوجی اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے اور گولیوں کا نشانہ بن رہے تھے۔

بائیں طرف بنکرز تھے۔ شامی اور امانت وہاں پہنچے تو بنکرز سے فوجی باہر نکل رہے تھے انہوں نے دو دو گرینیڈ پھینکے اور بنکروں سمیت اُن کو بھی تباہ کر دیا۔ اب کمانڈوز کی دونوں پارٹیاں بھارتی فوجیوں کو تلاش کر رہی تھیں۔

جنگل کے سرے پر اور پہاڑ کی اوٹ میں مواصلاتی مرکز تھا۔ اس سے پہلے کہ پیغام بھیجا جائے، کیپٹن تنویر نے اُسے تباہ کر دیا اور پھر اُس کے ساتھ والے دو مکان بھی گرنیڈوں کا نشانہ بن گئے۔ ان میں جو افسر تھے وہ آگ میں جل کر اور ملبہ کے نیچے دب کر پرلوک سدھارے۔ ایمونیشن ڈپو سے اب بھی گولے پھٹ رہے تھے۔

تینوں پارٹیوں نے دو ٹرکوں اور دس بکتر بند گاڑیوں کو تلاش کیا اور اُن کو آگ لگائی۔ پھر وہ سب بھاگ کر پکے پتھریلے راستہ پر آئے اور نوبرا ویلی کی طرف بھاگنے لگے۔ انہوں نے دیکھا بروق پا جوگنگ کرتا ہوا جا رہا ہے اور اُس کے پیچھے اُس کے دو یاک بھی جوگنگ کر رہے ہیں۔ میجر نوری، کیپٹن تنویر، شامی، امانت، سلطان اور ابراہیم بھی بروق پا سے آ کر مل گئے۔

نوبرا ویلی میں

پہاڑوں میں صبح دیر سے ہوتی ہے البتہ شام جلد آ جاتی ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے پہاڑ سورج کا راستہ روک لیتے ہیں اس لیے صبح دیر سے ہوتی ہے۔ شام کو سورج جلد پہاڑوں کی اوٹ میں چلا جاتا ہے تو شام جلدی آ جاتی ہے۔ صبح کے آٹھ بج رہے تھے کہ میجر نوری کا کماٹڈو گروپ نوبرا ویلی میں داخل ہو گیا۔ انہوں نے سیدھا راستہ چھوڑ دیا اور پتھروں میں سے ہو کر درختوں کے ایک جھنڈ میں آ گئے۔ میجر نے سلطان سے کہا کہ وہ انسانوں اور حیوانوں کے پیروں کے نشان مٹا کر واپس آ جائے۔

یہ مناسب جگہ تھی۔ وہ پتھروں پر کمبل بچھا کر سو گئے اور دو بجے بعد دوپہر تک سوئے رہے۔ وہ عام راستہ سے ہٹ کر ایک میل کے فاصلہ پر تھے۔ بروق پا نے تسلی سے کھانا تیار کیا۔ انہوں نے کھانا کھایا، نماز ادا کی اور پھر سو گئے۔ صرف کیپٹن تنویر اور کیپٹن شامی کو ریکی کے لیے کہا گیا اور وہ کسانوں کے لباس میں تو تھے ہی۔ اُسی وقت ریکی کے لیے چل پڑے۔ وہ تین گھنٹے یعنی چار بجے شام سے رات ساتھ بجے تک اِدھر اُدھر گھومتے رہے اور جب رات آئی تو بروق پا اور ابراہیم کو یاکوں کے پاس چھوڑ کر مشن پر روانہ ہو گئے۔ میجر نے بروق پا اور ابراہیم کو بتا دیا کہ اگر وہ دو دن تک واپس نہ آئے تو وہ دونوں اسی راستہ سے واپس جائیں جس راستہ سے آئے ہیں کیونکہ وہ اس راستہ کو بخوبی جانتے تھے۔ انہیں یہ بھی بتا دیا کہ وہ لداخی چرواہوں کے بہروپ میں واپس جائیں گے اور اگر ضرورت پڑے تو وہ یاک فروخت کر سکتے ہیں یا اُن کو کھلا چھوڑ سکتے ہیں۔ یاکوں کے مقابلہ میں جان زیادہ عزیز ہے۔

اُن کی کماٹڈو پارٹی میں نوری، تنویر، شامی، امانت اور سلطان شامل تھے۔

سب سے پہلے انہوں نے ایک ایمونیشن ڈپو کا رخ کیا۔ نوبرا ویلی قسم قسم کے درختوں کی وادی ہے۔ ان درختوں کی آڑ میں وہ آسانی سے ایمونیشن ڈپو کے دروازہ تک آئے تھے۔ دروازہ پر چار سکیورٹی گارڈ اور اُن کا ایک آفیسر کھڑا تھا۔ کماٹڈو پارٹی نے اُن پر فائر کیے اور پھر ڈپو کے اندر گرینیڈ پھینک کر بھاگ اُٹھے۔ ایک قیامت برپا ہو گئی اور ساری چھاؤنی کا رخ اُس ایمونیشن ڈپو کی طرف ہو گیا جو آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ رہا تھا۔

کماٹڈو پارٹی اس ڈپو کے الٹ دوسرے ڈپو کی طرف بڑھی اور پھر اُسے بھی آگ لگا دی

اب دو جوالامکھی پھٹ رہے تھے اور آنکھوں کے سامنے قیامت کا سماں تھا۔

کماٹڈو پارٹی نے اب ہوائی اڈے کا رخ کیا اور وہاں کھڑے ہیلی کاپٹروں کو تباہ کیا جو تعداد میں سولہ تھے اور جن کا نام لاما تھا۔ انڈین فوجیوں کو اب پوری طرح معلوم ہو گیا کہ بڑا حملہ ہوا ہے۔ لیکن اُن کو کچھ نظر نہ آ رہا تھا نہ ہوائی جہاز، نہ ٹینک، نہ جیپیں، نہ فوجی۔ اچانک حملہ سے وہ ذہنی طور پر پریشان ہو گئے تھے۔

کماٹڈو پارٹی نے اب اُن پانچ بنگلوں کا رخ کیا جو سینئر فوجی افسروں کے لیے بنائے گئے تھے۔ پہلا بنگلہ مقفل تھا۔ دوسرے بنگلے کے دروازے پر بھی قفل پڑا تھا۔ جب وہ تیسرے بنگلہ کے دروازہ پر پہنچے تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ کرنل دھنی رام اور اُس کا ذاتی نوکر اندر سے باہر آ رہے ہیں۔ کیپٹن تنویر نے ریوالور کے دو فائر کیے اور کرنل منہ کے بل گر پڑا۔ خادم نے بھاگنا چاہا۔ لیکن وہ کیپٹن شامی کی گولی کا نشانہ بن گیا۔

''مشن پورا ہوا۔ واپس چلو!'' میجر نوری نے کہا اور وہ سب درختوں کی طرف بھاگے۔ لیکن کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت نہ بھاگ سکے۔ اُن کا پیچھا گولیوں نے کیا اور وہ وہیں گر پڑے۔ سلطان کچھ دیر بھاگتا رہا، پھر وہ بھی انڈین فوجیوں کے نرغہ میں آ گیا۔ کیپٹن تنویر بھاگ رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اُس نے بلتی چرواہوں کا چوغا بھی اُتار دیا۔ اس کے باوجود اُسے پسینہ آ رہا تھا۔ وہ سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ آخر پختہ راستہ آ گیا جب وہ پختہ راستہ پر چڑھا تو اُس کے سامنے دو فوجی ہتھیار اُٹھائے اُس پر فائر کرنے والے تھے کہ کیپٹن تنویر نے زمین پر گر کر اُن پر فائر کیا باری باری وہ دونوں نیچے گرے ایک کے بعد دوسرا۔ تنویر نے بھاگ کر اُن کی روسی ساخت کی رائفل اٹھائی۔ یہ رائفل پاکستان میں بھی مشہور ہے اور اسے کلاشنکوف کہا جاتا ہے۔

کیپٹن تنویر نے پختہ راستہ چھوڑ دیا اور درختوں میں سے بھاگنے لگا۔ آخر وہ نوبرا دریا کے کنارے آ گیا جو وادی کے درمیان بہتا ہے۔ اُس نے بھاگنا بند کیا اور دریا کے کنارے آہستہ آہستہ چلنے لگا اُس کا سانس اب درست ہو گیا تھا اور گولے پھٹنے کی دہشت ناک آوازیں پیچھے رہ گئی تھیں وہ ایک گھنٹہ تک دریا کے ساتھ ساتھ درختوں کی اوٹ میں چلتا رہا اور پھر اُس جھنڈ کی طرف آیا جہاں بروق پا اور ابراہیم تھے۔ وہ اُن کے پاس پہنچا تو دونوں کے چہرے کھل اُٹھے۔ وہ کمبل پر بیٹھ گیا اور بولا ''چائے کا ایک کپ۔''

''باقی ساتھی؟'' بروق پا نے آہستہ سے پوچھا۔

''اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شہید ہو گئے۔ اسلام کے لیے جان قربان کر گئے۔''

ابراہیم آگے بڑھ کر اُس سے لپٹ گیا اور رونے لگا۔

''بہادر روتے نہیں ہیں۔'' یہ کہہ کر اُس نے اپنے میلے کچیلے ہاتھ کی پشت سے اُس کے آنسو پونچھے اور اُسے تسلی دینے لگا۔

''چائے پیو اور چلنے کی تیاری کرو۔ وہ لوگ ہمارا پیچھا کریں گے۔'' کیپٹن تنومیر نے کہا۔

''واپس اسی راستہ سے جائیں گے جس راستہ سے آئے تھے یا کسی اور راستہ سے۔'' بروق پا نے چائے بناتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ہم سیاچن گلیشیر کے راستہ سے واپس جائیں گے۔'' کیپٹن تنومیر نے کہا اور ابراہیم کے ایک بار پھر آنسو پونچھنے لگا۔

پرچم بلند ہے

ابراہیم اور بروق پا بے حد غمگین تھے۔ اُن کے چار ساتھی میجر نوری، کیپٹن شامی، کیپٹن امانت اور سلطان شہید ہو گئے تھے۔ شہادت بہت بڑا اعزاز تھا لیکن یہ بات نہ ابراہیم کی سمجھ میں آ رہی تھی اور نہ ہی بروق پا شہادت کی عظمت سے پوری طرح واقف تھا۔ وہ دونوں سہم گئے تھے وہ سوچ رہے تھے کہ اگر میجر نوری اور اس کے بہادر ساتھی اللہ کو پیارے ہو سکتے ہیں تو وہ دونوں یقیناً واپس نہیں چلو نہ جا سکیں گے۔ موت اب اُن کے لیے یقینی بات ہے۔ جب چاروں طرف موت ہی موت نظر آئے تو سیدھے سادے آدمی موت کی آہٹ سننے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کیپٹن تنومیر نے اُن کو حوصلہ دیا لیکن وہ بے حوصلہ ہو چکے تھے۔ وہ اپنے گھروں سے بہت دور، دشمن کے نرغہ میں تھے۔ انڈین آرمی کے عام دستے اور کمانڈو دستے اُن کی تلاش میں ہوں گے۔ اُن دونوں نے سوچا۔

بروق پا نے چائے تیار کی اور ایک ایک پیالہ کیپٹن تنومیر اور ابراہیم کے ہاتھ میں تھما دیا۔ وہ خود بھی چائے پینے لگا۔ تنومیر نے گھڑی دیکھی۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ صبح ہونے میں آٹھ گھنٹے باقی تھے۔ پہاڑوں میں صبح کی سفیدی دیر سے داخل ہوتی ہے۔ سردی خوب تھی۔ اس کی

ایک وجہ نوبرا وادی کے درخت تھے اور دوسری وجہ نوبرا دریا کا پانی، تیسری وجہ سردیوں کا موسم۔

وہ تینوں کندھے سے کندھا جوڑ کر بیٹھے ہوئے تھے۔ آسمان صاف تھا۔ اس لیے چاند کی کرنیں شاخوں سے چھن چھن کر اُن کے چہروں کے خدوخال روشن کر رہی تھیں۔ یہ چہرے افسردہ تھے اور اُن پر پریشانی کی تحریریں تھیں۔

''گھبرائیے نہیں اس لیے کہ مسلمان گھبراتا نہیں۔'' کیپٹن تنومیر نے اُن دونوں سے کہا۔

''نہیں ہم گھبرائے ہوئے نہیں ہیں سر۔'' ابراہیم نے حوصلہ سے کہا۔

''آپ دونوں گھبرائے ہوئے ہیں۔ آپ دونوں کو میں ایک سچی کہانی سناتا ہوں آپ یقیناً اُسے پسند کریں گے کیونکہ یہ کہانی دنیا کے سب سے پہلے کمانڈو جرنیل حضرت خالد بن ولید کے بارے میں ہے۔ حضرت خالد بن ولید پہلے مشرک تھے پھر وہ اسلام لے آئے اور حضور نبی اکرمؐ کے سپاہی بن گئے انہیں ہجرت کے بعد مکہ سے مدینہ آئے ہوئے ابھی دو ماہ ہوئے تھے کہ اُن کو ملک شام میں ایک لڑائی میں حصہ لینے کی سعادت نصیب ہوئی۔ اس لڑائی کو جس میں وہ شریک ہوئے، موتہ کی لڑائی کہا جاتا ہے۔ موتہ شام کا ایک گاؤں ہے۔

ملک شام پر اُس زمانہ میں عربوں کی حکومت نہ تھی، رومیوں کی تھی البتہ شام میں عرب بھی تھے لیکن یہ عرب مسلمان نہ تھے عیسائی تھے۔ جس قبیلے کی ملک شام میں اکثریت تھی اُس کو غسان کہا جاتا ہے اور اُس کا سردار شرجیل تھا۔ حضور نبی اکرمؐ کے سفیر حارث بن عمیر کو شرجیل نے قتل کر دیا۔ حضرت حارث بن عمیر کو حضور نبی اکرمؐ نے شام کے رومی گورنر کے پاس خط دے کر بھیجا تھا۔ مسلمان سفیر کا قتل جرم تھا اس لیے مجرم شرجیل کو سزا دینے کے لیے حضور نبی اکرمؐ نے تین ہزار مجاہدوں کا دستہ ملک شام کی طرف روانہ کیا۔ اس دستہ کے کمانڈر حضرت زید بن حارث تھے۔ حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا کہ اگر حضرت زید لڑتے ہوئے شہید ہو جائیں تو ان کی جگہ حضرت جعفر بن ابی طالب کمانڈر ہوں گے۔ اگر حضرت جعفر بن ابی طالب لڑتے ہوئے شہید ہو جائیں تو اُن کی جگہ حضرت عبداللہ بن رواحہ کمانڈر ہوں گے۔

مسلمان پہلے شرق اُردن کے علاقہ بلقا میں آئے لیکن اُن کے خیال میں یہ جگہ لڑائی کے لیے مناسب نہ تھی چنانچہ وہ وہاں سے چل کر شام کے گاؤں موتہ میں آ گئے اور لڑائی کی تیاری شروع کی۔ مسلمانوں کے مقابلہ میں تیس ہزار عیسائی عرب تھے جن کے سردار کا نام مالک بن

زلیفا تھا۔ گویا تین ہزار مسلمان تیس ہزار عیسائیوں کا مقابلہ کرر ہے تھے۔ ایک مسلمان کے مقابلہ میں دس عیسائی تھے لیکن مسلمان گھبرائے ہوئے نہیں تھے۔

لڑائی شروع ہوئی تو پرچم حضرت زید کے ہاتھ میں تھا کیونکہ وہ کماغڈر تھے۔ لڑائی کی شدت میں حضرت زید شہید ہو گئے تو حضور نبی اکرمؐ کے حکم کے مطابق پرچم حضرت جعفر بن ابی طالب نے سنبھال لیا۔ لڑتے لڑتے ان کا دایاں بازو کٹ گیا تو انہوں نے پرچم بائیں بازو میں تھام لیا۔ بایاں بازو کٹ گیا تو انہوں نے پرچم گود میں لے لیا آخر وہ شہید ہو گئے اور پرچم حضرت عبداللہ بن رواحہ نے تھام لیا۔ جب وہ شہید ہو گئے تو پرچم حضرت ثابت بن ارقم نے اُٹھا لیا اور حضرت خالد بن ولید کو پیش کیا۔ حضرت خالد نے اس پیشکش کو قبول نہ کیا اور حضرت ثاقب بن ارقم سے کہا کہ وہی پرچم کے اہل ہیں یعنی وہی کماغڈر بننے کے لائق ہیں۔ لیکن حضرت ثاقب بن ارقم نے حضرت خالد سے اتفاق نہ کیا اور بولے۔

''میں اس علم کا اہل نہیں ہوں۔ اس کے اہل صرف اور صرف آپ ہیں پھر وہ مسلمانوں سے مخاطب ہوئے اور بولے ''اے مسلمانو! تم لوگ خالد بن ولیدؓ کی کمان پر اتفاق کر لو'' چنانچہ سب نے حضرت خالد بن ولیدؓ کی کمان پر اتفاق کیا اور حضرت خالد جھنڈا ہاتھ میں لے کر لڑنے لگے۔

دیکھتے ہی دیکھتے میدان جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ اسی دوران میں قطبہ بن قتادہ اور عیسائی لشکر کے سردار مالک کا دُوبدو مقابلہ ہوا اور مالک مارا گیا۔ عیسائی لشکر گھبرا گیا اور لڑتے ہوئے پیچھے ہٹنے لگا تا کہ وہ دوبارہ منظّم ہو سکے۔

اس وقت تک حضرت خالد بن ولید کے ہاتھ میں دسویں تلوار تھی۔ اُس روز لڑائی کی شدت کا اندازہ یوں ہوسکتا ہے کہ اُس روز لڑتے ہوئے حضرت خالدؓ کے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹی تھیں۔ بہرحال عیسائی پیچھے ہٹ گئے تو حضرت خالدؓ نے مسلمانوں کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ اس وقت تک بارہ مسلمان شہید ہو گئے تھے اور عیسائی مقتولین کا اندازہ نہ تھا۔ ظاہر ہے ان کی تعداد کئی گنا زیادہ ہوگی۔

مزید لڑائی کا فائدہ نہ تھا۔ عیسائی پیچھے ہٹ گئے تھے۔ اُن کی تعداد بھی بہت زیادہ تھی۔ مسلمان اپنے ملک سے باہر تھے اس لیے حضرت خالدؓ نے حکم دیا کہ واپس مدینہ چلتے ہیں۔ جب حضرت خالدؓ اور اُن کے ساتھی واپس مدینہ آئے تو حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا ''خالد اللہ کی

تلوار ہیں'' تب سے اُن کو حضرت خالد سیف اللہ کہا جاتا ہے۔

یہ سچا تاریخی واقعہ بروق پا اور ابراہیم نے پہلے کب سنا تھا۔ اب جو سنا تو اُن کی افسردگی اور پریشانی دور ہو گئی اور اُن کے دل ایک بار پھر عزم اور ولولہ سے دھڑکنے لگے۔ مسلمان مجاہدوں کے کارنامے ہمیشہ بلند حوصلگی کا سبب بنے ہیں۔ مرد ہو یا عورت، بچہ ہو یا بوڑھا، اسلامی تاریخ کے ایمان افروز واقعات سن کر یا پڑھ کر اثر لیے بغیر نہیں رہتا۔

''ہمیں اب اس جگہ سے چلنا چاہیے، خطرہ اب پہلے سے زیادہ ہے۔'' بروق پا نے کہا۔

''خطرہ پہلے بھی تھا اب بھی ہے۔ اب زیادہ ہے یا پہلے زیادہ تھا، مجھے معلوم نہیں۔ لیکن ہمیں خطرہ سے گھبرانا نہیں ہے۔ خطرہ کے لیے خطرہ بننا ہے۔'' کیپٹن تنویر ایک خاص عزم سے بولا۔

''خطرہ کے لیے بننا ہے'' تنویر کے یہ الفاظ بروق پا اور ابراہیم کے کانوں میں گونجنے لگے۔ وہ کیسے؟ یہ اُن دونوں کو معلوم نہ تھا۔

''سر، ہم خطرہ کے لیے خطرہ کیسے بن سکتے ہیں؟'' ابراہیم نے پوچھا۔

''وہ یوں کہ ہم موت کے لیے موت بن جائیں۔ ہمیں خطرہ موت سے ہے تو کیوں نہ ہم موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر موت کا مقابلہ کریں اور اُسے مات دیں۔'' کیپٹن نے اُسی عزم سے کہا۔

''یہ کیوں کر ہوسکتا ہے؟'' اب بروق پا بولا۔

''وہ یوں کہ میں واپس جاتا ہوں اور میجر نوری، کیپٹن شامی، کیپٹن امانت اور سلطان کا پتہ کرتا ہوں۔'' تنویر نے کہا۔

''اگر وہ زندہ ہوتے تو آ جاتے، وہ تو شہید ہو گئے ہوں گے۔'' بروق پا نے افسردہ ہو کر کہا۔

''میرا بھی یہی خیال ہے کہ وہ چاروں شہید ہو گئے ہیں لیکن مجھے یقین نہیں ہے۔ یقین تب ہوگا جب میں اُن کو یا اُن کی لاشوں کو دیکھ پاؤں گا۔'' تنویر نے کہا۔

''اب واپس جانا آپ کے لیے خطرہ سے خالی نہیں ہے۔'' ابراہیم نے خطرہ کا اظہار کیا۔

''یہ میں بھی جانتا ہوں کہ انڈین آرمی کے سبھی افسر اور جوان ختم نہیں ہوئے وہ یقیناً ہمیں تلاش کر رہے ہوں گے۔ لیکن اُن کے خطرہ کو قبول کرنا ضروری ہے۔ اگر ہم اپنے

ساتھیوں کا پتہ کیے بغیر چلے گئے تو مجھے ساری عمر افسوس رہے گا، اس لیے میں چاہتا ہوں میں واپس جاؤں اور پتہ کر کے دو گھنٹے تک واپس آ جاؤں۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ مجھے ایک بجے تک واپس آ نا ہو گا۔ اگر میں ایک بجے تک واپس نہ آؤں تو واپس چلے جائیں اُسی راستہ سے جس راستہ سے آئے تھے۔ کیونکہ واپسی کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔''

وہ دونوں خاموش رہے اور کیپٹن تنویر چائے کا پیالہ رکھ کر اپنا گولی سکہ چیک کرنے لگا۔ اس کے بعد اُس نے دونوں سے مصافحہ کیا باری باری اور درختوں کی اوٹ میں گم ہو گیا۔ دور وادی نوبرا کے مرکز میں گولے پھٹنے کی آوازیں اب بھی ابھر رہی تھیں۔

''کیپٹن تنویر جیسے جوان جس لشکر میں ہوں گے وہ کبھی شکست نہیں کھا سکتا۔ ایسے لشکر کا پرچم ہمیشہ اونچا رہتا ہے ابراہیم۔'' بروق پاعزم سے بولا۔

اُس کی افسردگی اور پریشانی دور ہو چکی تھی اور وہ خود کو جوان محسوس کر رہا تھا۔

''آپ نے ٹھیک کہا چاچا۔'' ابراہیم بولا۔

''میں آپ کے باپ سے بڑا ہوں بچے۔ اس لیے تمہارا چاچا نہیں ہوں تایا ہوں۔''

''ٹھیک ہے تایا جی'' ابراہیم نے کہا اور پیالے سنبھالنے لگا۔

دو ساتھی

کیپٹن تنویر جس راستہ سے آیا تھا وہ کوئی باقاعدہ راستہ نہ تھا۔ وہ دریائے نوبرا کے بائیں کنارے درختوں کی آڑ میں چلنے لگا۔ وہ جوں جوں چھاؤنی کے گوداموں اور بارکوں کی طرف بڑھ رہا تھا، تاریکی روشنی میں ڈھل رہی تھی۔ کچھ ڈپو اور گودام اب بھی جل رہے تھے۔ کبھی کبھار گولے بھی پھٹتے تھے اور اُن کے شعلے ماحول کو روشن کر دیتے۔ ایسی صورت میں وہ درخت کی اوٹ میں ہو جاتا تاہم اُس نے نائٹ ویژن گوگلز پہنے ہوئے تھے چنانچہ راستہ تلاش کرنے میں اُسے دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ وہ احتیاط سے آگے بڑھتا رہا۔ اُس کے قدم اُس وقت رُکے جب اُس کے سامنے انڈین آرمی کے ایک جوان کی لاش نظر آئی۔ یہ ایک کپتان کی لاش تھی جس کا سر گولیوں کی بوچھاڑ سے کرچی کرچی ہو چکا تھا۔ تنویر نے اُس کا کوٹ اتارا جو صاف تھا۔ کوٹ پہن کر وہ آگے بڑھا تو اُسے کیپٹن شامی اور کیپٹن امانت کی

لاشیں دکھائی دیں۔ وہ دونوں چرواہوں کے لباس میں تھے۔ تنویر نے فاتحہ پڑھی اور پھر سیدھے کھڑے ہو کر اُن کو فوجی سلام کیا۔

فوجی سلام کے بعد اُس نے پہلے کیپٹن شامی کی میت کو اٹھایا اور دریائے نوبرا کے کنارے پر ڈالا۔ اس کے بعد کیپٹن امانت کی میت کو کیپٹن شامی کے برابر لٹا دیا۔ پھر کمبل اتار کر اُن پر ڈالا اور واپس اُسی جگہ آ گیا جہاں اُن کی لاشیں ملی تھیں۔ اب وہ سلطان کی لاش تلاش کرنے لگا۔ اُسے سلطان کچھ دور جھنڈ میں ملا۔ سلطان کا جسم گرم تھا اور وہ سانس لے رہا تھا۔ کیپٹن تنویر نے اُسے اٹھایا اور بارکوں کی طرف چل دیا۔ انڈین آرمی کے جوان مورچہ بند تھے۔ وہ جب اُن کی طرف بڑھا تو ایک گونج دار آواز آئی۔

''ہالٹ!''

وہ کھڑا ہو گیا۔ دو فوجی جوان بھاگ کر اُس کی طرف آئے۔ اس سے پہلے کہ وہ سوال کرتے کیپٹن تنویر نے بلند آواز سے کہا۔

''ڈاکٹر کہاں ہے؟ اُسے بلاؤ۔''

''سر، وہ زخمیوں کا علاج کر رہا ہے۔ وہ نہیں آ سکتا سر۔'' ایک جوان بولا۔

''آل رائٹ، اٹھاؤ اسے اور لے چلو ڈاکٹر کے پاس۔'' تنویر نے حکم دیا۔

دونوں جوانوں نے اپنے اپنے پستول تنویر کو دیئے اور خود سلطان کو اٹھا کر اُس طرف چل دیئے جہاں ڈاکٹر زخمی فوجیوں کا علاج کر رہا تھا۔

''یہ انٹیلی جنس کا افسر ہے، مر رہا ہے۔ اس کا علاج کرو ڈاکٹر، باقی سب کا علاج بعد میں ہو گا۔''

ڈاکٹر نے عینک ناک پر درست کی، تنویر کو گھور کر دیکھا اور پھر فرش پر بے سدھ پڑے سلطان کو چیک کرنے لگا۔ دونوں گولیاں سلطان کے بائیں کندھے میں پیوست تھیں۔ ڈاکٹر نے دونوں گولیوں کو نکالا، دوائی لگائی جس سے خون بند ہو گیا اس کے بعد پٹی کی اور بولا:

''زیادہ خون بہنے سے اور خوف سے بے ہوش ہو گیا ہے۔ ایک دو گھنٹے کے بعد ہوش میں آ جائے گا۔''

''تھینک یو ڈاکٹر'' تنویر نے کہا اور پھر اُن دونوں جوانوں سے مخاطب ہوا جو سلطان کو

اُٹھا کر لائے تھے۔

''اسے اٹھا کر ایسی جگہ لے چلو جہاں اسے چارپائی مل جائے اور اسے لٹایا جا سکے۔''

''اسے مندر میں لیے چلتے ہیں۔'' ایک جوان نے دوسرے سے کہا اور وہ دونوں سلطان کو اٹھا کر کمرہ سے باہر آ گئے۔

''کیا یہاں چارپائی نہیں ہے؟'' تنویر نے ایک جوان سے پوچھا۔

''نہیں سر، یہ تو کچا ہسپتال ہے یعنی ابھی ابھی بنا ہے۔ یہاں دوائی دارو لگا کر چھوڑ دیا جاتا ہے۔''

تنویر سمجھ گیا کہ عارضی ہسپتال ہے اس لیے چارپائیوں کا انتظام نہیں ہے۔

''مندر کتنی دُور ہے؟'' تنویر نے پوچھا۔ اُسے ایک دم خیال آیا کہ یہ سوال غلط تھا۔ اگر وہ انڈین آرمی کا افسر ہے تو اُسے معلوم ہونا چاہیے مندر کہاں ہے؟ غلطی چھپانے کے لیے وہ جلدی سے بولا۔

''جلدی کرو جلدی مجھے واپس ڈیوٹی پر جانا ہے۔ دشمن ہمارے سر پر ہے۔''

دونوں جوان جلدی جلدی چلنے لگے۔

سامنے مندر تھا لیکن یہ ہندوؤں کا مندر نہ تھا، بدھ مت کے ماننے والوں کا مندر تھا یعنی عبادت گاہ۔ کیپٹن تنویر نے بھاگ کر دروازہ کھٹکھٹایا، اندر سے ایک ہٹے کٹے لاما نے دروازہ کھولا۔

''یہ جوان زخمی ہے اسے سنبھالو۔'' کیپٹن تنویر نے حکم دیا۔ لاما نے پہلے چوغا سنبھالا اور پھر سلطان کو سنبھالنے لگا۔ تنویر نے دونوں پستول جوانوں کو دیئے اور بولا۔

''تم چلو میں آتا ہوں۔ کوئیک مارچ!''

اور وہ دونوں پستول لے کر بھاگنے لگے اپنے مورچے کی طرف۔

تنویر نے دروازہ بند کیا اور پلٹ کر دیکھا۔ مارخور کی چربی سے جلنے والے چراغ کی روشنی میں لاما اور نن سلطان کو دری پر لٹا رہے تھے۔ چراغ کی دھیمی دھیمی روشنی میں نن یعنی راہبہ کا گورا چٹا رنگ اُس کے چہرے کو سرسوں کا پھول بنا رہا تھا۔

''یہ کون ہے؟ تمہاری بیوی۔ وائف؟'' تنویر نے پوچھا۔

''سر، ہم میاں بیوی نہیں ہیں، بہن بھائی ہیں لیکن سگے نہیں میں مہاتما بدھ کا نوکر ہوں

یہ نوکرانی ہے۔ میں بھکشو ہوں یہ بھکشوانی ہے۔ میں راہب ہوں یہ راہبہ ہے۔'' لاما بول رہا تھا۔

''بس بس ٹھیک ہے۔ سمجھ گیا۔ اسے مرنا نہیں چاہیے۔ اس کے لیے کچھ کرو۔''

وہ دونوں بھاگ کر گئے اور چار پانچ کمبل اُٹھا لائے، کچھ سلطان کے نیچے کچھ اوپر۔

''اسے کچھ کھانے پینے کو دو۔''

کیپٹن تنویر نے کہا اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ باہر گولے پھٹ رہے تھے اور دھماکے گونج رہے تھے۔ وہ پستول ہاتھ میں لیے تباہ شدہ بارکوں اور گوداموں کے درمیان گھومتا رہا۔ اُسے دو جگہ روکا گیا لیکن انڈین آرمی کے کیپٹن کا کوٹ دیکھ کر سلیوٹ مارا گیا اور آگے جانے دیا گیا۔ میجر نوری اُسے کہیں نہ ملا۔ آخر وہ مایوس ہو کر پھر بودھی عبادت گاہ میں آ گیا۔ ایک گھنٹہ کے دوران میں سلطان ہوش میں آ گیا تھا اور کمبل لپیٹے آلتی پالتی مار کر بیٹھا جڑی بوٹیوں کا قہوہ پی رہا تھا۔

کیپٹن تنویر نے اُسے قہوہ پیتے ہوئے دیکھا تو ریوالور تان کر آہستہ سے لاما سے مخاطب ہوا:

''آپ دونوں کوئی ایسی حرکت نہیں کریں گے کہ مجھے گولی چلانا پڑے۔ میں کیپٹن تنویر ہوں اور یہ سلطان ہے۔ ہمارا انڈین آرمی سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ کوٹ میرا نہیں انڈین آرمی کے ایک مرے ہوئے کپتان کا ہے۔ آپ دونوں کا بہت بہت شکریہ۔''

صاحب۔ ہم نے اپنا فرض پورا کیا۔ ہم مہاتما بدھ کے نوکر ہیں اس لیے سب کے نوکر ہیں۔ خدمت میں ہماری فضیلت ہے ہم خوش ہیں کہ آپ مسلمان ہیں۔ ہندو فوج نے ہمیں بہت تکلیفیں دی ہیں۔ ہم یہاں بیس تھے۔ ہمارے اٹھارہ ساتھی فوج سے تنگ آ کر یہاں سے چلے گئے ہیں۔ ان اٹھارہ میں سے دو کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا اور سولہ کو بیگار میں پکڑ لیا گیا۔ وہ اب بھی بیگار میں پکڑے ہوئے ہیں اور اُن سے پتھر کوٹنے اور سڑکیں بنانے کا کام لیا جاتا ہے۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کریں تو اُن کو جان سے مار دیا جاتا ہے۔

''آپ دونوں کو پکڑ کر کیوں نہیں لے گئے؟'' تنویر نے سوال کیا۔

''ہم نے منت کی تھی کہ ہمیں مہاتما بدھ کے مجسمہ کے سامنے عبادت کرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے۔ ہم آپ کے لیے دعا مانگتے رہیں گے تاکہ آپ کو پاکستان کے مقابلہ میں فتح ہو۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم نے انڈین آرمی کے لیے کبھی فتح کی دعا نہیں مانگی، ہمارے دل

سے اُن کے لیے ہمیشہ بددعا نکلی ہے۔''

''بہرحال آپ دونوں کا شکریہ۔ اب ہم جاتے ہیں۔ اٹھو سلطان اُٹھ سکو گے یا سہارا دوں'' تنویر نے سلطان سے پوچھا۔

''میں اُٹھ سکتا ہوں بلکہ چل سکتا ہوں۔'' سلطان اُٹھ کھڑا ہوا۔

''یہ لو پستول، بھرا ہوا ہے۔ اپنی حفاظت کرنا۔'' تنویر نے پستول لاما کی طرف بڑھایا۔

''میں پستول چلانا نہیں جانتا۔ اگر جانتا ہوتا تو انڈین آرمی کے کسی نہ کسی فوجی افسر کا خاتمہ کر دیتا۔'' لاما بولا۔

''ہمیں اپنی جان اور عزت کا خطرہ ہے ہمیں اپنے ساتھ لے چلو۔''

راہبہ نے پہلی بار ہونٹ کھولے اور التجا کی:

''جلدی کرو۔ وقت بہت کم ہے۔'' کیپٹن بولا۔

اُن دونوں نے کمبل سنبھالے اور کیپٹن اور سلطان کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ وہ چاروں عبادت گاہ کی دیوار کے ساتھ ساتھ جھکتے ہوئے جنگل کی طرف قدم اٹھانے لگے۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ دریائے نوبرا کی الٹی طرف کنارے کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ پھر تنویر کنارے سے ہٹ کر درختوں میں سے ہو کر چلنے لگا اور وہ تینوں اُس کے پیچھے پیچھے۔ جب وہ چاروں اُس جگہ پہنچے جہاں تنویر، بروق پا اور ابراہیم کو چھوڑ کر گیا تھا تو وہاں دو کی بجائے اب تین آدمی بیٹھے تھے۔ تیسرا آدمی میجر نوری تھا۔

شکاری

''سر میں نے آپ کے یہ الفاظ سنے تھے..... مشن پورا ہوا۔ واپس چلو..... ان الفاظ کے ساتھ جب آپ بھاگنے لگے اور گولیوں کی بوچھاڑ نے ہمارا پیچھا کیا تو میں اُس طرف بھاگا جس طرف بروق پا اور ابراہیم یاک لے کر گئے تھے۔ درختوں کی اوٹ میں آپ کی ایک جھلک نظر آئی اس کے بعد نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ معلوم نہیں آپ کس طرف نکل گئے۔''

کیپٹن تنویر نے زمین پر بیٹھ کر چائے پیتے ہوئے میجر نوری سے پوچھا۔

''میرے الفاظ غلط تھے۔ نہ مشن پورا ہوا تھا اور نہ ہمیں واپس جانا تھا لیکن یہ مجھے بعد

میں معلوم ہوا کہ میرے الفاظ غلط تھے۔ نوبرا ویلی میں جگہ جگہ اسلحہ کے ڈپو اور گودام ہیں اور جگہ جگہ زمین مورچے ہیں۔ ممکن ہے جس جگہ ہم اس وقت بیٹھے چائے پی رہے ہیں اس کے نیچے کوئی مورچہ ہو یا سرنگ ہو۔ ہم نے ایک کمیونی کیشن سنٹر تباہ کیا تھا لیکن دو چار کمیونی کیشن سنٹر اور بھی ہیں اور سری نگر اور لہہ سے اُن کے ذریعہ اور کمک منگوائی گئی ہے اسی طرح یہاں کئی ہوائی اڈے اور ہیلی پیڈ ہیں جو اب بھی ٹھیک ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ میجر نوری ذرا دیر کے لیے خاموش ہوا تو کیپٹن تنویر بول اُٹھا:

''سر، اب جبکہ آپ نے گھوم پھر کر معلومات اکٹھی کی ہیں اور نوبرا ویلی کی ساری تصویر آپ کے سامنے ہے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟''

''ہمیں ایکشن پلان تیار کرنا ہو گا اور ایکشن پلان کا پہلا عمل یہ ہونا چاہیے کہ ہم نوبرا ویلی کو چھوڑ کر اور پہاڑ کی طرف چلے جائیں اور کسی غار میں بیٹھ کر منصوبہ بندی کریں۔ اگر آج کی رات ہم یہاں ٹھہر گئے تو تمام راستے بند ہو جائیں گے اور ہمیں عام فوجیوں کی طرح لڑنا پڑے گا۔ گویا ہمیں خرغہ میں لے لیا جائے گا اور ہم لڑتے ہوئے ختم ہو جائیں گے۔''

کیپٹن تنویر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔

''ہمیں اجازت دیں ہم اور پہاڑ کی طرف مارچ کرتے ہیں۔''

''چلیے!'' میجر نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

''صاحب، میں نوبرا ویلی سے باہر جانے کا ایک ایسا راستہ جانتا ہوں جو عام راستہ نہیں ہے، آپ میرے پیچھے چلیں۔'' لاما نے کہا اور آگے آگے چل پڑا۔ اُس کے پیچھے راہبہ تھی پھر کیپٹن تنویر، سلطان، بروق پا، دو یاک، پھر ابراہیم اور آخر میں میجر نوری۔ وہ ساتوں قطار میں چلنے لگے۔ جب صبح کے پانچ بجے اور پرندوں نے چہچہانا شروع کیا تو وہ نوبرا ویلی سے نکل چکے تھے۔ ٹھیک چھ بجے وہ ایک نالہ عبور کر کے ایک چھوٹی سی عبادت گاہ میں داخل ہوئے۔ یہاں صرف دو کمرے تھے، ایک بڑا کمرہ جس میں پتھر کا بنا ہوا مہاتما بدھ کا بت تھا اور دوسرا چھوٹا کمرہ جو غالباً عبادت گاہ کی دیکھ بھال کرنے والے راہب کا تھا لیکن وہاں راہب نہ تھا۔

ابراہیم اور بروق پا نے یاکوں پر سے سامان اتارا اور اُن کو نالہ کی طرف ہانک دیا تاکہ وہ برف وغیرہ کھا کر پیٹ بھر سکیں۔ یاک برف کھا کر پیٹ بھر سکتے ہیں۔ بعض اوقات وہ برف

کے نیچے سے گھاس پھوس تلاش کر کے پیٹ پوجا کر لیتے ہیں۔ وہ درختوں کی چھال چبا کر بھی بھوک مٹا لیتے ہیں۔ لیکن وہاں برف کی وجہ سے درخت نہ تھے اور نہ ہی جھاڑیاں تھیں۔ وہ جس جگہ آ گئے تھے وہاں سے سنو لائن شروع ہوئی تھی یعنی وہ ساڑھے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور اُن کے چاروں طرف پہاڑ اور کھڈ برف سے اٹے ہوئے تھے۔ تھکاوٹ کی وجہ سے جلد ہی اُن پر نیند نے غلبہ پا لیا لیکن سونے سے پہلے کیپٹن تنویر نے لاما اور راہبہ سے کہا کہ وہ پہرہ دیں گے اور اگر اُن کو شبہ پیدا ہو کہ کوئی آ رہا ہے تو اُن کو جگا دیں۔

عبادت گاہ اس طرح بنائی گئی تھی کہ سب سے پہلے چھوٹا کمرہ تھا اور پھر اُس کے بعد صحن اور صحن کے بعد بڑا کمرہ جس میں مہاتما بدھ کا بت تھا۔ سارا سامان اور کماغڈو پارٹی بڑے کمرے میں مہاتما بدھ کے بت کے قدموں میں کمبل بچھا کر اور کمبل اوڑھ کر سوئے ہوئے تھے۔ بڑے کمرے میں ایک کونہ میں چوبی کھڑکی تھی جو باہر کھلتی تھی اور کمرے کی صفائی کے بعد کوڑا کرکٹ پھینکنے کے لیے کام آتی تھی۔ لاما اور راہبہ پہلے کمرے میں تھے۔ وہ وہاں سے نو برا وادی کو جانے والی پگڈنڈی پر نگاہ رکھ سکتے تھے۔

دوپہر سے پہلے گیارہ بجے تک لاما اور راہبہ دونوں پہرہ دیتے رہے۔ پھر راہبہ کو نیند آ گئی اور وہ اُسی کمرہ میں کمبل لپیٹ کر فرش پر سو گئی۔ لاما اُٹھا اور کمرہ سے باہر آ گیا۔ سورج کی کرنوں میں برف چاندی کی طرح چمک رہی تھی اور دونوں یاک نیچے کھڈ میں برف میں چُگ رہے تھے۔ لاما ایک گھنٹہ تک اُن کو برف میں چگتے دیکھتا رہا اور پھر اردگرد کا جائزہ لینے لگا۔ اُس کے مشرق میں وادی نو برا تھی جو حد نگاہ سے دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اُس کے مغرب میں برف پوش پہاڑوں کا سلسلہ تھا اور ان پہاڑوں کے اوپر سیاچن گلیشیر شروع ہوتا تھا۔ شمال میں بھی برف پوش پہاڑ تھے جن کے اُس پار تبت کا علاقہ تھا۔ جنوب میں لداخ امیریا تھا اور جہاں لداخ ختم ہوتا تھا۔ بلتستان شروع ہو جاتا تھا۔ وہ واپس آیا تو راہبہ جاگ اُٹھی۔ کماغڈو پارٹی ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔

''اب تم سو جاؤ میں جاگتی ہوں۔'' راہبہ نے کہا۔ اُس کی عمر بمشکل بیس اکیس سال ہو گی اُس کا قد ساڑھے پانچ فٹ تھا اور بال سنہرے تھے۔ محسوس ہوتا تھا وہ منگول شہزادی ہے جو کسی محل سے نکل کر پہاڑوں میں بھٹک رہی ہے۔

لاما نے راہبہ کا کمبل اوڑھا اور فرش پر لیٹ گیا۔ راہبہ باہر نکل کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی اور پہاڑوں اور یاکوں کو دیکھنے لگی۔

ایک بجے کے قریب راہبہ نے فائر کی آواز سُنی اور پھر ایک یاک کو گرتے ہوئے دیکھا دوسرا یاک اُس کے دیکھتے دیکھتے ڈر کر ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چلا گیا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ سہم کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اُسے کچھ دیر تک کچھ نظر نہ آیا۔ البتہ گولی چلنے کی آواز پہاڑوں میں گونجتی سنائی دیتی رہی۔ پھر اس کی نگاہ پانچ شکاریوں پر پڑی جو رائفلیں تانے پگڈنڈی پر اُس کی طرف آ رہے تھے مارے خوف کے اُس کے پیر شل ہو گئے اور وہ کانپنے لگی۔

گولی کی آواز لاما کے کانوں میں بھی پڑی تھی اور وہ اُٹھ بیٹھا تھا لیکن اس کے بعد اُس نے گولی کی آواز نہ سنی۔ وہ سمجھنے لگا کہ اُس نے خواب دیکھا ہے۔ لیکن جب پتھروں پر بھاری بوٹوں کی آواز اور راہبہ کی چیخ اُس کے کانوں کے پردوں سے ٹکرائی تو وہ بھاگا لیکن وہ شکاریوں اور عبادت گاہ کا درمیانی فاصلہ طے نہ کر سکا۔ ایک شکاری کی گولی اُس کا سینہ چیر گئی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ روتے ہوئے راہبہ اُس سے لپٹ گئی اور ''بھائی میرا بھائی'' پکارنے لگی۔

ایک شکاری نے زور سے اُسے بازو سے پکڑا اور گھسیٹتا ہوا اُس کمرہ کی طرف چلا جہاں چند سیکنڈ پہلے لاما سویا ہوا تھا۔ دو شکاریوں نے لاما کو بازوؤں اور ٹانگوں سے پکڑا اور اُٹھا کر کھڈ کی طرف اچھال دیا۔ پھر وہ دونوں چھوٹے کمرے کی طرف چل دیئے۔

کیپٹن بڑے کمرے کی چوبی کھڑکی سے کودا اور عبادت گاہ کا چکر کاٹ کر اُس طرف آیا جس طرف سے پانچوں شکاری چھوٹے کمرہ میں داخل ہوئے تھے، کمرہ کا دروازہ کھلا تھا، دو شکاری پشت دروازہ کی طرف کھڑے تھے۔ کیپٹن تنویر نے یکے بعد دیگرے نشانہ لیا اور دونوں شکاری گولیوں کے زور میں آگے کی طرف گرے اور اُن کی پشتوں سے لہو کی دھاریں روانہ ہوئیں۔ آنگن کی طرف سے میجر نوری نے فائر کیا اور تیسرا شکاری نیچے دھپ سے گرا تھا۔ چوتھا شکاری تنویر کی گولی سینے پر کھا کر لڑکھڑا رہا تھا۔ پانچویں شکاری نے جان بچانے کے لیے رائفل پھینک کر ہاتھ کھڑے کر دیئے تھے۔ یہی وہی شکاری تھا جس نے راہبہ کو بازو سے پکڑ

کر گھسیٹا تھا وہ کمرہ کے درمیان بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی اور خوفزدہ تھی۔ اُس کے لمبے چوغا نما فراک اور شلوار پر مرنے والوں کے خون کے دھبے تھے۔ میجر نوری نے آگے بڑھ کر ایک رائفل اٹھائی اور اُس کے بٹ سے کھڑے ہوئے شکاری کے کندھے پر زوردار ضرب لگائی وہ نیچے گر پڑا اور چلانے لگا۔

''ابراہیم رسی لاؤ۔'' تنویر نے کہا اور شکاری کی پسلی پر ٹھڈا مارا وہ اور چلّایا۔

ابراہیم نے رسی سے شکاری کے دونوں پاؤں باندھ دیئے۔

''بروق پا اور تم، ان لاشوں کو اٹھا کر کھڈ میں پھینکو اور اس کمرہ کو صاف کرو۔'' کیپٹن تنویر نے ابراہیم سے کہا۔ میجر نوری شکاری کو اور کیپٹن تنویر راہبہ کو لے کر بڑے کمرہ میں آ گئے۔ سلطان پہلے سے اُس کمرہ میں تھا۔

وہ پانچوں شکاری نہیں تھے، انڈین آرمی کے کمانڈو تھے۔ کیپٹن کشن کمار، لیفٹیننٹ بیلی رام، صوبیدار وجے کمار، سپاہی سکھن اور سپاہی وریام۔ اب صرف کیپٹن کشن کمار زندہ تھا۔ صرف کیپٹن کشن کمار وردی میں تھا، باقی سب شکاریوں کے لباس میں تھے۔ البتہ کیپٹن کشن کمار نے بھی ایک لمبا گرم چوغا پہن رکھا تھا جو اس کی سالم وردی کو چھپائے ہوئے تھا۔

جب بروق پا اور ابراہیم چاروں کی لاشوں کو کھڈ میں گرا کر اوپر کمرہ صاف کر کے واپس آئے تو کیپٹن تنویر نے ان سے کہا کہ وہ یاک کو ہانک کر لائیں۔ دو گھنٹے کے بعد وہ ایک یاک کو ہانک کر لے آئے اور دوسرے کے متعلق بتایا کہ وہ شکاریوں کی گولیوں سے مر چکا ہے۔

گولی ایک چلائی گئی تھی لیکن وہ گولی یاک کا دل چیر گئی اس لیے وہ مر گیا۔ میجر نوری بولا۔

راہبہ اور بروق پا نے مل کر چائے تیار کی اور انہوں نے ہنٹر بیف اور ستو کے ساتھ چائے تیار کی۔ کیپٹن کشن کمار نے صرف چائے پی، نہ ہنٹر بیف کھایا اور نہ ستو پیئے۔ کیپٹن کشن کمار کی گرفتاری پر سب خوش تھے۔ غالباً سب سے زیادہ خوشی راہبہ کو تھی کیونکہ کیپٹن کشن کمار نے اُس کے منہ بولے بھائی کو جان سے مارا تھا اور اُس کی توہین کی تھی۔ اُس کی آنکھوں کی چمک صاف بتا رہی تھی کہ وہ بہت خوش ہے۔ کیپٹن تنویر نے اُسے اپنی گرم قمیض، گرم شلوار، گرم جیکٹ اور گرم ٹوپی دی تھی تا کہ وہ اپنے خون آلود کپڑے تبدیل کر لے اور گرم ٹوپی سے اپنے سر کو سردی سے بچا سکے۔ یہ کپڑے اور ٹوپی پہن کر وہ اور خوبصورت لگتی تھی۔

کیپٹن کشن کمار نے دن کو کچھ نہ بتایا کیونکہ دن کو اُس سے کچھ نہ پوچھا گیا۔ البتہ کشن کمار کی وجہ سے میجر نوری اور کیپٹن تنویر میں جھگڑا ضرور ہوا۔ کیپٹن تنویر چاہتا تھا کہ کیپٹن کشن کمار کو گولی مار کر ہلاک کر دیا جائے کیونکہ اُس نے لاما کو قتل کیا تھا اور راہبہ کی بے عزتی کی تھی لیکن میجر نوری کہتا تھا کہ لاما اور راہبہ ہماری پارٹی کے باقاعدہ رکن نہیں ہیں اور پھر لاما کے بجائے ہم چار ہندوستانی فوجیوں کی جان لے چکے ہیں۔ یاد رہے کہ بروق پا، سلطان ابراہیم اور راہبہ بھی کیپٹن کشن کمار کی جان لینے کے حق میں تھے۔

رات کو میجر نے کیپٹن کو کھانا کھلایا اور چائے پلوائی اور پھر اُسے لیکر چھوٹے کمرہ میں پوچھ گچھ کرتا رہا۔ پوچھ گچھ کے دوران میجر نوری کو جو معلومات حاصل ہوئیں وہ کوئی نئی نہیں تھیں۔ وہ معلومات وہی تھیں جو میجر نوری کیپٹن تنویر اور دوسرے ساتھیوں کو بتا چکا تھا۔ گویا کیپٹن کشن کمار کی باتوں نے میجر نوری کی تصدیق کر دی۔

اب طے تھا کہ میجر نوری کی کمانڈو پارٹی وادی نوبرا میں انڈین آرمی کی طاقت کو نقصان پہنچانے سے قاصر ہے۔ اب ہر چیز واضح تھی نوبرا ویلی کا راستہ انتہائی خطرناک تھا۔ اس راستہ سے جانا موت کو للکارنا تھا۔ دوسرا راستہ سیاچن گلیشیر کا تھا لیکن سیاچن پار کرنا جان جوکھوں کا کام تھا۔ البتہ ہیلی کاپٹر مل جاتا تو اُس کے ذریعہ سیاچن گلیشیر کسی نہ کسی طرح پار کیا جا سکتا تھا۔

کیپٹن کشن کمار کو کمبل دے کر چھوٹے کمرہ میں بند کر دیا گیا تھا اور وہ سب کمرے میں بیٹھے سوچ رہے تھے کہ اب کیا کیا جائے۔ اسی ادھیڑ بن میں آدھی رات ہو گئی۔ میجر نوری نے بروق پا کو پہرہ پر بٹھایا اور باقی سب لوگ کمبل اوڑھ کر فرش پر سو گئے۔ یاک عبادت گاہ سے باہر ایک پتھر سے باندھ دیا گیا کہ کہیں بھاگ نہ جائے۔ اگر وہ بھاگ گیا تو سامان کون اٹھائے گا۔

رات دو بجے چھوٹے کمرہ کا دروازہ کھٹکھٹانے کی آوازیں آنے لگیں۔ کمرہ سے کسی کے شور مچانے کی آواز آئی۔ پھر باہر سے دروازہ کھلا۔ بروق پا نے بھاگ کر میجر نوری اور کیپٹن تنویر کو جگایا کہ انڈین آرمی نے حملہ کر دیا ہے۔ میجر نوری نے بڑے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا اور اُن سب کو کمرہ خالی کرنے کا حکم دیا۔ وہ سب کھڑکی سے باہر کود ے۔ راہبہ سلطان اور بروق پا کو لے کر کھائی کی طرف چل پڑی۔ میجر نوری، کیپٹن تنویر اور ابراہیم انڈین آرمی

کے دستہ سے مقابلہ کرنے کے لیے عبادت گاہ کے سامنے آئے لیکن کوئی بھی نہ تھا۔ چھوٹے کمرہ کا باہر کا دروازہ اور اندر کا دروازہ چوپٹ کھلے تھے۔ انڈین آرمی کے دس جوان صحن میں کھڑے تھے۔ کیپٹن کشن کمار بڑے کمرے کا دروازہ توڑ رہا تھا اور اُس کا ساتھ ایک اور افسر دے رہا تھا جو دستہ لے کر آیا تھا۔

کیپٹن تنویر پتھروں کو پکڑ کر چھوٹے کمرہ کی چھت پر چڑھا اور اُس نے صحن میں کھڑے بارہ فوجیوں پر مشتمل دستہ پر برین گن سے فائر کھول دیا۔ میجر نوری اور ابراہیم چھوٹے کمرے میں داخل ہو کر اُن پر فائر کرنے لگے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر لڑائی بند ہوگئی۔ یہ لڑائی یکطرفہ تھی۔ کیونکہ انڈین آرمی کو سنبھلنے کا موقع نہ ملا۔

اُن تینوں نے لاشوں کو وہیں چھوڑا، اُن کا اسلحہ اور ہتھیار سمیٹے اور باہر کھڑے یاک پر لاد کر اُس طرف چل پڑے جس طرف راہبہ بروق پا اور سلطان کو لے کر گئی تھی۔ ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ تینوں اُن تینوں سے مل گئے لیکن انہوں نے سفر قطع نہ کیا۔ وہ کھائی عبور کر کے پہاڑ کی بلندی کی طرف آہستہ آہستہ چل پڑے۔ جب سورج طلوع ہوا تو میجر نوری نے حکم دیا کہ کسی مناسب جگہ سر چھپایا جائے۔ چنانچہ کسی غار کی تلاش شروع ہوئی۔ آخر ایک غار مل گیا یہ غار اتنا بڑا تھا کہ انسان تو کجا اس کے اندر حیوان بھی کھڑے ہو سکتے تھے چنانچہ کماغڈو پارٹی کے علاوہ ان کے یاک کو بھی اس میں پناہ مل گئی۔

ان کے جسم پھوڑے کی طرح دُکھ رہے تھے چنانچہ وہ کمبل بچھا کر ستانے لگے۔ تھکاوٹ سے چور بدن آرام کے لیے پکار رہے تھے چنانچہ فرش پر لیٹتے ہی وہ سو گئے۔ صرف کیپٹن تنویر اور یاک پہرہ دینے کے لیے جاگتے رہے۔

کیپٹن تنویر نے سوچا خدا ہمارے ساتھ ہے۔ ہم دو بار انڈین آرمی کے دستوں سے بچے ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی وہ شکرانے کے نفل ادا کرنے کے لیے سربسجود ہوگیا۔

جہاز یا ہیلی کاپٹر

سچ تو یہ ہے کہ اُن کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ ایک پوری فوجی تنظیم اُن کی تلاش میں تھی انہوں نے نوبرا ویلی میں ہلچل مچا دی تھی اور کئی افسر ہلاک کیے تھے۔ عام فوجی کتنے ہلاک

ہوئے؟ اس کا اندازہ لگانا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ واضح طور پر پندرہ کماغڈو عبادت گاہ میں ہلاک ہوئے تھے۔ دیر سویر اُن کی موت کا علم ہونا ہی تھا۔ دھماکوں سے گولہ بارود کا جو نقصان ہوا وہ کروڑوں روپوں میں نہ سہی لاکھوں روپوں میں ضرور تھا۔ انڈین آرمی کے گھمنڈ کو دھچکا لگا تھا اور اس کی ساکھ جس بری طرح متاثر ہوئی تھی اُس کا بدلہ لینا انڈین آرمی کے لیے ضروری ہوگیا تھا اور بدلہ صرف اُسی صورت میں لیا جا سکتا تھا کہ کماغڈو پارٹی کو زندہ پکڑ لیا جائے اور ایک ایک کو اذیت دے کر ہلاک کیا جائے۔

کیپٹن تنویر نے سجدہ سے سر اٹھایا، اسلام کی عظمت، پاکستان کی ترقی اور اپنی کامیابی کے لیے دعا مانگی اور غار سے نکل کر موسم کا جائزہ لینے لگا۔ اُس نے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنی۔ پلٹ کر دیکھا۔ ابراہیم کھڑا تھا۔

''سر آپ کچھ سوچ رہے ہیں؟'' ابراہیم نے ادب سے کہا۔

''ہاں ابراہیم میں سوچ رہا ہوں کہ ہم کامیابی کے بعد کس راستہ سے واپس جائیں گے۔''

''سر، میں تو سمجھتا ہوں ہمارا واپس جانا اب ممکن نہیں۔'' ابراہیم بولا۔

''ایسا نہیں کہتے ابراہیم، مسلمان مایوس نہیں ہوتا اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا کفر ہے۔ چلو آؤ میرے ساتھ۔ اس پہاڑ پر چڑھ کر دیکھتے ہیں شاید کوئی راستہ نظر آئے۔'' ابراہیم کیپٹن تنویر کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

وہ دونوں غار کے سامنے پہاڑ پر چڑھنے لگے۔

وہ دو گھنٹے کی لگاتار کوشش کے باوجود پہاڑ کی چوٹی پر نہ پہنچ سکے۔ اُن کے بازو اور ٹانگیں شل ہوگئیں۔ پھیپھڑے دھونکنی کی طرح چلنے لگے، سر چکرانے لگے، بازو اور پنڈلیاں زخمی ہوگئیں لیکن وہ پہاڑ کی عمودی چڑھائی پر آگے بڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکے اور آخر دو گھنٹے مزید ضائع کر کے نیچے آ گئے جب وہ نیچے آئے تو دن کے بارہ بج رہے تھے اور اُن کے باقی چار ساتھی اُن کا انتظار کر رہے تھے۔

''چاروں طرف برف سے ڈھکے پہاڑ ہیں۔ یہ پہاڑ عمودی ہیں۔ ان پر چڑھنا آسان نہیں۔ ہم دونوں کوشش کر کے دیکھ چکے ہیں۔'' کیپٹن تنویر نے اپنے ساتھیوں کو بتایا۔

راہبہ نے ایک چھوٹی شیشی جیب سے نکالی پہلے ابراہیم کے زخموں پر تیل لگایا اور پھر

کیپٹن تنویر کے زخموں پر۔

''ہم یہاں کچھ دن ٹھہریں گے جب انڈین آرمی ہمیں تلاش کر کے تھک جائے گی تو ہم یہاں سے نکل کر کسانوں کے بھیس میں نوبرا ویلی میں داخل ہوں گے اور پھر اُسی راستہ سے واپس جائیں گے جس راستہ سے آئے تھے۔'' میجر نے کہا۔

''خدا کرے ایسا ہو لیکن میرے خیال میں اب وہی راستہ اختیار کرنا جس راستہ سے آئے تھے مناسب نہیں۔ انڈین آرمی کو معلوم ہے کہ ہم اُن کے ایریا میں ہیں۔ وہ ہمیں کم سے کم ایک ماہ تک تلاش کریں گے۔ ہم ایک ماہ تک اس غار میں ٹھہر نہیں سکتے۔ کیونکہ ہمارا راشن صرف ایک دن کے لیے کافی ہے۔ کل ہمارے پاس کچھ نہ ہوگا۔ بھوکوں مرنے سے بہتر ہے کہ ہم لڑ کر جان دیں۔'' کیپٹن تنویر نے اپنے آخری الفاظ ایک خاص جذبے سے ادا کیے۔

''ہمارے پاس اسلحہ ہے۔ ہم شکار سے اپنا پیٹ پالیں گے۔'' میجر نوری نے کہا۔

''سردیوں کا موسم شروع ہو گیا ہے۔ اب یہاں شکار نہیں ملے گا۔ اگر ملے گا تو ہم اسے گولی سے مار نہیں سکتے کیونکہ گولی کی آواز سن کر انڈین آرمی کے جوان اور افسر ہماری تلاش میں نکل کھڑے ہوں گے۔ اس کے علاوہ ہمارے ساتھ ایک بوڑھا، ایک زخمی اور ایک خاتون بھی ہے۔ میں نے بچے کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ یہ بچہ میرے خیال میں شیر کا بچہ ہے اور ہر دکھ درد تکلیف برداشت کر سکتا ہے۔ یہ اب گولی چلانے میں بھی ماہر ہے۔''

جب کیپٹن تنویر نے بات ختم کی تو میجر نے اُسے ٹوکا نہیں۔ وہ سوچنے لگا اور پھر آہستہ سے بولا۔

''آپ کی کیا تجویز ہے؟''

''میرے خیال میں ہمیں ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر پر قبضہ کرنا چاہیے۔ یقیناً انڈین آرمی سیاچن گلیشیر پر اپنے جوان، گولہ بارود اور دوسرا ساز و سامان ہوائی جہازوں یا ہیلی کاپٹروں کے ذریعہ پہنچاتی ہے۔ اگر ہم ہوائی جہاز یا ہیلی کاپٹر چرا لیں اور اُس کے ذریعہ سیاچن گلیشیر پار کر لیں تو ہم بچ سکتے ہیں ورنہ نہیں۔''

''لیکن یہ جہاز یا ہیلی کاپٹر کون اُڑائے گا؟'' میجر نے پوچھا۔

''پائلٹ، اور کون؟'' کیپٹن بولا۔

''کون پائلٹ، کون سا پائلٹ؟'' میجر نے سوال کیا۔

''انڈین پائلٹ، ظاہر ہے جہاز یا ہیلی کاپٹر کے ساتھ پائلٹ کو بھی چرانا ہوگا۔''

کیپٹن تنویر کی بات سن کر میجر نوری زور زور سے ہنسنے لگا۔

''یار: کیسی بات کرتے ہو؟ شیخ چلی کا زمانہ گیا۔ ایسی باتیں صرف شیخ چلی ہی سوچ سکتا ہے۔'' میجر خوش طبعی سے بولا۔

''نہیں سر، شیخ چلی کی بات نہیں۔ ذرا سوچئے ہم اس وقت کہاں ہیں لداخ میں۔ ہم نوبرا ویلی کو فتح کر چکے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ہماری فتوحی بہت کم ہے اس لیے اس پر مستقل قبضہ نہیں جما سکتے۔ ہمارے خون کی پیاسی انڈین آرمی ہمیں تلاش کرنے میں ناکام رہی ہے۔ ہمارے حوصلے اب بھی بلند ہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اب بھی اکیلا، خدا کے فضل سے انڈین آرمی کو ناکوں چنے چبوا سکتا ہوں۔'' کیپٹن تنویر یہ کہہ کر میجر نوری کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرے طرف سے اجازت ہے۔'' میجر نے بحث ختم کرنے کے لیے کہا۔

''تھینک یو سر۔ آپ کی قیادت میں ہم گھبرانے والے نہیں۔ ویسے بھی زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے سر۔'' کیپٹن نے کہا اور وہ کمبل اٹھا کر غار کے ایک کونے میں لیٹ گیا۔ راہبہ نے ایک اور کمبل اٹھایا اور کیپٹن پر ڈال دیا۔

''ابراہیم تم بھی سو جاؤ۔ میری طرح تھک چکے ہو۔'' کیپٹن سمجھ رہا تھا کہ ابراہیم نے اُس پر کمبل ڈالا ہے۔

نیا سفر

کیپٹن تنویر نے چار گھنٹے سو کر آرام کیا۔ جب وہ اُٹھا رات ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ اُس نے ایک ریوالور، ایک پستول، گولیاں، ایک خنجر، ایک چاقو اور ایک رسہ لیا۔ نائٹ ویژن گاگلز پہلے ہی اُس کے پاس تھے۔

''میرے پاس آپ کی پاسپورٹ سائز کی تصویر ہے۔ یہ لو۔'' میجر نے اُسے اُس کا پاسپورٹ سائز کا فوٹو تھمایا۔

''یہ کام کی چیز نہیں۔ آپ اسے اپنے پاس رکھیے، جب میری یاد ستائے اسے دیکھ لیجیے۔'' کیپٹن نے ہنس کر کہا۔

''میں تمہارا عاشق تو ہوں لیکن اتنا بڑا نہیں کہ جدائی میں پاسپورٹ سائز تصویر دیکھ کر یادیں تازہ کروں۔ یہ پاسپورٹ سائز تصویر کیپٹن کشن کمار کے شناختی کارڈ پر لگا لینا۔ اس کی لاش اب بھی عبادت گاہ میں ہوگی۔'' میجر نے اُسے ترکیب بتائی۔

''خوب، جائے استاد خالی است۔ گڈ آئیڈیا۔ تھینک یو!'' کیپٹن نے فوٹو کیپٹن کشن کمار کے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ کیوں نہ کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لی جائے چنانچہ تلاشی لینے پر کوٹ کی ایک اندرونی جیب سے کیپٹن کشن کمار کا سروس ریکارڈ والا شناختی کارڈ مل گیا۔ اُس نے کیپٹن کشن کمار کی تصویر اتاری اور اسکی جگہ اپنی تصویر لگانا چاہی لیکن وہ جم نہ سکی کیونکہ گوند نہ تھی۔ راہبہ آگے بڑھی۔ اُس کے ہاتھ میں کیکر کی گوند تھی جو خشک تھی۔ راہبہ نے اُسے اپنے لبوں سے چھو کر تھوک سے گیلا کیا، فوٹو اور شناختی کارڈ تنویر سے لے لیا اور فوٹو کی پشت پر گوند کو رگڑا۔ اس کے بعد اُسے کیپٹن کشن کمار کے شناختی کارڈ پر خوب اچھی طرح سے چپکا دیا۔

کیپٹن تنویر نے شناختی کارڈ کو چیک کیا۔ فوٹو ٹھیک طرح سے چسپاں ہوا تھا۔ ہلنے ہلانے سے اپنی جگہ سے ذرا بھی ٹس مس نہ ہوا۔

''تھینک یو لیڈی..... ویلڈن رفل جاب!'' کیپٹن نے راہبہ کو داد دی تو وہ شرما کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بروق پا آگے بڑھا اور اُس نے ہنٹر بیف کا ایک ٹکڑا اور چائے کا ایک کپ تنویر کی طرف بڑھایا۔ اُس نے ابراہیم کی طرف دیکھا۔ وہ بھی چائے پی رہا تھا اور ہنٹر بیف کھا رہا تھا۔ کیپٹن نے اُسے آنکھوں سے اشارہ کیا اور بولا۔

''پکڑے۔ کیا ارادہ ہے؟''

''سر، میں آپ کے ساتھ جاؤں گا۔'' وہ مچل کر بولا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ سر سے اجازت لو۔''

''اسے کیسے اجازت مل سکتی ہے؟'' میجر بولا ''یہ بچہ ہے کٹھن کام نہیں کر سکتا۔ موت کا کھیل ہمیشہ مشکل ہوتا ہے میں اسے اس کھیل کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے سر۔'' کیپٹن نے کہا۔

''زندگی اور موت یقیناً خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن عقل بھی خدا نے عطا کی ہے عقل کا تقاضا ہے کہ بچے زندگی اور موت کے کھیل سے دُور رہیں۔'' میجر نے دوٹوک انداز میں کہا۔

اب سلطان آگے بڑھا اور التجا کی:

''صاحب میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ کیپٹن تنویر کے ساتھ میں جانے کے لیے تیار ہوں۔''

''نہیں۔ تم اب بھی زخمی ہو۔ آرام کرو۔ جب پوری طرح شفا ہو گی پھر جو جی چاہے کرنا۔'' میجر نے اُسے بھی روک دیا۔

''میں چلی جاؤں؟'' راہبہ نے جھجکتے ہوئے درخواست کی۔

''لڑنا مرنا عورتوں کا کام نہیں تو یہیں رہے گی اور چائے پانی تیار کرے گی۔'' راہبہ کے لیے میجر کے لہجہ میں ڈانٹ تھی۔ وہ ڈر کر دو قدم اور پیچھے ہٹ گئی۔

کیپٹن تنویر چائے اور ہنٹر بیف کا ٹکڑا ختم کر چکا تھا۔ اُس نے سب کو سلیوٹ کیا اور جانے کے لیے گھوما۔

''ٹھہرو!'' میجر کی رعب دار آواز گونجی۔ ''تم اپنے ساتھ بروق پا کو لے جاؤ۔ ایک اکیلا دو گیارہ۔ اس کے علاوہ یہ مقامی زبان بھی جانتا ہے۔ ضرورت پڑی تو مقامی بولی کام آئے گی۔'' میجر نے دلیل سے کیپٹن کو قائل کیا۔

''مقامی بولی کے علاوہ یہ برفانی انسانوں کی بولی بھی جانتا ہے، انکل بروق پا آؤ جی۔''

اور وہ دونوں غار سے باہر آ گئے۔ لیکن چلنے سے پہلے بروق پا نے ہنٹر بیف کا ایک بڑا ٹکڑا اور نائٹ ویژن گاگلز احتیاط سے اپنے چوغے کی جیبوں میں ڈال لیے۔

رات بارہ بجے وہ بدھ مت کی عبادت گاہ میں پہنچے۔ پندرہ لاشیں اسی طرح بکھری پڑی تھیں جس طرح وہ اُن کو چھوڑ کر گئے تھے۔ کیپٹن تنویر نے کیپٹن کشن کمار اور اُس کے چودہ ساتھیوں کی لاشیں باری باری اُٹھا کر کھڈ میں پھینکیں اور ایک بجے رات فارغ ہو کر عبادت گاہ کے چھوٹے کمرے میں بیٹھ گئے اور صبح کا انتظار کرنے لگے۔

صبح ہونے میں پانچ گھنٹے باقی تھے اس لیے کیپٹن تنویر نے بروق پا سے کہا کہ وہ اسے برفانی انسانوں کی بولی کے سولہ الفاظ یاد کروائے۔ سولہ الفاظ کا یاد کرنا اتنا مشکل نہ تھا۔ چنانچہ زبان دانی کا یہ عجیب و غریب سبق شروع ہوا۔ بروق پا ایک لفظ بولتا اور کیپٹن تنویر اُس کو دو تین

بار دہراتا۔ اس کے بعد برفوق پا اس لفظ کا اردو ترجمہ بولتا اور کیپٹن اردو ترجمہ کو بول کر سناتا۔ جب ایک بار سولہ لفظ اور اُن کا ترجمہ ختم ہوا تو برفوق پا پھر شروع سے بول کر سبق یاد کروانے لگا یہ عمل دس بار ہوا۔ اس کے بعد کیپٹن نے برفانی انسانوں کی بولی کے الفاظ ادا کیے اور اُن کا ترجمہ سنایا۔ جہاں کہیں کوئی لفظ درست ادا نہ کرتا یا ترجمہ بتانے میں ذرا سی غلطی ہو جاتی تو برفوق پا ٹوک کر درستگی کر دیتا۔ یہ عمل بار بار ہوتا رہا حتیٰ کہ کیپٹن کو برفانی انسانوں کی بولی کے سولہ الفاظ بالکل یاد ہو گئے۔ اس مرحلہ کے بعد برفوق پا برفانی انسان بنا اور کیپٹن اُس سے برفانی انسانوں کی بولی میں بات چیت کرنے لگا۔ آخر جب کیپٹن تنویر کو یقین ہو گیا کہ وہ برفانی انسانوں کی بولی کا ماہر بن گیا ہے تو اُس نے برفوق پا کے دونوں ہاتھ چومے اور شکریہ ادا کیا۔

اب وہ دونوں برفانی انسانوں کی زبان میں مزے سے گفتگو کر سکتے تھے اور دنیا میں صرف وہی دو آدمی تھے جو برفانی انسانوں کی زبان سے آشنا تھے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ نوبرا ویلی کی طرف چل پڑے اور سورج نکلنے سے پہلے وہ اس عبادت گاہ میں پہنچ گئے جہاں سے لاما اور راہبہ اُن کے ساتھ ہو لیے تھے۔ انہوں نے اندر سے دروازہ بند کیا اور عبادت گاہ کے چوبی ٹرنک سے پرانے کمبل نکال کر بستر بچھایا اور اپنے اوپر ایک ایک کمبل لے کر مزے سے سو گئے۔

جاسوس

بعد دوپہر جب اُن دونوں کی آنکھ کھلی تو سورج کی کرنیں اُن کی عبادت گاہ کے دروازہ پر دستک دے رہی تھیں۔ یہ دروازہ عبادت گاہ کی عمارت کی مغربی سمت تھا۔ جیپوں اور ٹرکوں کا شور عام تھا۔ اس شور پر ایک شور حاوی تھا اور وہ ٹینکوں کا شور تھا۔ گویا نوبرا ویلی میں ٹینک بھی ہیں۔ یقیناً انڈین آرمی نے لہہ سے نوبرا ویلی تک سڑک کو پکا کر لیا ہے اور رسے کے پلوں کے بجائے کنکریٹ کے پل بنا لیے ہیں۔ جیپوں، ٹرکوں اور ٹینکوں کے اوپر ایک اور شور تھا اور یہ شور ہیلی کاپٹروں کا تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ ملٹری کے بار بردار جہازوں کا شور سارے شور و غوغا سے الگ تھلگ تھا۔ کیپٹن تنویر کے اندر کا سپاہی ایکشن کے لیے بے کل ہو گیا۔

اُس نے اپنے بال اور وردی درست کی اور رسہ سے برفوق پا کے ہاتھ باندھ دیئے۔

''آپ پاکستان کے جاسوس ہیں۔ میں کیپٹن کشن کمار ہوں اور میں نے آپ کو اس

عبادت گاہ میں گرفتار کیا ہے۔ آپ عبادت گاہ میں لاما اور راہبہ کو ملنے آئے تھے۔ کیونکہ لاما اور راہبہ بھی آپ کی جاسوس پارٹی کے رکن ہیں۔ آپ کو اور آپ کے دس ساتھیوں کو اس رات نوبرا ویلی میں بذریعہ ہوائی جہاز ڈراپ کیا تھا جس رات یہاں تباہی کا کھیل کھیلا گیا۔ یہی کوئی تین دن پہلے۔ آپ کے تمام ساتھی مر چکے ہیں یا گرفتار ہو چکے ہیں۔ آپ لاما اور راہبہ کو ملنے آئے تھے لیکن وہ لاپتہ ہیں۔''

برفوق پا نے وہ سب باتیں دُہرا دیں جو اُس کو بتائی گئی تھیں۔

''اب ہم باہر نکل رہے ہیں اس عبادت گاہ سے تاکہ کوئی جیپ مل جائے اور ہم اُس میں بیٹھ کر نوبرا ویلی کی چھاؤنی کا چکر لگا لیں۔''

کیپٹن کشن کمار عرف کیپٹن تنویر برفوق پا کو رسہ کے ذریعہ گھسیٹتا ہوا دروازہ سے باہر آ گیا۔

باہر دو فوجی پیدل جا رہے تھے انہوں نے کیپٹن کی وردی کو سلام کیا۔ کیپٹن نے سلام کا جواب دائیں ہاتھ کی جنبش سے دیا اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں فوجی آگے نکل گئے۔ گویا انہوں نے کیپٹن اور اس کے قیدی کا کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔ کیپٹن نے سوچا یہاں ایسے قیدی عام ہوں گے اور فوجی اُن کو رسوں میں جکڑے ہوئے اکثر دیکھتے ہوں گے۔

وہ یہی سوچ رہا تھا کہ سیاچن گلیشیر کی جانب سے ایک جیپ آئی۔ یہ عام جیپ تھی۔ اگر خاص ہوتی تو اس پر سٹار یا جھنڈا ہوتا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارہ سے جیپ کو کھڑا ہونے کا اشارہ کیا۔ سکھ ڈرائیور نے جیپ روک لی اور کیپٹن کو سلیوٹ مارا۔

''یہ جاسوس ہے اسے پوچھ گچھ کے لیے ہم کیمپ لے جائیں گے۔'' کیپٹن بولا اور برفوق پا کو ڈرائیور والی سیٹ کے اُوپر دھکیل کر پچھلی سیٹ پر لڑھکا دیا۔ برفوق پا کو چوٹ آنا چاہیے تھی لیکن نہ آئی۔ جیپ چل پڑی۔ اب کیپٹن کشن کمار سکھ ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر ڈٹا ہوا بیٹھا تھا۔

جیپ درختوں میں چھپی بارکوں اور خندکوں میں سے ہوتی ہوئی آدھ گھنٹے کے بعد ایک خاردار جنگلے کے آہنی گیٹ پر رُکی۔ کیپٹن نے شناختی کارڈ جیپ سے نکالا اور جیپ میں بیٹھے بیٹھے دو سکیورٹی گارڈوں کو دکھایا۔ آہنی گیٹ کھل گیا اور جیپ اندر داخل ہوئی۔ جیپ ایک جگہ رُکی۔ کیپٹن چھلانگ لگا کر اترا اور پھر برفوق پا کو اشارہ کیا کہ وہ بھی نیچے آئے۔ جب برفوق پا

جیپ سے اُتر گیا تو سکھ ڈرائیور جیپ بھگا کر گیٹ سے باہر نکل گیا۔

وہ دونوں ایک بڑے صحن میں کھڑے تھے۔ اس صحن میں بجری بچھی تھی اور لان کے دونوں طرف جنگلے کے پاس گملوں میں پھول اُگے تھے یہ کالے گلاب کے پھول تھے۔ اُسے سیاچن گلیشیر یاد آ گیا۔ سیاچن گلیشیر کا مطلب ہی یہ تھا کہ ایسا گلیشیر جہاں جنگلی پھول بہتات سے کھلتے ہیں یعنی کثیر جنگلی گلابوں کا برف زار۔

اُس کے سامنے بہت بڑی بیرک تھی اور بیرک کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کمرے بنے ہوئے تھے۔ یہ کمرے کیا تھے کہ گھر تھے غالباً یہ کمرے قید تنہائی کے لیے تھے۔ وہ بروق پا کو لے کر ایک دروازہ کی طرف بڑھا تو وہ دونوں ایک کمرہ میں تھے جس میں ایک صوبیدار بیٹھا ہوا تھا۔ یہ کمرہ دراصل برآمدہ تھا جس کے سامنے دیوار کھڑی کر کے اُسے کمرہ بنا دیا گیا تھا۔

صوبیدار نے رجسٹر کھولا اور نام پوچھا۔

کیپٹن تنویر نے اپنا نام کیپٹن کشن کمار بتایا اور پھر شناختی کارڈ اُس کے سامنے رکھ دیا۔ جس دلیری بلکہ دیدہ دلیری سے کیپٹن نے شناختی کارڈ صوبیدار کے سامنے رکھا تھا وہ قابل تعریف تھی۔ صوبیدار نے ضروری معلومات شناختی کارڈ سے لے کر رجسٹر میں درج کیں اور کارڈ واپس کر دیا۔

اس کے بعد کیپٹن نے بروق پا کا نام اسماعیل بتایا اور اُسے پاکستان کا جاسوس لکھوایا۔ اُسے کس لیے لایا گیا ہے؟ پوچھ گچھ کے لیے۔ پوچھ گچھ کون کرے گا؟ میں۔ یہ پوچھ گچھ عام ہے یا خاص؟ خاص۔ جاسوس اکیلا ہے یا کسی گروپ کا ممبر ہے؟ گروپ کا ممبر۔ گروپ کے دوسرے ارکان کہاں ہیں؟ لاپتہ ہیں۔ اُن کی تلاش جاری ہے۔ اسے کہاں رکھا جائے گا؟ فی الحال عام لوگوں کے ساتھ بیرک میں۔

صوبیدار نے میز پر دھپہ مارا تو ایک سکیورٹی گارڈ آیا۔ صوبیدار نے زبان سے کچھ نہ کہا صرف اشارہ سے کہا کہ بروق پا کو اندر لے جاؤ۔ سکیورٹی گارڈ چابیوں کا گچھا لے کر آیا اور بروق پا کو رسہ سے پکڑ کر آگے بڑھا۔ اُس نے چابی گھما کر تالا کھولا۔ دو پٹ زور سے کھلے اور سکیورٹی گارڈ نے بروق پا کو اندر دھکیل دیا۔ کیپٹن نے دیکھا بیرک کے اندر پندرہ سولہ لاما لوگ میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس نیچے خاک پر بیٹھے ہیں اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے بروق پا اور

سکیورٹی گارڈ کو گھور رہے ہیں۔

کیپٹن تنویر پلٹا اور صحن میں سے ہوتا ہوا گیٹ سے باہر نکل گیا وہ اب آزاد تھا۔ کیونکہ بروق پا فوجی جیل کے اندر محفوظ تھا۔

وہ سیر کے موڈ میں بیرک کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ فضا میں بارود جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی اور جیپوں، ٹرکوں وغیرہ کا شور اُمڈا ہوا تھا۔

کہاں گئے وہ لوگ

کیپٹن کشن کمار کے جانے کے بعد صوبیدار کی اطلاع پر انٹیلی جنس آرمی کے دو افسر بروق پا سے معلومات حاصل کرنے کے لیے آئے۔ ایک کیپٹن تھا اور دوسرا میجر۔ سوال کرتا تھا اور جواب کیپٹن نوٹ کرتا تھا۔

''تم کہاں سے آئے ہو؟''

''گلگت سے''

''کیوں آئے؟''

''نوبرا کے لاما سے ملنے کے لیے۔''

''کس لاما سے ملنے آئے؟''

''جو عبادت گاہ کا انچارج تھا۔''

''وہ ملا؟''

''نہیں۔ وہ عبادت گاہ میں نہیں تھا۔''

''اس کا کوئی اور بھی ساتھی تھا؟''

''ایک عورت تھی جو راہبہ ہے۔''

''اس کا نام؟''

''مجھے یاد نہیں۔''

''وہ ملی؟''

''نہیں وہ غائب ہے۔''

''ان دونوں کے علاوہ بھی کسی سے ملنا تھا؟''

''نہیں صرف انہی دو سے ملاقات کرنا تھی۔''

''تم کو کس نے بھیجا؟''

''میرے افسروں نے۔''

''کسی افسر کا نام یاد ہے؟''

''ہاں یاد ہے۔''

''نام بتاؤ؟''

''کیپٹن تنویر۔''

''وہ اس وقت کہاں ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں اس وقت کہاں ہے۔''

''تمہارے ساتھ آیا تھا کیا؟''

''ہاں میرے ساتھ آیا تھا۔''

''سفر کس طرح سے کیا؟''

''ہمیں جہاز کے ذریعے لایا گیا تھا۔''

''جہاز آ کر کہاں ٹھہرا تھا؟''

''ٹھہرا نہیں اُڑتا رہا۔ ہم نے چھتری کے ذریعے چھلانگ لگائی تھی۔''

''کس جگہ چھلانگ لگائی؟''

''برف میں۔ جگہ کا نام معلوم نہیں۔''

''جہاں چھلانگ لگائی وہاں سے کس طرح نوبرا ویلی میں آئے؟''

''نوبرا ویلی میں پیدل چل کر آئے تھے یا کسی اور طرح سے؟''

''ہمیں دو جیپوں سے لایا گیا؟''

''جیپیں کہاں سے آئیں؟''

''جیپیں پہلے سے موجود تھیں۔ غالباً لاما نے انتظام کیا تھا۔''

''کیا تجھے یقین ہے کہ لاما نے انتظام کیا تھا؟''

''جیپیں انڈین آرمی کی تھیں۔ معلوم نہیں کسی انڈین افسر نے دی ہوں یا لاما نے چوری کی ہوں۔''

''نوبرا ویلی میں آ کر آپ لوگوں نے کیا کیا؟''

''اوروں کا مجھے علم نہیں۔ میں تو سیدھا عبادت گاہ میں آیا تھا۔''

''باقی کہاں گئے؟''

''مجھے معلوم نہیں۔ وہ لڑنے مرنے کے لیے بکھر گئے ہوں گے۔''

''لاما اور راہبہ آپ کو ملے یا نہیں؟''

''نہیں۔ میں نے دو دن انتظار کیا وہ مجھے نہیں ملے۔''

''آج تجھ کو کس نے پکڑا؟''

''مجھے آج کیپٹن کشن کمار نے پکڑا اور وہ یہاں چھوڑ گیا۔''

''معلوم ہے تجھے کہ جاسوسی کی سزا کیا ہے؟''

''ہاں معلوم ہے۔ گولی۔''

''گولی کھانے کے لیے تیار ہو؟''

''ہر وقت تیار ہوں۔''

''پاک آرمی کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟''

''مجھے کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔''

''تمہارا عہدہ کیا ہے پاک آرمی میں؟''

''میں آرمی کا ملازم نہیں ہوں، رضا کار ہوں۔ رضا کار کا کوئی عہدہ نہیں ہوتا اور نہ اُسے کوئی تنخواہ ملتی ہے۔''

''تمہارے خیال میں تمہارے ساتھی کہاں گئے؟''

''مجھے یقین سے کچھ معلوم نہیں۔ میرے خیال میں کچھ مارے گئے اور دوسرے بھاگ گئے۔''

''ہمیں کسی کی لاش نہیں ملی، اس لیے ہمارا خیال ہے وہ بھاگ گئے ہیں کس طرف گئے ہوں گے؟''

''مجھے یقین سے معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے وہ جس راستہ سے آئے اسی راستہ سے

بھاگ گئے ہوں گے یعنی چھور بٹ کی طرف۔''

دونوں افسر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے اور پھر کچھ دیر تک ایک دوسرے کا منہ گھورنے کے بعد ڈائری ٹھپ کر کے چل دیئے۔ غالباً وہ اپنے سینئر افسروں سے مشورہ کرنے یا اُن کو اطلاع دینے گئے تھے۔

کیپٹن کشن کمار نے پوچھ گچھ کے دوران میں بتایا تھا کہ نوبرا وِلی میں تین ہیلی پیڈ ہیں، شمال میں، جنوب میں اور درمیان میں۔ کیپٹن تنویر نے بیرکوں کے پیچھے کچی سڑک پر چلتے ہوئے سوچا اُسے شمالی ہیلی پیڈ پر جانا چاہیے کیونکہ جنوبی ہیلی پیڈ پلتستان کی جانب تھا۔ اس لیے وہ بھی بے حد مصروف ہوگا۔ درمیانی ہیلی پیڈ چھاؤنی میں تھا اس لیے وہ بھی بے حد مصروف ہو گا۔ شمالی ہیلی پیڈ سامان لانے لے جانے کے لیے کبھی کبھار استعمال ہوگا اس لیے وہاں بھیڑ بھیڑ کا نہ ہوگا۔ لیکن یہ شمالی ہیلی پیڈ ہے کہاں اور وہاں پہنچنے کے لیے کیا انتظام کیا جائے؟..... شام ہونے کو تھی اور سیر سے اُس کا اب جی بھر گیا تھا۔

اُسے دُور سے ایک گرد اُڑاتی فوجی جیپ دکھائی دی۔ وہ سڑک پر کھڑا ہو گیا۔ جب جیپ قریب آئی تو اُس نے ہاتھ کے اشارہ سے اُسے کھڑا ہونے کے لیے کہا۔ جیپ کھڑی ہو گئی لیکن انجن سٹارٹ رہا۔

''ہیلی پیڈ تک جانا ہے۔'' وہ زور سے چلایا۔ انجن کا شور خاصا تھا۔

''کس ہیلی پیڈ پر سر؟'' ڈرائیور نے سوال کیا۔

''اُتر والا'' اُتر ہندی میں شمال کو کہا جاتا ہے۔

ڈرائیور نے جیپ تیزی سے موڑی اور جس طرف سے آیا تھا اُس کا رُخ اُس طرف کر دیا۔ کیپٹن تنویر چھلانگ لگا کر جیپ میں بیٹھ گیا اور جیپ کچی سڑک پر دوڑنے لگی۔

ڈرائیور لمبا اور پتلا دُبلا تھا۔ اُس کی مونچھیں تیکھی تھیں۔ ان مونچھوں کو عام طور پر اُسترا مونچھیں کہا جاتا ہے۔ وردی سے معلوم ہوا وہ ائیر فورس کا ملازم ہے۔ وہ کسی پائلٹ کو ہیلی پیڈ پر چھوڑ کر آیا تھا شاید۔

''کہاں سے آ رہے تھے تم جوان؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھا۔

''پائلٹ، امرداس کو ہیلی پیڈ پر چھوڑ کر آیا ہوں سر۔''

''کتنے چکر لگاتے ہو ہیلی پیڈ کے روزانہ؟''

''دن رات یہی کام ہے سر۔ میری دو سال سروس مکمل ہونے والی ہے یہاں، واپس چلا جاؤں گا۔'' ڈرائیور نے کہا اور جیپ کی رفتار تیز کر دی۔

آدھ گھنٹے کے بعد گودام نما عمارتیں نظر آئیں جو ایک پہاڑی کے دامن میں کھڑی تھیں ان کے سامنے ہیلی پیڈ تھا۔ ڈرائیور نے جیپ کھڑی کی کیپٹن تنویر اس پر سے اُترا۔ جیپ نے ٹرن لی اور واپس بھاگنے لگی۔ کیپٹن تنویر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا ایک گودام کی طرف بڑھا جس کا پھاٹک نما دروازہ کھلا تھا اور تین افسر کھڑے تھے۔ یہ انٹرین ایئر فورس کے افسر تھے اور ان میں ایک پائلٹ امرداس تھا۔ تین ہیلی کاپٹر گوداموں کے سامنے کھڑے تھے۔

''پائلٹ امرداس جی کون ہیں؟'' کیپٹن تنویر نے تین افسروں سے دس قدم دور کھڑے ہو کر کہا۔ ایک تیس سال عمر کا آدمی پلٹ کر تنویر کو دیکھنے لگا اور پھر اُس نے ہاتھ کھڑا کیا۔ تنویر نے اشارہ سے اُسے اپنے پاس بلایا تو وہ تیز تیز ڈگ بھرتے ہوئے اُس کی طرف آیا۔ کیپٹن کی وردی دیکھ کر اُس نے سلیوٹ مارا جس کا جواب تنویر نے سلیوٹ سے دیا۔ اس کے بعد تنویر نے اپنا شناختی کارڈ نکالا اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا!

''میرا نام کیپٹن کشن کمار ہے۔ میرا تعلق سپیشل گروپ سے ہے۔ ہم نے ایک جاسوس پکڑا ہے جسے لے کر ایک ایسی جگہ جانا ہے جس کا پتہ صرف اُسے ہے۔ اُس جگہ پاکستانی جاسوس چھپے ہوئے ہیں۔ مجھے آپ کے ہیلی کاپٹر کی ضرورت صرف آدھ گھنٹے کے لیے ہوگی۔''

''میری ڈیوٹی ہے یہ، میں جانے کے لیے تیار ہوں بس مجھے کلیرنس لینا ہوگی۔''

''ضرور لیں گے۔ اس میں کیا حرج ہے۔ کہاں سے کلیرنس لیں گے؟''

''فون پر، ابھی فون کرتا ہوں۔'' پائلٹ امرداس گودام کی طرف چل دیا تاکہ فون پر کلیرنس لے سکے۔ کیپٹن تنویر نے سوچا اگر کلیرنس نہ ملی تو کیا ہوگا۔ وہی ہوگا جو منظور خدا ہوگا۔ اُس کے دل نے کہا۔

کیپٹن تنویر ماحول کا جائزہ لینے لگا۔ ایک نہیں کئی گودام تھے جن میں سپلائی کا سامان تھا۔ ان گوداموں میں گولہ بارود بھی ہوگا، خوراک بھی ہوگی۔ کمبل اور دوسرے کپڑے بھی ہوں گے۔ مارٹر توپیں بھی ہوں گی، ہر قسم کی دوائیاں بھی ہوں گی۔ یقیناً یہ جگہ بے حد اہم ہے۔ لیکن

اس کی حفاظت کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے۔

''صرف آدھ گھنٹہ کے لیے ہیلی کاپٹر مل سکتا ہے۔ لیکن ایک شرط پر کہ آپ تحریری طور پر ڈیمانڈ کریں گے۔'' پائلٹ امرداس نے اُسکی طرف آتے ہوئے کہا۔

''واپسی پر لکھ کر دوں یا ابھی؟'' کیپٹن تنویر نے پوچھنا مناسب سمجھا۔

''واپسی پر تسلی سے لکھ کر دے دیجیے گا۔'' پائلٹ نے کہا اور ایک قریبی ہیلی کاپٹر کی طرف چل دیا۔ تنویر نے اُس کا ساتھ دیا۔

وہ دونوں ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر بعد ہیلی کاپٹر کے بلیڈ یعنی پنکھے ہوا میں گھومنے لگے اور وہ ہوا میں اُڑنے کے لیے پر تولنے لگے۔

''جاسوس بے حد خطرناک ہے اُسے یہاں لانا مناسب نہیں تھا۔ پاکستانی کماٹڈو اب بھی یہیں کہیں چھپے ہوئے ہیں اس لیے اُسے پوچھ گچھ کے سنٹر سے اٹھانا ہے۔''

پائلٹ امرداس پوچھ گچھ کے سنٹر کو جانتا تھا جو چھاؤنی کی مشرقی طرف تھا۔ ہیلی کاپٹر بجری والے آنگن میں اترا۔ کیپٹن تنویر صوبیدار سے ملا اور پھر تھوڑی دیر بعد ایک جوان بروق پا کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈالے اُسے لے کر ہیلی کاپٹر کی طرف آیا۔ کیپٹن تنویر نے ایک رجسٹر پر دستخط کیے۔ کیپٹن کشن کمار اپنے جاسوس کو ساتھ لیکر جا رہا تھا اور جاسوس کے ساتھ ساتھ ہتھکڑی اور چابی بھی اور اُس نے لے جانے کے لیے متعلقہ کاغذ پر دستخط کیے تھے۔ گویا رسید دی تھی کہ وہ پاکستانی جاسوس اسماعیل کو لے کر جا رہا ہے۔

کیپٹن تنویر پائلٹ کے پیچھے بیٹھ گیا اور بروق پا (جس کا جاسوسی نام اسماعیل تھا) کیپٹن کے پیچھے بیٹھ گیا۔ ہیلی کاپٹر اڑا اور درختوں کے اوپر سے اُس طرف روانہ ہوا جس طرف عبادت گاہ، کھڈ، کھائی اور غار تھے۔

ہیلی کاپٹر کا اغوا

شام کے دھندلکے گہرے نہیں ہو پائے تھے کہ ہیلی کاپٹر نوبرا ویلی کے اُوپر اُڑنے لگا تھا۔ کیپٹن تنویر کے ذہن میں نوبرا ویلی اور اُس کے ماحول اور گردونواح کا سارا نقشہ تھا۔ قدرت کی طرف سے ایک طرح کا کمپاس اُس کے ذہن میں فٹ تھا۔ جب وہ ٹریننگ لے رہا

تھا یعنی جب وہ کیڈٹ تھا تو اُسے جغرافیہ پڑھایا جاتا تھا۔ ظاہر ہے نقشوں کے بغیر جغرافیہ پڑھنا پڑھانا فضول کوشش ہے۔ چنانچہ کیپٹن تنویر نے کیڈٹ شپ کے دوران خوب محنت کی تھی اُسی طرح محنت کی تھی جس طرح اُس نے پرائمری جماعت میں پہاڑے یاد کرنے کے لیے محنت کی تھی۔ اب اگر کوئی لڑکا حساب میں طاق ہونا چاہتا ہے تو ضروری ہے کہ اُسے کم سے کم ایک سے سولہ تک پہاڑے فرفر یاد ہوں اسی طرح کامیاب اور بہادر فوجی بننے کے لیے جغرافیہ یاد کرنا بہت ضروری ہے اور جغرافیہ نقشوں کے بغیر یاد نہیں ہوا۔ چنانچہ کیپٹن تنویر نے نقشوں کو ذہن میں تیار کرنے اور ان کو یاد رکھنے کی خاص صلاحیت پیدا کی ہوئی تھی۔ یہی وہ صلاحیت تھی جس کی وجہ سے وہ پائلٹ امرداس کو ہیلی کاپٹر کی سمت درست رکھنے کے لیے درست ہدایتیں دیتا رہا اور ہیلی کاپٹر شام کے دھندلکوں میں عبادت گاہ، کھڈ کھائی اور غار کی طرف بڑھتا رہا۔

غار کے منہ کے سامنے کھلی جگہ تھی جو چھوٹے چھوٹے پتھروں سے پٹی ہوئی تھی۔ اس جگہ پر کسی زمانے میں نالہ تھا جس میں برف کا پانی اوپر سے نیچے کی طرف آتا تھا۔ پانی کے بہاؤ کے مسلسل عمل سے پتھر گھس گھس کر گول مٹول اور چھوٹے ہو گئے تھے۔ ہیلی کاپٹر ان پتھروں کے درمیان جب کھڑا ہوا تو اُس کے انجن اور بلیڈوں کا شور سن کر میجر غار سے باہر نکلا۔ شور تھم گیا تو کیپٹن تنویر ہیلی کاپٹر سے نیچے آیا اور اُس کے بعد بروق پا نیچے اترا۔ بروق پا کے ہاتھوں میں اب بھی ہتھکڑی تھی۔ پائلٹ امرداس ہیلی کاپٹر میں بیٹھا تھا۔

''پائلٹ امرداس نیچے آ جاؤ۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔ وہ بھی نیچے آ گیا۔

''سر، یہ ہیں پائلٹ امرداس جو ہمیں نوبرا ویلی سے لائے ہیں۔''

کیپٹن نے کہا اور پائلٹ نے میجر نوری کو سلام کیا۔ میجر پائلٹ کو دیکھ کر حیران بھی ہوا اور خوش بھی۔ لیکن وہ یہ بات نہ سمجھ سکا کہ بروق پا کو ہتھکڑی کیوں لگائی گئی ہے۔

''اسے ہتھکڑی کیوں لگائی گئی ہے؟'' میجر نے پوچھا۔

''سر، خطرہ تھا کہ بھاگ نہ جائے۔'' کیپٹن نے کہا اور پھر پائلٹ سے مخاطب ہو کر بولا ''آیئے اندر چلتے ہیں۔ غار کے اندر کچھ اور لوگ ہیں۔''

اب تک پائلٹ کو محسوس نہ ہوا تھا کہ کوئی خاص گڑبڑ ہے۔ وہ مزے سے ان کیپٹن اور میجر کے ساتھ چل پڑا۔ غار کے اندر جا کر اُسے محسوس ہوا کہ وہ غلط جگہ پر آ گیا ہے۔

''یہ آپ مجھے کہاں لے آئے؟'' پائلٹ نے گھبرا کر پوچھا۔

''آپ غار کے اندر ہیں اور ہماری قید میں ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کے ساتھ جھوٹ بولا۔ میں کیپٹن کشن کمار نہیں ہوں۔ میرا نام ہے تنویر اور میں کماٹڈو کیپٹن ہوں۔ یہ ہیں میجر نوری۔ آپ محفوظ ہیں آپ کی جان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ ہاں، اگر آپ نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو یقیناً آپ اپنے لیے خطرہ پیدا کریں گے۔''

کیپٹن تنویر نے بروق پا کے ہاتھوں سے ہتھکڑی کھول کر پائلٹ امر داس کے ہاتھوں میں ڈال دی اور پھر ایک بچھے ہوئے کمبل پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''لیڈی، پائلٹ کے لیے کوئی چائے پانی لاؤ۔ تھکے ہوں گے۔'' کیپٹن نے کہا اور انڈین آرمی کے کیپٹن کشن کمار کا کوٹ اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ کوٹ کے نیچے اونی جیکٹ تھی جس میں پستول، ریوالور، خنجر اور چاقو لٹک رہے تھے۔

راہبہ نے چائے کا کپ پائلٹ کو دیا اور کیپٹن تنویر سے پوچھا۔

''آپ چائے پئیں گے؟''

''ہاں لیڈی، میں بھی چائے پیوں گا اور بروق پا بھی۔ بلکہ سبھی چائے پئیں گے۔''

چائے آئی تو سب چائے پینے لگے۔

''آپ مجھ سے کیا کام لینا چاہتے ہیں؟'' پائلٹ نے پوچھا۔

''آپ سے ہم کوئی خاص کام لینا نہیں چاہتے۔ آپ آج رات ہمارے پاس ہیں اور کل آپ ہمیں اڑا کر اس امریا سے باہر لے جائیں گے۔'' میجر نوری نے کہا۔

''کہاں؟'' پائلٹ نے پوچھا۔

''سیاچن گلیشیر کے اُس پار یلستان میں۔'' میجر نے بتایا۔

''یہ ناممکن ہے۔'' پائلٹ گھمبیر آواز میں بولا۔

وہ گورا چٹا جوان تھا جب اُس نے سنا کہ اُسے اپنے دشمنوں کو لے کر اُن کے امریا میں جانا ہوگا تو اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

''کیوں ناممکن ہے؟'' میجر نے پوچھا۔

''ناممکن اس لیے کہ یہ ہیلی کاپٹر اتنا لمبا سفر نہیں کر سکتا۔ یہ لمبے سفر کے لیے تیار نہیں کیا

گیا۔ اس کے علاوہ راستہ میں انڈین آرمی اور پاکستانی آرمی کے توپ خانے ہیں۔ وہ ہیلی کاپٹر کو لازماً ہٹ کریں گے۔ انڈین توپ خانہ اس لیے ہٹ کرے گا کہ اُن کا لاما ہیلی کاپٹر دشمن کے امریا میں کیوں جا رہا ہے اور پاکستان کا توپ خانہ اس لیے ہٹ کرے گا کہ لاما ہیلی کاپٹر ان کے امریا میں کیوں زبردستی گھس رہا ہے۔ ان دو توپ خانوں سے بچنا ممکن نہیں۔''

میجر نوری خاموش ہو گیا۔ لیکن کیپٹن تنویر چپ نہ رہ سکا۔

''آپ ہیلی کاپٹر نہ اُڑائیں۔ صرف یہ کریں کہ مجھے آج رات ہیلی کاپٹر اُڑانا سکھا دیں۔ میرا مطلب ہے موٹی موٹی باتیں۔''

اب پائلٹ امر داس خاموش ہو گیا۔

''اگر تم مجھے ہیلی کاپٹر چلانا سکھا دو تو ہم آپ کو زندہ واپس جانے دیں گے۔ اگر نہ سکھا سکو یا نہ سکھانا چاہو تو پھر تم ہمارے قیدی رہو گے۔ تم کو ہیلی کاپٹر اڑانا ہوگا خواہ اس پر انڈین توپ خانہ گولے چلائے یا پاکستان کی آرٹلری گولہ باری کرے، ان دو باتوں میں جو بات من پسند ہے اختیار کر سکتے ہو۔''

کیپٹن تنویر کی بات سن کر پائلٹ امر داس کی موٹی موٹی آنکھوں میں چمک واپس آ گئی اور وہ بولا۔

''مجھے پہلی بات پسند ہے۔ آپ کو ہیلی کاپٹر اڑانا سکھا دوں گا۔''

خودکشی

کیپٹن تنویر نے پائلٹ امر داس کی ہتھکڑی کھول دی۔ اُس کی تلاشی لی۔ کچھ برآمد نہ ہوا۔ کیپٹن اور پائلٹ نے نائٹ ویژن گاگلز پہنے اور دونوں ہیلی کاپٹر کے اندر گھس گئے۔ سلطان اور ابراہیم ہیلی کاپٹر کے دائیں بائیں کھڑے ہو کر پہرہ دینے لگے۔ دونوں ہتھیار بند تھے۔

''آپ ہیلی کاپٹر خراب بھی کر سکتے ہیں لیکن اس سے آپ کو فائدہ نہ ہوگا۔'' کیپٹن نے پائلٹ سے کہا ہم آپ کو یا آپ کی فوج کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتے۔ ہمارا مشن مکمل ہو چکا ہے اور ناکام بھی۔ ہم دشمن کے علاقہ میں ٹھہر کر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ اگر آپ نے مجھے ہیلی کاپٹر چلانے کی موٹی موٹی باتیں بتا دیں تو آپ کی جان بچ جائے گی بصورتِ دیگر آپ کا

میرے ہاتھوں بچنا محال ہے۔''

پائلٹ امر داس کیپٹن تنویر کے لب و لہجہ سے جان گیا تھا کہ وہ ایک سچے مسلمان کی طرح جھوٹ نہیں بول سکتا اور جو کہتا ہے کر گزرتا ہے۔

کل پرزوں کی شناخت کا عمل جاری تھا کہ راہبہ مارخور کی چربی سے تیار کی ہوئی ایک موم بتی جلا کر لے آئی۔ اس موم بتی کی موجودگی سے کل پرزوں کو سمجھنا اور سمجھانا آسان ہو گیا۔

جو کام چھ مہینوں میں سیکھا جائے اُسے چھ گھنٹوں میں سیکھنا ہو تو کیا ہوتا ہے؟ ہوتا یہ ہے کہ ہاتھ پیر اور ذہن کو بے حد تیزی سے کام کرنا پڑتا ہے اور یہ تبھی ہوتا ہے جب سیکھنے والے اور سکھانے والے پر جنون سوار ہو۔ کیپٹن کو معلوم تھا کہ وقت بہت کم ہے۔ پائلٹ امر داس اور اُس کا ہیلی کاپٹر ہیلی پیڈ پر واپس نہیں آیا اور وہ دونوں کی تلاش میں ہوں گے۔ پائلٹ کو معلوم تھا کہ اس کی زندگی اور موت کا انحصار اس امر پر ہے کہ کیپٹن تنویر ہیلی کاپٹر چلانا سیکھ جائے۔

یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں سیکھنے اور سکھانے کے عمل میں نہایت خلوص اور دیانت داری سے جُٹ گئے تھے۔ اگرچہ سردی کی شدت کافی تھی لیکن وہ دونوں پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔ سلطان اور ابراہیم پہرہ دے رہے تھے اور راہبہ ان کو چائے پلانے کی ڈیوٹی پر تھی۔ میجر اور بروق پا غار کے اندر تھے لیکن نیند اُن کی آنکھوں سے بھی کوسوں دُور تھی۔

رات دو بجے کے قریب کیپٹن تنویر نے پائلٹ سے کہا کہ وہ ہیلی کاپٹر چلانے کے متعلق بنیادی باتیں سمجھ گیا ہے۔

''اگر آپ بنیادی باتیں سمجھ گئے ہیں تو انجن چلا کر دکھائیں۔'' پائلٹ نے کہا۔ پائلٹ کے مشورہ پر کیپٹن تنویر نے انجن چلایا اور پھر بند کر دیا۔

''کیسا رہا؟'' کیپٹن نے پائلٹ سے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک۔ اب آپ انجن بھی چلائیں اور ہیلی کاپٹر کے بلیڈ بھی۔''

کیپٹن نے پہلے انجن چلایا پھر بلیڈ۔

''اب کیسا رہا؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''اب کے بھی بالکل ٹھیک۔ اب آپ انجن اور بلیڈ چلا کر ہیلی کاپٹر کو دھرتی سے اوپر لے جائیں۔ دس پندرہ فٹ۔''

کیپٹن نے حسب ہدایت ایسا ہی کیا اور پھر ہیلی کاپٹر کو زمین پر اُتارا۔

''اگر ہیلی کاپٹر اُڑ رہا ہو اور اُس میں کوئی خرابی پیدا ہو جائے تو کیا کرنا ہوگا؟''

پائلٹ امر داس خرابی کی مختلف صورتوں میں گفتگو کرنے لگا اور یہ گفتگو ایک گھنٹہ تک جاری رہی۔

''اب آپ ہیلی کاپٹر میں خرابی پیدا کریں، میں اُسے درست کروں گا۔''

پائلٹ نے ہیلی کاپٹر میں دو خرابیاں پیدا کیں اور پھر خود ہی اُن کو درست کیا۔ اس کے بعد وہی خرابیاں پھر پیدا کیں جنہیں کیپٹن نے ٹھیک کیا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ کیپٹن کا آخری ٹیسٹ لیا جائے۔ چنانچہ تنویر نے ہیلی کاپٹر اُڑایا اور نالے کے اُوپر گھوم پھر کر اُسے زمین پر اتارا۔ اس بار پائلٹ امر داس ہیلی کاپٹر میں اُس کے ساتھ نہیں بیٹھا تھا۔

''پائلٹ، اس غار میں ایک یاک ہے وہ گھریلو یاک ہے آپ اُس پر سواری کر سکتے ہیں۔ دو کمبل چھوڑے جا رہے ہیں وہ آپ کو سردی سے بچائیں گے۔ یاک کا منہ نوبرا ویلی کی طرف ہوگا تو وہ آپ کو سیدھا نوبرا ویلی لے جائے گا راستہ میں بدھ بھکشوؤں کی عبادت گاہ ہے۔ عبادت گاہ کے ساتھ کھڈے ہے کھڈ میں انڈین آرمی کے پندرہ کمانڈو مرے پڑے ہیں اُن کو دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ البتہ آپ نوبرا ویلی کے کمانڈنٹ کو بتا سکتے ہیں۔ میں آپ کو ہمیشہ یاد رکھوں گا کیونکہ آپ میرے اُستاد ہیں۔''

تنویر نے میجر سے مخاطب ہو کر کہا۔

''سر، اب ہمیں چلنا چاہیے۔ صبح ہونے والی ہے۔ اجازت دیجیے کہ ہم ہیلی کاپٹر میں سوار ہو جائیں۔''

میجر نوری نے اشارہ کیا۔ بروق پا، راہبہ، سلطان اور ابراہیم ضروری سامان لے کر ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد میجر نوری، کیپٹن تنویر نے ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے سے پہلے پائلٹ امر داس سے مصافحہ کیا اور اُسے اپنا چاقو دیا۔

''یہ چاقو کام آ سکتا ہے۔'' کیپٹن نے کہا۔

''یقیناً، یہ چاقو کام آئے گا۔'' کیپٹن نے کہا۔

جب ہیلی کاپٹر اڑا تو پائلٹ امر داس چپ گم کھڑا تھا۔ پھر اس نے دیکھتے دیکھتے چاقو اپنے پیٹ میں اُتار لیا اور لڑکھڑا کر گر پڑا۔

کیپٹن تنویر ہیلی کاپٹر کو بے حد احتیاط سے اُڑا رہا تھا۔ وہ اپنے کام کا ماہر تو نہ تھا۔ ہیلی کاپٹر کبھی اوپر جاتا اور کبھی نیچے آ جاتا۔ وہ نالے کے اُوپر اُوپر اُسے سیدھا اڑانا چاہتا تھا لیکن جوں جوں وہ اُوپر جاتا ہوا کا دباؤ بڑھتا۔ اس کے علاوہ نالہ کے دونوں طرف پتھریلے پہاڑ تھے۔ برف تو ان کی چوٹیوں پر تھی لیکن ان کے پہلو پتھروں کے دندانوں سے خنجروں کی طرح تھے۔ اگر ہیلی کاپٹر کا کوئی حصہ، خاص طور پر بلیڈ، پہاڑ کے پہلو سے ٹکرا جائے تو ہیلی کاپٹر کریش ہو جاتا ہے یعنی تباہ ہو جاتا ہے۔ یہی ایک ڈر تھا جس سے کیپٹن تنویر کا سارا جسم پسینے میں بھیگ گیا۔ بہرحال ہیلی کاپٹر اُڑا رہا تھا۔

سورج نکلنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا کہ ہوا کا زور اور شور بڑھ گیا۔ ہیلی کاپٹر کے اپنے کل پرزوں کا بھی کافی شور تھا۔ اب نالہ ختم ہو گیا تھا اور اس کی جگہ گلیشیر نے لے لی تھی۔ گلیشیر دو پہاڑوں کے درمیان برف کے دریا کو کہا جاتا ہے۔ گلیشیر پر ہوا کا زور اور رفتار بڑھ گئے تھے۔ راہبہ اور بروق پاڈر کر دعا مانگ رہے تھے۔ سلطان بھی گھبرایا ہوا تھا اور اُس کا کندھا قدرے ٹھیک ہو گیا تھا لیکن درد میں اب شدت آ گئی تھی۔ ابراہیم کے چہرے پر خوف کے آثار نہیں تھے۔ میجر نوری اشاروں سے کیپٹن تنویر کو ہیلی کاپٹر کی ڈائریکشن (سمت) سیدھی رکھنے کے لیے ہاتھ کے اشارے کر رہا تھا۔ کیپٹن تنویر نے دانت بھینچ لیے تھے اور اُس کا ذہن اور ہاتھ پیر حادثہ سے بچنے کے لیے کمپیوٹر کی طرح کام کر رہے تھے۔

اب ہوا کی تیزی بڑھ گئی تھی اور اس میں برف شامل تھی۔ کیپٹن کو اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ بلزرڈ یعنی برفانی طوفان کی آمد آمد ہے۔ وہ ہیلی کاپٹر نیچے اتارنا چاہتا تھا لیکن نیچے اب کھڈ نظر آ رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر کریش ہو سکتا تھا۔ ایسی صورت میں بچنا محال تھا۔ اس لیے اُس نے فیصلہ کیا کہ وہ نیچے نہیں اُترے گا۔ کیا وہ واپس جا سکتا ہے؟ نہیں۔ پیچھے یقینی موت کھڑی تھی۔ حادثہ میں مرنا قید میں مرنے سے کہیں بہتر ہے۔

اب برفانی طوفان نے ہیلی کاپٹر کو پوری طرح گھیر لیا اور وہ ہچکولے کھانے لگا۔ کیپٹن تنویر نے اُسے بڑی مشکل سے سنبھالا۔ اب سامنے کچھ نظر نہ آ رہا تھا۔

''ہیلی کاپٹر آہستہ آہستہ نیچے اُتارو۔'' میجر نوری نے کہا۔

''مجھے نیچے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔''

''یہ گلیشیر کا علاقہ ہے۔ نیچے برف ہو گی اور کچھ نہیں۔ اُتارو!'' میجر نے حکم دیا۔

ہیلی کاپٹر آہستہ آہستہ نیچے اترنے لگا اور پھر آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا گیا۔ ہیلی کاپٹر جوں جوں نیچے جا رہا تھا، برفانی طوفان کا شور اور شدت کم ہو رہے تھے۔ جب ہیلی کاپٹر برف پر ساکت ہوا تو شور معمولی تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی بگولا آ کر چلا گیا ہے۔ سب سے پہلے میجر نوری باہر نکلا اُس کے بعد کیپٹن۔ ان کے بعد دوسرے لوگ بھی باہر آ گئے۔ البتہ راہبہ باہر نہ آئی۔

''ابراہیم! لیڈی کہاں ہے؟ کہیں گر تو نہیں گئی؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''سر، وہ اندر اللہ اللہ کر رہی ہے۔ ڈر گئی ہے۔'' ابراہیم بولا۔

انہوں نے دیکھا وہ پہاڑوں کے درمیان برف کی جھیل پر کھڑے تھے۔ وہ آدھ کلومیٹر چوڑی اور ایک سوا ایک کلومیٹر لمبی جھیل پر کھڑے تھے۔ جھیل کا پانی جم چکا تھا۔ برف کی تہہ کناروں پر پانچ فٹ موٹی تھی اور جھیل کے درمیانی حصہ میں تین فٹ۔ یہ ایک اندازہ تھا جو میجر نوری نے لگایا اور ساتھیوں کو بتایا۔ جھیل کے اردگرد پہلو دار پہاڑ کھڑے تھے جیسے جن بھوت کھڑے ہوں البتہ ایک طرف جھیل تنگ ہو گئی تھی اور اس جانب پہاڑ کی اونچائی بھی قدرے کم تھی۔ لگتا تھا جب گرمیوں میں برف پگھل جاتی ہے تو پانی اُس طرف سے نالہ کی شکل میں باہر بہتا ہے۔

''لداخ اور تبت میں ایسی کئی جھیلیں پائی جاتی ہیں۔'' میجر نے کہا۔

''ایک ایسی جھیل مانسرووَر ہے جہاں سے دریائے سندھ نالہ کی شکل میں بہتا ہے۔'' کیپٹن نے کہا۔

''یہ وہی جھیل نہ ہو۔'' سلطان بولا۔

''نہیں۔ وہ جھیل تبت میں ہے اور بڑی ہے۔'' میجر بولا۔

''کہیں ہم تبت میں نہ آ گئے ہوں'' سلطان نے گھبرا کر کہا۔

''نہیں۔ تبت بہت دُور ہے۔ ہم لداخ میں ہیں اور یہاں سے بلتستان زیادہ دور نہیں ہے۔ کیپٹن تنویر نے درست سمت میں سفر کیا ہے۔'' میجر کے ان الفاظ نے سب پر حوصلہ افزا

اثر کیا۔لیکن ایک بات ہے کہ یہاں سے نکلنا محال ہے۔ چاروں طرف اونچے اونچے پہاڑ ہیں۔ ہیلی کاپٹر اُن کے اوپر نہیں جا سکتا۔'' میجر کے ان الفاظ نے سلطان کو پھر خوفزدہ کر دیا۔

کیپٹن نے اُسے تھپکی دی اور بولا۔

''گھبراؤ نہیں۔تم اکیلے نہیں مرو گے ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔''

''نہیں میں گھبرایا تو نہیں۔''

''شکاری گھبراتے نہیں۔ وہ خطروں کا مقابلہ کرتے ہیں۔'' میجر نے کہا۔

''ہمارے پاس کھانے پینے کا سامان کتنا ہے؟'' کیپٹن نے بروق پا سے پوچھا۔

''چائے کی پتی، خشک دودھ اور تھوڑی سی چینی۔'' بروق پا نے بتایا۔

''ہنٹر بیف؟''

''وہ ختم ہو چکا ہے۔''

''کمبل کتنے ہیں؟''

''دس کمبل ہیں۔''

''اگر یہاں رات رہنا پڑا تو ایک ایک کے لیے دس کمبلوں کی ضرورت ہوگی۔''

میجر نے یہ کہہ کر سب کو ڈرا دیا۔

''سردی سے بچنے کے لیے ہمیں پہلے کی طرح کسی غار میں رہنا ہوگا ورنہ ڈبل نمونیہ ہو جائے گا۔ ہاں یاد آیا نمونیہ کا علاج کرنے کے لیے گولیاں اور ٹیکے ہیں یا نہیں؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''وہ تو غار میں رہ گئے ہیں۔ میں نے سوچا تھا اب ہم واپس جا رہے ہیں ان کی کیا ضرورت ہے۔'' بروق پا نے مسکین صورت بنا کر بتایا۔

''ہم واپس نہیں جا رہے۔ ہمارا مشن ابھی کامیاب نہیں ہوا۔'' کیپٹن نے کہا۔

''اب واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تنویر۔'' میجر بولا۔

''سر، واپس کیسے جا سکتے ہیں؟ پیدل نہیں جا سکتے۔ ہیلی کاپٹر ان پہاڑوں میں سامنے کے رُخ پر اُڑ نہیں سکتا اور پھر آپ کا پائلٹ بھی اناڑی ہے۔''

کیپٹن کے لب ولہجہ میں ذرا بھی ڈر خوف نہیں تھا۔اس کے اُلٹ اس کے لب ولہجہ میں ایک طرح کی خوشی اور طمانیت تھی۔''ہم جس راستہ سے آئے اسی راستہ سے جا سکتے ہیں لیکن

دشمن تاک میں ہوگا۔''

''ہمیں کوئی غار تلاش کرنا ہوگا صاحب۔'' سلطان بولا۔

''آؤ تلاش کرتے ہیں۔'' میجر نے کہا۔

''سر، آپ غار تلاش کریں۔ میں نماز پڑھ لوں۔ چاچا۔تم ہیلی کاپٹر میں جاؤ اور لیڈی کو دیکھو کہیں مارے خوف کے پرلوک نہ سدھار گئی ہو۔''

کیپٹن تنویر نے بروق پا سے کہا اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اُس کا منہ یلتستان کی طرف تھا۔ پھر اُسے خیال آیا کہ وہ جس جگہ کھڑا تھا وہاں سے یلتستان جنوب کی طرف ہے چنانچہ اُس نے اپنا منہ مغرب کی جانب کیا یعنی اِس طرف جس طرف کے۔ٹو کی چوٹی تھی۔ بروق پا ہیلی کاپٹر کی طرف چلا اور میجر، سلطان اور ابراہیم کے ساتھ جھیل کے کنارے کنارے غار کی تلاش میں نکل پڑے۔

نماز پڑھنے کے بعد کیپٹن ہیلی کاپٹر کے پاس آیا۔ بروق پا اندر راہبہ کو تسلی دے رہا تھا۔

''بیٹی کیوں گھبراتی ہو ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں۔'' بروق پا کہہ رہا تھا۔

خاموشی اور سسکیاں۔

''ہوا میں اڑنے والا یہ گھوڑا ہمارے پاس ہے اُس میں بیٹھ کر اُڑ جائیں گے۔''

خاموشی اور سسکیاں۔

''اگر تو گھبرا گئی اور روتی رہی تو اس سے دوسرے بھی گھبرا جائیں گے۔''

خاموشی۔اب سسکیاں بند ہو گئیں۔

''اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ بیٹی؟''

خاموشی۔

کیپٹن تنویر دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور بولا۔

''کیا باتیں ہو رہی ہیں باپ بیٹی میں؟''

راہبہ نے اپنے دامن سے جلدی سے آنسو پونچھ ڈالے اور کیپٹن کو دیکھ کر بولی۔

''کچھ بھی نہیں''

''دیکھو لیڈی۔ میری بات غور سے سنو۔ اب تم واپس نہیں جا سکتی۔ ہم آپ کو انڈین

آرمی کے سپرد نہیں کر سکتے کیونکہ وہ آپ پر تشدد کرے گی۔ اب تم ہمارے ساتھ جیو گی اور ہمارے ساتھ مرو گی اور ہاں مسلمان کی زندگی اور موت اللہ کے لیے ہے جسے مہا گرو، گاڈ، ایشور، رب، اکال، یزداں اور کئی دوسرے ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ میں تو کہوں گا تم کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ۔''

کیپٹن تنویر یہ کہہ کر ہیلی کاپٹر سے باہر آیا اور جھیل کی سطح پر سورج کی نورانی کرنوں کو چمکتے ہوئے دیکھنے لگا۔ اُسے یوں محسوس ہوا جیسے ہر سُو چاندی کا تخت بچھا ہے اور کالے اور بلند پہاڑ اِس تخت کو اپنے گھیرے میں لے کر اس کی حفاظت کر رہے ہیں۔

بروق پا اور راہبہ دو کمبل اٹھا لائے تھے۔ بروق پا نے دونوں کمبل دہرے کر کے الگ الگ برف پر بچھائے ایک پر وہ اور کیپٹن بیٹھ گئے اور دوسرے کمبل پر راہبہ دو زانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر اتھاہ اطمینان تھا۔

''میں مسلمان عورت کی حیثیت سے جینا اور مرنا چاہتی ہوں۔''

''چاچا۔ تم کلمہ شریف پڑھو اور لیڈی تم چاچا کے پیچھے پیچھے دہراؤ۔''

بروق پا کلمہ پڑھتا وہ دہراتی اور یوں راہبہ مسلمان ہو گئی۔

''لیڈی، مبارک ہو۔ تمہارا اسلامی نام بانو ہو گا۔'' کیپٹن نے کہا۔

''اچھا۔ شکریہ!'' وہ بولی۔

''چاچا۔ اب تم بانو کو نماز پڑھنا سکھاؤ گے لیکن نماز سے پہلے وضو کرنا۔'' کیپٹن نے بروق پا سے درخواست کی۔

''جی جو حکم''۔ وہ بولا۔

''تو شروع ہو جاؤ۔ میں ذرا تھکا ہوا ہوں اس لیے سو رہا ہوں۔'' کیپٹن پہلو بدل کر کمبل پر لیٹ گیا۔ وہ تھکاوٹ سے چُور تھا بہت جلد سو گیا۔ بروق پا بانو کو وضو کا طریقہ سمجھانے لگا۔

جائیں کہاں؟

وہ سنو لائن سے اُوپر تھے۔ سمندر کی سطح سے بلندی اندازاً سترہ اٹھارہ ہزار فٹ ہو گی۔ اتنی بلندی پر تیز چلنا ناممکن ہے۔ ہوا میں آکسیجن کی کمی ہوتی ہے اس لیے سانس پھول جاتا

ہے۔ بوجھ اٹھا کر چلنا محال ہو جاتا ہے۔ بھوک مٹ جاتی ہے۔ توانائی اور طاقت میں کمی آ جاتی ہے۔ ایک ایک قدم من من کا ہو جاتا ہے۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ آپ زیادہ دیر تک اتنی بلندی پر ٹھہر نہیں سکتے۔ میجر اور کیپٹن کو ان سب باتوں کا پتہ تھا۔

جب میجر، سلطان اور ابراہیم واپس آئے تو تھکاوٹ اُن کے چہروں پر لکھی ہوئی تھی اور اُن کا سانس پھولا ہوا تھا۔

''ایک غار ملا ہے جھیل کے تنگ دھانہ کی طرف۔ اس جھیل کا پانی گرمیوں میں اس طرف سے نیچے جاتا ہے اور پھر نالے کی شکل اختیار کرتا ہے۔''

میجر کی نظر بانو پر پڑی۔ وہ نماز پڑھ رہی تھی۔ وہ حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔

''لیڈی مسلمان ہو گئی ہے از خود۔ اور نماز پڑھ رہی ہے۔ اس کا نام ہے بانو۔'' کیپٹن تنویر نے کمبل سے اُٹھتے ہوئے بتایا۔

''گڈ۔ میں نے پیروں کے نشان دیکھے ہیں۔ میرا خیال ہے انڈین آرمی اس ایریا میں پٹرولنگ کرتی ہے۔ اگر نہیں کرتی تو پھر پیروں کے نشان کیوں ہیں؟'' میجر نے سوال کیا۔

''وہ پیروں کے نشان نہیں ہیں بوٹوں کے نشان ہیں۔'' سلطان بولا۔

''مجھے تو وہ پیروں کے نشان دکھائی دیتے ہیں غالباً انڈین فوجی بیئرز پا پہن کر اس علاقہ میں گشت کرتے ہیں۔'' میجر نے خیال ظاہر کیا۔

''وہ بوٹوں کے نشان ہیں۔ دھوپ کی وجہ سے برف پگھلتی اور پھیلتی ہے۔ چنانچہ بوٹوں کے نشان چوڑے اور بڑے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے وہ بوٹوں کے بجائے پیروں کے نشان دکھائی دیتے ہیں۔''

سلطان شکاری تھا اور شکاری شکار کے دوران میں پیروں اور کھروں کا خاص حساب کتاب رکھتا ہے۔

''وہ نشان جو آپ نے دیکھے ہیں برفانی انسانوں کے پیروں کے نشان بھی ہو سکتے ہیں۔'' کیپٹن تنویر نے رائے دی۔

''پھر تو مارے گئے۔'' سلطان بولا۔ بانو کانپ اٹھی۔

''انڈین آرمی کی گشتی پارٹی ہو یا برفانی انسانوں کا ٹولہ۔ ہمیں دونوں سے گھبرانے کی

ضرورت نہیں۔ کیوں چاچا؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''جی جی۔ جی ہاں'' وہ بھی گھبرا کر بولا۔

''سر۔ کیا آپ نے طے کرلیا ہے کہ رات یہاں بسر ہوگی؟'' کیپٹن نے پوچھا۔

''اور کیا ہوسکتا ہے۔ جھیل کا پانی ایک سرنگ نما غار سے ہو کر بہتا ہے۔ اس وقت پانی رواں نہیں ہے۔ غار کہہ لیجیے یا سرنگ اس میں پانی کھڑا ہے اور اُس پر ایک دو انچ موٹی برف کی تہہ ہے۔ اس سرنگ کے دائیں بائیں پانی کے نکاس کی وجہ سے پتھر گھس گئے ہیں اور وہاں غار بن گیا ہے۔ پانی کی گذرگاہ کے دونوں طرف دائیں بائیں اور اوپر پتھر ہیں۔ نیچے جما ہوا پانی ہے۔ اس سرنگ میں سے انسان تو گذر سکتا ہے لیکن ہیلی کاپٹر نہیں گذر سکتا۔'' میجر نے بتایا۔

''آپ سرنگ میں سے ہو کر آگے نہیں گئے۔'' کیپٹن نے پوچھا۔

''نہیں۔ سرنگ میں اندھیرا ہے۔'' سلطان بولا۔

نائٹ ویژن گاگلز پہن کر سرنگ میں دیکھا جا سکتا ہے'' کیپٹن نے رائے دی۔

''ہم نے تو یہ سوچا ہی نہیں۔'' میجر نے سلطان کو مخاطب کر کے کہا۔

''چلیے۔ اب جا کر دیکھ لیتے ہیں'' سلطان بولا۔

آپ سب ہیلی کاپٹر میں بیٹھ جائیں۔ اس میں بیٹھ کر چلتے ہیں۔ کیپٹن نے کہا اور وہ سب ہیلی کاپٹر میں بیٹھ گئے۔

کیپٹن نے ہیلی کاپٹر اُڑایا اور اُسے غار کے منہ کے سامنے اتارا۔ غار بہت بڑا تھا لیکن اتنا بڑا نہیں کہ اس میں سے ہیلی کاپٹر اُڑ کر نکل سکے۔

''اگر ہم چاہیں تو واپس جا سکتے ہیں کیونکہ جس طرف سے آئے ہیں اُس طرف سے پہاڑ راستہ دیتا ہے زیادہ اونچا نہیں۔''

''لیکن ہم پہلے گلیشیر پر اور اُس کے بعد نالہ کی گذرگاہ پر اُڑ سکیں گے دائیں بائیں اونچے اونچے پہاڑ ہیں وہ راستہ نہ دیں گے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ہم اس غار نما سرنگ کے راستہ سے پیدال سفر کریں۔ ایسی صورت میں ہمارے پاس کھانے پینے کا سامان وافر ہونا چاہیے کیونکہ ہم بھوک سے مر سکتے ہیں۔ سردی سے بھی اور اگر ہم پر انڈین آرمی کے کسی دستے نے اچانک حملہ کر دیا تو بھی۔ ہیلی کاپٹر کے ذریعہ واپس جانے کی نسبت پیدل سفر کرنا زیادہ خطرناک ہے۔

کیپٹن نے اونچ نیچ دکھائی۔

''تیسری صورت یہ ہے کہ ہم پہاڑ کی چوٹی سر کریں۔'' میجر نے کہا۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔ پہاڑ بہت اونچے ہیں۔ بیس ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہیں۔ ہمارے پاس کوہ پیمائی کا سامان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے ساتھ ایک بوڑھا، ایک بچہ، ایک زخمی اور ایک لیڈی ہے۔ یہ چاروں اتنے بلند پہاڑوں کی کوئی بھی چوٹی سر نہیں کر سکتے۔'' کیپٹن نے کہا۔

''ہمیں آج کچھ نہیں کرنا چاہیے۔ صرف آرام کرنا چاہیے اور سوچنا چاہیے کہ کیا کرنا ہے۔'' بروق پا نے مشورہ دیا۔

''مجھے اس تجویز پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔'' میجر بولا۔

''ٹھیک ہے سر، آپ آرام کریں اور میں سرنگ نما غار کو اندر جا کر دیکھتا ہوں۔''

''کپتان صاحب، میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔'' بروق پا نے کہا اور کیپٹن تنویر کے ساتھ غار میں داخل ہوگیا۔ کچھ دُور تک روشنی نے اُن کا ساتھ دیا پھر روشنی مدہم ہوتی ہوتی اندھیرے میں بدلنے لگی اور آخر اُن کی آنکھوں کے سامنے گھپ اندھیرا تھا۔

''نائٹ ویژن گاگلز پہن لو چاچا۔'' کیپٹن نے کہا اور خود بھی گاگلز پہن لیے۔

سرنگ کے اندر پانی سردی سے جم چکا تھا لیکن برف کی سفیدی سرنگ کے دائیں اور بائیں اور چھت کے کالے پتھروں سے ملگجی اور نظر آتی تھی۔ انہیں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے دو گھنٹے ہوگئے تھے لیکن روشنی کا کوئی پتہ نہ تھا۔

''ہمیں واپس جانا چاہیے۔ یہ سرنگ تو آنت کی طرح لمبی ہے اور میں تھک گیا ہوں۔'' بروق پا بولا۔

''جیسے آپ کی مرضی'' کیپٹن نے کہا اور واپس چل پڑا۔ بروق پا اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ دونوں کے سانس پھول گئے تھے اور سرنگ کی خاموشی میں وہ آسانی سے ایک دوسرے کے پھیپھڑوں کی زور آزمائی سن سکتے تھے۔ چار گھنٹوں کے سفر کے بعد وہ تھکن سے چُور اپنے ساتھیوں میں آ ملے اور غار کے فرش پر لیٹ کر ستانے لگے جب اُن کے اُکھڑے ہوئے سانس درست ہوئے تو کیپٹن نے کہا۔

''ہمیں دُور تک روشنی دکھائی نہیں دی اور ہم واپس آ گئے۔'' بانو نے سب کے لیے چائے بنائی اور یوں انہوں نے چائے سے لنچ کیا۔ بانو کے پاس پوٹلی میں کچھ ستو تھے وہ اُس نے میجر کے سامنے رکھے لیکن اُس نے کہا ''تم کھاؤ۔ یہ تمہاری چیز ہے'' لیکن اُس نے وہ ستو نہ کھائے اور ابراہیم کو دے دیئے۔ ابراہیم نے پہلے تو انکار کیا پھر کیپٹن کے حکم پر تھوڑے سے ستو چائے میں گھول کر کھانے لگا۔ اس کے بعد وہ سب سو گئے۔

کھچڑی

چھ گھنٹے کی نیند انسان کو تروتازہ کر دیتی ہے۔ بارہ بجے دوپہر سے شام چھ بجے تک وہ سب خوب سوئے۔ سب سے پہلے میجر نوری سرنگ سے باہر آیا۔ شام ہو گئی تھی۔ چاروں طرف خاموشی تھی۔ اُس نے محسوس کیا وہ مریخ کا باشندہ ہے۔ اُس کے بعد مریخ کی دوسری مخلوق بھی باہر آ گئی۔ ایک صرف بانو تھی جو چائے تیار کر رہی تھی۔ البتہ اُس کی پوٹلی میں تھوڑے سے ستو باقی تھے جو اُس نے ابراہیم کو دے دیئے۔ سبھی افسردہ اور گھبرائے ہوئے تھے۔ میجر نوری سوچ میں گم تھا۔ البتہ کیپٹن بروق پا سے برفانی زبان میں باتیں کر رہا تھا ان باتوں میں لفظ کم اور شور زیادہ تھا۔ میجر نے لمحہ بھر کے لیے سوچا کہ دونوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔

''بانو تم کہاں کی رہنے والی ہو؟'' میجر نے پوچھا۔

''میرے گاؤں کا نام پدم ہے۔ یہ گاؤں لداخ کے ایک علاقہ زنسکار کا ہے۔''

''راہبہ کیسے بن گئی؟'' میجر نے سوال کیا۔

''میرے والدین کے گھر کوئی اولاد نہ تھی۔ وہ روز دعا کرتے تھے کہ اُن کے گھر اولاد ہو۔ ایک دن ایک بھکشو ہمارے گھر آیا تو اُس نے جادوٹونہ کیا اور دیوی دیوتاؤں کے حضور نذرانے پیش کیے اور پھر کہا کہ میرے والدین کے گھر دو بچے ہوں گے۔ ایک اُن کی خدمت کرے گا اور دوسرا مہاتما بدھ کا سیوک ہو گا۔ پہلے میرا بھائی پیدا ہوا اور سال بعد میں پیدا ہوئی۔ جب میں چھ سال کی ہوئی تو وہ بھکشو مجھے نوبرا لے آیا اور میں عبادت گاہ میں بھکشوؤں کی خدمت کرتی رہی۔ پھر کیپٹن آیا اور مجھے لے آیا اور اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

''سر، مجھے تو بھوک لگی ہے۔ کچھ کھانے کو ہے تو دیجیے۔ مہربانی ہو گی۔'' کیپٹن نے میجر

سے کہا۔

''آپ جانتے ہیں کہ ہم سب بھوکے ہیں اور ہمارے پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں۔ چینی، دودھ اور پتی ختم ہو گئے ہیں اب تو۔'' میجر نے کہا۔

''اگر اجازت دیں تو میں رزق کی تلاش میں نکلوں۔'' کیپٹن نے اجازت مانگی۔

''یہاں رزق کہاں؟'' میجر نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ڈھونڈنے پر تو خدا بھی مل جاتا ہے آپ حکم دیں گے تو تلاش میں نکلوں گا۔'' کیپٹن نے کہا۔

''میری طرف سے ہزار بار اجازت ہے لیکن خواہ مخواہ خطرہ مول نہ لیں۔''

''نہیں سر، سوچ سمجھ کر خطرہ مول لوں گا آپ مطمئن رہیں۔''

کیپٹن نے کوٹ پتلون جھاڑے، ہتھیار چیک کیے اور بروق پا کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں ہیلی کاپٹر کی طرف بڑھے اور پھر اُس میں سوار ہو گئے۔ انجن اور بلیڈوں کا شور اُٹھا اور پھر ہیلی کاپٹر اُوپر اُڑنے لگا۔ صبح وہ جس طرف سے آیا تھا اب اُس کا رخ اُس طرف تھا۔ دیکھتے دیکھتے ہیلی کاپٹر کم اونچے پہاڑ کی طرف سے باہر نکل گیا اور گلیشیر کے اوپر سے اُڑنے لگا۔

دو گھنٹے کے بعد طیارہ کا شور دُور سے قریب آتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ سب اُٹھ کر غار کے منہ کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ ہیلی کاپٹر پہلی جگہ پر آ کھڑا ہوا اور پھر کیپٹن تنویر اور بروق پا ہیلی کاپٹر سے باہر آئے تو اُن کے پاس دو سیر دال، دو سیر چاول، دو سیر چینی، پتی، خشک دودھ، ماچس، مٹی کا تیل، کچھ خشک لکڑیاں، نمک مسالہ، کیتلی اور ستو تھے۔

''اتنا کچھ کہاں سے لے آئے؟'' میجر نے پوچھا۔

''سپلائی ڈپو سے۔ انڈین آرمی کے سپلائی ڈپو سے۔ میں نے اپنا کارڈ دکھایا وہی کیپٹن کشن کمار والا اور راشن مانگا۔ انچارج آفیسر نے دے دیا۔ وہاں تو ڈھیروں کے ڈھیر ہیں دو چار سیر سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''ہیلی کاپٹر کہاں کھڑا کیا؟''

''وہیں، سپلائی ڈپو کے سامنے کافی جگہ تھی۔'' کیپٹن نے بتایا۔

''سپلائی آفیسر نے ان کو سلیوٹ بھی مارا۔'' بروق پا بولا۔

''ہاں اُس نے مجھے فوجی سلام کیا وہ لفٹین تھا اور میں کپتان۔''

جب کیپٹن اور بروق پا سارا سودا غار میں رکھ چکے تو آخر میں کیپٹن نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کپڑے دھونے والے صابن کی ٹکیہ اور منہ ہاتھ دھونے والی صابن کی ٹکیہ بانو کو دیں۔

''یہ آپ کے لیے۔ مسلمان عورتیں صفائی پسند ہوتی ہیں اور مرد میری طرح گندہ رہنا پسند کرتے ہیں۔''

سلطان اور ابراہیم نے آگ جلائی۔ پتھروں سے چولہا بنایا گیا تھا۔ کیتلی میں برف ڈالی گئی جو پگھل کر پانی بنی اور پھر پانی اُبلنے لگا۔ اس میں چاول اور دال ڈالی گئی اور ساتھ ساتھ مرچ مصالحہ، کھچڑی تیار ہونے لگی۔ کھچڑی کی نمکین خوشبو غار کے اندر پھیل گئی اور گھر کا سا سماں بندھ گیا۔

کھچڑی کھانے کے بعد وہ آگ کے اردگرد بیٹھ کر دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر دس بجے رات کو سو گئے۔ غار کے اندر سوئے ہوئے تھے اور باہر برف باری ہو رہی تھی۔

برفانی رقص

آدھی رات کو بروق پا کی آنکھ کھل گئی۔ بوڑھے آدمی کو رات کے وقت نیند نہیں آتی۔ آتی ہے تو کم آتی ہے اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ ذرا شور ہو تو آنکھ کھل جاتی ہے۔ بروق پا کے کانوں سے بھی شور ٹکرایا تھا جیسے کوئی دھات کو دھات سے پیٹ رہا ہے۔ وہ بستر سے اُٹھا اور غار سے باہر آیا۔ برف باری ہو رہی تھی اور ہیلی کاپٹر کے اردگرد دس برفانی انسان دائرہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک اُٹھتا اور ہیلی کاپٹر کو دو ہتڑ مار کر دونوں ہاتھوں سے پیٹتا اور پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ جاتا۔ برفانی انسانوں کا ہلکا ہلکا شور بھی تھا جیسے وہ سرگوشیوں میں ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہوں۔ اُن کی بولی میں اسے چانغراہ کہتے ہیں یعنی کچہری کرنا یا پتھروں پر گول دائرہ میں بیٹھ کر بیٹھک لگانا۔ وہ اس وقت چانغراہ کر رہے تھے۔ بروق پا ساری بات سمجھ گیا۔ برفانی انسان ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے یہ چیز ہے کیا؟ وہ ہیلی کاپٹر سے کچھ کچھ ڈرے ہوئے بھی تھے کہ وہ اُن کے قابو نہ آ رہا تھا اور چھیڑنے پر کوئی ردعمل ظاہر نہ کر رہا تھا۔ نہ خوش ہوتا تھا نہ ناراض۔ بالکل خاموش کھڑا تھا۔

بروق پا نے کیپٹن تنویر کو جگایا اور اُسے باہر لے آیا۔ ہیلی کاپٹر غار سے دُور نہیں تھا اور

برفانی انسان اُس کے اردگرد دائرہ میں بیٹھے ہلکا شور مچا رہے تھے۔

''یہ لوگ ہیلی کاپٹر سے متعارف ہونا چاہتے ہیں۔'' کیپٹن نے کہا اور برفانی انسانوں کی حیرت اور گھبراہٹ کا مزہ لینے لگا۔

جب تمام برفانی انسانوں نے ہیلی کاپٹر کو ہاتھ لگا لیا اور اُن کی تسلی ہو گئی تو وہ سب کھڑے ہو گئے اور ایک طرف ہو کر اُسے گرانے لگے۔

''یہ تو ہیلی کاپٹر کو اوندھا کر دیں گے۔'' کیپٹن نے کہا اور آگے بڑھ کر اُن کی زبان میں نہیں'' کہا۔ یعنی یہ کام نہ کرو۔ وہ ایک دم ساکن کھڑے ہو گئے اور پلٹ کر کیپٹن کو دیکھنے لگے۔ کیپٹن آہستہ آہستہ چلتا اُن کے پاس آیا اور پھر اُن کی قطار میں سے ہو کر ہیلی کاپٹر کا بٹ کھول کر اندر بیٹھ گیا اور اُس نے انجن سٹارٹ کیا اور پنکھے (بلیڈ) چلا دیئے۔ برفانی انسان شور سن کر اور پنکھوں کی حرکت دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئے اور ہیلی کاپٹر کو گھورنے لگے۔

اُن کے دیکھتے دیکھتے ہیلی کاپٹر ہوا میں بلند ہونے لگا اور پھر تھوڑی دیر دائیں بائیں اُڑ کر نیچے آ گیا۔ انجن کا شور ختم ہو گیا اور پنکھے (بلیڈ) ساکن ہو گئے۔ کیپٹن ہیلی کاپٹر سے نیچے آیا تو ایک سفید بال بوڑھا برفانی انسان آگے بڑھا اور کیپٹن کو پہلے تھپکی دی اور پھر سینے سے لگایا۔ بروق پا ڈر گیا کہ کہیں برفانی انسان کیپٹن کو زیادہ بھینچ کر اُس کی ہڈی پسلی ایک نہ کر دے چنانچہ وہ زور سے برفانی انسان کی زبان میں ''بس بس'' بولا۔

برفانی انسان کیپٹن کو چھوڑ کر بروق پا کی طرف متوجہ ہوئے۔ بروق پا نے آگے بڑھ کر اپنا دایاں ہاتھ اُن کی طرف پھیلایا اُسی بوڑھے سردار نے جس نے کیپٹن کو تھپکی دی تھی، بروق پا سے مصافحہ کیا۔ پھر کیپٹن، بروق پا اور دس برفانی انسان ہیلی کاپٹر کے اردگرد دائرہ بنا کر ناچنے لگے اور تالیاں پیٹنے لگے۔

اُن کا شور سن کر میجر، سلطان، ابراہیم اور بانو جاگ اُٹھے تھے اور سرنگ کے منہ میں کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ وہ سارے ڈر کے مارے کانپ رہے تھے کیوں کہ اس سے پہلے انہوں نے برفانی انسان اتنے قریب سے کبھی نہ دیکھے تھے۔ ناچتے ہوئے اور تالیاں پیٹتے ہوئے کیپٹن تنویر نے کہا ''تم بھی آ جاؤ۔ ڈر دُور ہو جائے گا۔'' میجر کے پیچھے سلطان ابراہیم اور بانو بھی ان کے دائرہ میں شامل ہو گئے اور ہیلی کاپٹر کے اردگرد ناچنے اور تالیاں

پیٹنے لگے۔

یہ عجیب جگہ تھی اور عجیب سماں تھا۔ اس سے پہلے انسانی تاریخ میں ایسا کبھی نہ ہوا تھا کہ انسان ور برفانی انسان اٹھارہ بیس ہزار فٹ اونچے پہاڑوں کے درمیان یخ بستہ جھیل پر آدھی رات کو مل کر ناچ رہے ہوں۔ یہ زبان کا جادو تھا یا عقل کا جادو یا قدرت کا عجوبہ۔ عام انسانوں کے لیے نومبر کی سردی ایسے مقامات پر ناقابل برداشت ہوتی ہے لیکن وہ برفانی انسانوں کے ساتھ مل کر ناچ رہے ہوں اور سردی کی شدت سے نا آشنا تھے۔ کماغڈو پارٹی بھی لمحہ بھر کے لیے بھول گئی تھی کہ وہ موت کے منہ میں ہے۔ بروق پا تھک گیا تو اُس نے کہا ''بس بس'' سب کے قدم رُک گئے۔ اب کیپٹن کی باری تھی اُس نے کہا ''ہم سب دوست'' یہی الفاظ برفانی انسانوں کے سردار نے دُہرائے اور پھر وہ ہیلی کاپٹر کا دروازہ کھول کر اُس کے اندر گھس گیا۔

کیپٹن ابھی سوچ رہا تھا کہ اُسے ہیلی کاپٹر سے کیوں کر باہر نکالے کہ توپ کے گولے بارش کے قطروں کی طرح اُن کے اردگرد گرنے لگے۔ کماغڈو پارٹی بھاگ کر غار میں داخل ہو گئی اور اُن کے ساتھ برفانی انسان بھی۔ تابڑ توڑ گولہ باری سے ہیلی کاپٹر تباہ ہو گیا اور فاسفورس کے گولے پھٹنے سے رات دن میں تبدیل ہوگئی۔

فرار

برفانی انسانوں کا سردار ہیلی کاپٹر کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اس کا احساس اُس کے ساتھیوں کو ہوا تو وہ چنگھاڑنے لگے۔ دو ایک نے ہیلی کاپٹر کی طرف جانے کی کوشش کی تو کیپٹن ''دگوش دگوش'' پکارا جس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کام نہ کرو، جان بچاؤ، بھاگو، فرار ہو جاؤ۔

''میرے خیال میں بیس مارٹر توپیں گولہ باری کر رہی ہیں۔'' میجر بولا۔

''جھیل کی برف پانی بن رہی ہے اور اگر یہی حال رہا تو پانی کھولنے لگے گا۔'' کیپٹن بولا۔

''میرا خیال ہے ہمیں چلنا چاہیے۔'' میجر بولا۔

''ضرور۔ کوئی دوسری صورت نظر نہیں آئی۔ گولہ باری کے بعد وہ چھوٹے چھوٹے ہتھیاروں سے آگے بڑھیں گے۔'' کیپٹن تنویر نے کہا اور چل پڑا۔ اُس نے چلتے چلتے حیران و پریشان برفانی انسانوں سے پھر کہا ''دگوش دگوش''

وہ پانچ گھنٹے تک سفر کرتے رہے اور جب صبح کے آثار نمودار ہوتے تو وہ ایک پُرفضا وادی میں تھے۔ جھیل کا پانی اس وادی میں سے نالہ کی شکل میں ہو کر گذرتا ہے۔ اس کے چاروں طرف جھیل کی طرح اونچے کالے پہاڑ کھڑے تھے لیکن یہاں سبزہ تھا اور چاروں طرف کالا جنگلی گلاب کھل رہا تھا۔ کچھ بلند قد درخت بھی تھے جو جنگلی امرود کے تھے۔ سیاہ چونچوں اور سرخ دموں والے پرندے بھی چہچہا رہے تھے۔ ان پرندوں کے پر عنابی تھے اور ان پر چاندی کی سی سفیدی والے ستارے چمک رہے تھے۔ ایک کونے میں چشمہ اُبل رہا تھا جس کا پانی گرم تھا۔

برفانی انسان شاید بھوکے تھے۔ وہ جنگلی امرود توڑ توڑ کر کھانے لگے اور پھر گرم گرم چُلیوں میں بھر کر پینے لگے۔ امرود کھانے اور پانی پینے کے بعد وہ سبزہ پر لیٹ گئے اور سو گئے۔

کماغڈو پارٹی نے بھی ایک ایک دو دو امرود کھائے اور پھر پانی پیا۔ دیکھتے دیکھتے اُن کو نیند آنے لگی اور وہ بھی سبزہ پر لیٹ کر خراٹے لینے لگے۔

جب کماغڈو پارٹی کو بارہ بجے کے قریب ہوش آیا تو وہاں برفانی انسان ایک بھی نہ تھا۔ وہ سب جا چکے تھے۔

''بھئی وہ کہاں چلے گئے؟'' میجر نے پوچھا۔

''میرے خیال میں وہ اپنے سردار کو تلاش کرنے گئے ہیں۔'' بروق پا بولا۔

''جھیل کا تو وہ اب رُخ نہیں کریں گے۔ اتنی گولہ باری انہوں نے کب دیکھی ہوگی۔'' کیپٹن بولا۔

''فائر پاور بہت تھی۔'' میجر نے کہا۔

''ہاں یوں لگتا تھا جیسے روس جرمن آرمی پر حملہ کر رہا ہے۔'' کیپٹن نے کہا اور پھر سوچنے لگا۔

''کیا سوچ رہے ہو کیپٹن؟'' میجر نے پوچھا۔

''میں سوچ رہا ہوں اتنا گولہ بارود کہاں سے آیا یعنی اسلحہ ڈپوؤں سے۔ گویا نو مرا ویلی اور اس کے گرد و نواح میں گولہ بارود بہت ہے۔'' وہ یوں بول رہا تھا جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نو مرا ویلی اور سیاچن گلیشیر کے مشرقی حصہ میں انڈین آرمی نے

گولہ بارود ذخیرہ کر رکھا ہے۔'' میجر نے کہا۔

''کیا ہم ذخیرہ کیے ہوئے اس گولہ بارود کو تباہ نہیں کر سکتے؟''

''کس طرح؟ یعنی ان گوداموں تک رسائی کیسے ہوگی؟''

''کوئی صورت نہیں؟''

''میرے خیال میں تو کوئی صورت نہیں ہے''

''دراصل گولہ بارود کو تباہ کرنا میرا مقصد نہیں'' کیپٹن بولا ''میرا مقصد گولہ بارود کے ذریعے آوالانچ لانا یعنی برف کا طوفان۔''

میجر ہنس کر بولا ''آپ کے ذہن میں بعض اوقات نرالے خیال آتے ہیں۔''

''سر، ذہن تو ہوتا ہی نرالے خیالوں کے لیے ہے۔ ان خیالی تصویروں میں عمل کے ذریعہ رنگ بعد میں بھرا جاتا ہے۔''

ابراہیم وادی کے ایک گوشہ میں پتھروں کے درمیان اُگی ہوئی ایک جھاڑی پر جھکا ہوا تھا۔

کیپٹن نے اُسے آواز دے کر پوچھا ''کیا دیکھ رہے ہو ابراہیم؟''

''سر، ایک گھونسلہ ہے اور اس میں انڈے ہیں۔''

''ویری گڈ۔ توڑنا نہیں ان انڈوں کو۔'' میجر نے کہا۔

''نہیں سر۔ بے حد خوبصورت ہیں۔'' وہ بولا۔

''خدا کی قدرت ہے۔ پتھروں میں خوبصورت زندگی مچل رہی ہے۔'' کیپٹن نے کہا اور ایک امرود توڑ کر کھانے لگا۔

''میں جاننا چاہتا ہوں کہ نیند کا اثر امرود میں ہے یا پانی میں؟''

''نیند کا اثر پانی میں ہونا چاہیے۔'' میجر نے کہا۔

آپ پانی پی کر دیکھ لیں۔'' کیپٹن نے مشورہ دیا اور میجر چلیوں سے پانی پینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد میجر پر نیند نے غلبہ پا لیا۔

''تجربہ کامیاب رہا ہے۔ نیند کا اثر امرود میں نہیں پانی میں ہے۔ دیکھو میجر صاحب پانی پی کر سو گئے ہیں۔'' کیپٹن یہ کہہ کر ورزش کرنے لگا۔

''جی میں چائے بناؤں گی۔'' بانو نے کیپٹن کے قریب آ کر کہا۔

''دودھ پتی اور چینی کہاں سے آئیں گے؟'' اُس نے پوچھا۔

''میں اُٹھا لاتی ہوں۔'' وہ بولی۔

''شاباش۔ نیکی اور پوچھ پوچھ۔ لیکن پانی برف کا ہو چشمہ کا نہ ہو''

''اچھا جی۔'' بانو آگ جلانے کے لیے ایندھن تلاش کرنے لگی۔

میجر کے سوا سب نے چائے پی۔ میجر اب بھی سویا ہوا تھا لیکن جب بروق پا نے شور مچایا تو میجر کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے دیکھا ایک پہاڑ کی چوٹی سے برفانی انسان لڑھکتے ہوئے نیچے آ رہے ہیں۔ وہ دیکھتے دیکھتے اُن کے پاس آ گئے وہ تعداد میں نو تھے۔ وہی تھے جو اُن کو سوتا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

بدلہ

نیچے آ کر انہوں نے ایک بڑا پتھر پہاڑ کی کُوکھ سے ہٹایا تو سامنے ایک غار کا منہ تھا۔ وہ جھک کر ایک ایک کر کے غار کے اندر گئے اور جب باہر آئے تو یاک کے چمڑے سے بنے ہوئے میلے کچیلے تھیلے اُن کے ہاتھوں میں تھے۔ ایک برفانی انسان نے اپنی بولی میں کہا ''لو۔''

کیپٹن اور بروق پا آگے بڑھے اور دو تھیلے لے کر اُن کو کھولا۔ دونوں تھیلوں میں ہیرے جواہرات تھے۔ اُن سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

برفانی انسانوں نے پندرہ تھیلے کیپٹن اور بروق پا کے سامنے رکھ دیئے۔ پھر ایک برفانی انسان نے شور مچایا اور ایک لفظ اس کے منہ سے نکلا۔ اس کا مطلب تھا ''بدلہ''

کیپٹن اور بروق پا نے بیک زبان کہا ''ٹھیک ٹھیک'' ایک سردار قسم کا برفانی انسان اوپر اشارہ کرنے لگا۔

کیپٹن نے کہا ''ٹھیک ٹھیک''

وہی سردار فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا تو کیپٹن نے سوچ کر دو تھیلے اٹھائے اور اُچک کر برفانی انسان کے کندھوں پر بیٹھ گیا اور اپنی دونوں ٹانگیں اس کی گردن کے اردگرد لپیٹ لیں اور دونوں تھیلے اُس کے سر پر رکھ کر اُن کو پکڑ لیا۔ سردار پہاڑ پر چڑھنے لگا جس طرح بندر درخت پر چڑھتا ہے۔

کیپٹن کے ساتھیوں نے بھی وہی عمل دہرایا لیکن ڈرتے ڈرتے وہ سمجھ رہے تھے کہ برفانی انسان پہاڑ پر چڑھتے ہوئے نیچے لڑھک جائیں گے اور وہ ہڈی پسلی چکنا چور کروا کر اللہ کو پیارے ہو جائیں گے لیکن برفانی انسان اس مہارت سے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے جس مہارت سے مچھلی پانی میں تیرتی ہے۔ ظاہر ہے وہ انہیں پہاڑوں پر چڑھتے اُترتے جوان اور بوڑھے ہوئے تھے۔ اُن کی نسل کی بقا اسی میں تھی کہ وہ بلند سے بلند پہاڑ چڑھ سکتے تھے اور برفانی تودوں میں رہ کر خوش ہوتے تھے۔ وہ جس ماحول میں رہتے تھے اُس سے ان کی مطابقت مکمل تھی۔

آدھ پون گھنٹے میں وہ پہاڑ پر چڑھ گئے۔ پہاڑ کی چوٹی پر برف ہی برف تھی۔ وہ کماغڈو پارٹی کو اپنے کندھوں پر بٹھائے ایک طرف چل دیئے۔ انہیں برف میں چلتے ہوئے ذرا دقت پیش نہ آ رہی تھی وہ یوں چل رہے تھے جیسے عام انسان پختہ سڑک پر چلتے ہیں۔

وہ شام سے پہلے اُس پہاڑ پر آ گئے جہاں سے اُن پر توپوں کے گولے برسائے گئے تھے۔ توپیں اور توپچی اب بھی وہیں تھے۔ توپیں تعداد میں دس تھیں اور توپچی تیس۔ برفانی انسان ایک جگہ کھڑے ہو گئے۔ کیپٹن تنویر نیچے آیا اور اُس نے دونوں تھیلے اپنے برفانی انسان کو دے دیئے اور خود ریوالور، پستول اور خنجر لے کر آگے بڑھا۔ میجر بھی ساری صورتحال سمجھ گیا تھا چنانچہ اُس نے بھی ریوالور لیا اور کیپٹن کے پیچھے پیچھے برف پر چل پڑا۔ ابراہیم کے پاس اپنا پستول تھا بھلا وہ کیوں پیچھے رہتا۔ جب وہ تینوں آگے بڑھے تو برفانی انسان بھی ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ بروق پاسیانا آدمی تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ اب یہ شور مچا کر آگے بڑھیں گے اور توپچیوں کو میجر، کیپٹن اور ابراہیم کی آمد کا پتہ چل جائے گا۔ چنانچہ اُس نے منہ پر انگلی رکھ کر اُن سے کہا ''چپ'' وہ چپ تو ہو گئے لیکن میجر کیپٹن اور ابراہیم کے پیچھے چل پڑے۔

سب سے آگے کیپٹن تھا اُس نے توپچیوں کے پیچھے جا کر پندرہ گز کے رینج سے یکے بعد دیگرے فائر کیے اور چھ فوجیوں کو گرا دیا۔

اب میجر کی باری تھی اُس کے فائر سے پانچ گرے۔ ابراہیم کے فائر سے چار لڑھکے۔ کیپٹن کا پستول ابھی بھرا ہوا تھا چنانچہ اُس نے پانچ اور مار گرائے۔ تیس میں سے بیس گرے اور دس نے بھاگنے کی کوشش کی وہ برفانی انسانوں کے قابو آ گئے اور انہوں نے اُن کی تکہ بوٹی کر دی۔

توپیں گولوں سے بھری ہوئی تھیں۔ میجر اور کیپٹن اب ایک ایک توپ پر گئے اور گولے داغنے لگے۔ جھیل میں چھوٹے ہتھیار لیے انڈین فوجی سرنگ پر حملہ کرنے والے تھے۔ ان میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ جان بچانے کے لیے سرنگ میں جا چھپے۔ برفانی انسانوں نے پندرہ توپوں کو اٹھا اٹھا کر جھیل میں پھینکنا شروع کیا اور ایک بھی توپ باقی نہ رہی تو وہ سب اسی جگہ آ گئے جہاں بروق پاسلطان اور بانو کھڑے اس معرکہ کا نظارہ کر رہے تھے۔

نو کے نو برفانی انسان پھر اگڑوں بیٹھے گئے اور کماغڈو پارٹی تھیلے پکڑ کر اُن پر پہلے کی طرح سوار ہو گئے۔ اب اُن کا رخ مغرب کی طرف تھا۔

شام ہو گئی تھی اور اُن کا رخ مغرب کی طرف تھا۔ وہ چھپ چھپ کر خوشی خوشی برف میں سے آگے بڑھ رہے تھے۔ رات کے آٹھ بجے وہ انڈین آرمی کے ایک کیمپ میں داخل ہوئے جہاں چار پہریدار تھے جو شراب پی رہے تھے اور کھانا کھا رہے تھے۔ اُن کو ہوش اُس وقت آیا جب کماغڈو پارٹی اور برفانی انسانوں کا ٹولہ اُن کے یورپ سے درآمد کردہ خیموں میں داخل ہوا اور اُن کے ریوالور کی گولیوں نے اُن کے سینے چھلنی کر دیئے۔

جب اُن کے گودام چیک کیے گئے تو ایک گودام میں ایک ہزار بکرے برف میں لگے پڑے تھے۔ ہزاروں من گولہ بارود تھا۔ بوٹ، جرابیں، کمبل، کوٹ، پتلونیں، برساتیاں اور کپڑے شمار سے باہر تھے۔ ایک سو کے قریب سنو بائیک تھے یعنی وہ موٹر سائیکل جو برف پر چلتے ہیں۔ چینی، پتی، خشک دودھ، آٹے اور چاول کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ بارہ ہزار فوجیوں پر مشتمل ڈویژن کئی مہینے لڑ سکتا تھا۔

میجر نوری، کیپٹن تنویر اور ابراہیم آدھی رات تک اس سارے ساز و سامان اور گولہ بارود کو دیکھتے رہے اور دانتوں میں انگلیاں داب کر حیرت کا اظہار کرتے رہے۔

''یہ انڈین آرمی کا پہلا ڈپو تھا۔'' میجر نے کہا۔

''صبح ہونے سے پہلے یہ سپلائی ڈپو تباہ ہو چکا ہو گا اور اس کی تباہی سے جو آوا لانچ شروع ہو گا وہ نوبرا ویلی کو ملیامیٹ کر دے گا۔'' کیپٹن تنویر نے کہا۔

گوداموں اور سٹورز کو دیکھنے کے بعد میجر نوری اور کیپٹن تنویر نے اصل کام شروع کیا۔ پہیہ دار دو توپوں میں گولے بھرے اور برفانی انسانوں کے ذریعے اُن کو برف میں سے دھکیل

کر دو فرلانگ کے فاصلہ پر کھڑا کیا۔ توپوں کا ہدف اور زاویہ مقرر کیا۔ ہدف گولہ بارود کا ذخیرہ تھا جس زاویہ پر گولے گرنے والے تھے اس کی زد میں براہ راست گودام اور سٹور آتے تھے۔ وہیں برف گاڑیاں تھیں۔ ایک برف گاڑی میجر نے پسند کی اور ایک کیپٹن نے۔ اُن میں راشن پانی، گولہ سکہ اور ہیرے جواہرات رکھے اور اُن کو توپوں کے قریب چالو حالت میں کھڑا کیا۔

برفانی انسان اس ساری کارروائی کو دیکھ رہے تھے لیکن اُن کی سمجھ سے ہر بات بالا تھی۔

بہرحال کیپٹن نے اُن سے باری باری مصافحہ کیا اور اُن کو روانگی پر آمادہ کیا۔ وہ تاروں کی روشنی میں اپنی وادی کی طرف چل دیئے۔

جب دو بجے کا عمل ہوا تو میجر اور کیپٹن نے اللہ کا نام لے کر اپنے ساتھیوں کو برف گاڑی میں بٹھایا۔ ابراہیم اور بانو، کیپٹن کی گاڑی میں بیٹھے اور بروق پا اور سلطان میجر کی گاڑی میں۔ دونوں گاڑیاں سٹارٹ تھیں۔

پھر دونوں توپوں کو داغا گیا۔ آنکھ جھپکنے میں گولہ بارود پھٹنے لگا اور پہاڑ دہل گئے۔

میجر اور کیپٹن برف گاڑیوں میں بیٹھ کر گولہ بارود کی روشنی میں سیاچن کی برف پر مغرب کو روانہ ہو گئے۔

بیس میل تک گولہ بارود کی روشنی نے اُن کا ساتھ دیا اور جب وہ اگلے دن تیاکشی، چلونکھا اور طور تک کے راستہ شام کے اندھیرے میں فرانو پہنچے تو ریڈیو پاکستان سکردو آل اڈیا ریڈیو لہہ کے حوالے سے بتا رہا تھا کہ آگ لگنے سے ملٹری سٹور تباہ ہو گیا۔ کروڑوں کا نقصان ہوا اور نوبرا وادی میں بے پناہ برف باری سے آوالانچ آیا جس سے وادی تباہی و بربادی کا منظر پیش کر رہی ہے۔

آخری بات

دونوں برف گاڑیاں دریائے شیوق میں بہا دی گئی تھیں۔ فرانو کے امام مسجد نے کیپٹن تنویر اور بانو کا نکاح پڑھایا۔ سلطان صحت مند ہو گیا تھا وہ اور ابراہیم اپنے گاؤں چلے گئے۔ بروق پا خپلو چلا گیا۔ میجر نوری ڈیوٹی پر آ گیا۔ کیپٹن تنویر نے پندرہ دن کی اور رخصت لے لی۔ ہیرے جواہرات؟ اگر انگم ٹیکس والوں کو پتہ نہ چلے تو یہ بتانے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ اُن کے پاس ہیں۔

ہاں یاد آیا بانو نے اپنے حصے کے ہیرے جواہرات کے کئی سیٹ تیار کیے ہیں اور ابراہیم اپنی دولت کو اپنی تعلیم پر خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔